اس ناول کے تمام کردار اور مقامات فرضی ہیں۔ کسی زندہ
کردار یا مقام سے ان کی مماثلت محض اتفاقی ہوگی اور مصنّف
یا ناشر اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔
مصنّف

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

جملہ حقوق محفوظ ہیں

قیمت .... چار روپے
بار .... اوّل
سن اشاعت ۱۹۶۱ء
سرورق .... عامی
ناشر .... آغا حامد رضا۔ مکتبہ فیضی
دل محمد روڈ۔ لاہور
مطبع .... نقوش پریس لاہور

اے حمید

سورج نہیں نکلا

ناول

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

مکتبۂ فیضی لاہور

شیریں کے نام

میرے صرف دو ہاتھ ہیں
اور تمھاری محبّت کے زخم جگہ جگہ سے خون اُگل رہے ہیں
میں کس کس زخم پر ہاتھ رکھوں؟
میں کس کس زخم کا منہ بند کروں؟
کل جن راستوں پر پھُول گرا کرتے تھے
آج وہاں خاک اُڑ رہی ہے
کل جہاں چاند تمھاری باہنوں کا سہارا
لے کر نکلا کرتا تھا
وہاں آج تاریکیاں تمھارا نام لے لے کر
بین کر رہی ہیں شیریں!

میں اپنے بستر کو ویسے ہی رہنے دوں گا
جس طرح وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے
تاکہ اُس کے خوبصورت جسم کے نقوش مٹ نہ جائیں
میں چشمے پر نہیں جاؤں گا، میں کپڑے نہیں بدلوں گا
میں اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کروں گا
تاکہ اُس کی ہم آغوشیوں کے نشان سدا زندہ رہیں
میں کچھ نہیں پیوں گا، کسی سے بات نہیں کروں گا
کہیں میرے ہونٹوں پر اُس کے بوسوں کا لمس تحلیل نہ ہو جائے
میں خواب گاہ کی کھڑکیوں کو ہمیشہ بند رکھوں گا
کہیں اُس کی محبت کی چھوڑی ہوئی خوشبو
ہوا اُڑا نہ لے جائے

بلیطیس

یونانی شاعرہ۔ چھ صد سال قبل از مسیح

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

۱

وادی میں سورج ابھی نہیں نکلا۔

لیکن مشرقی آسمان پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے اُوپر ایک بڑا سا زرد ستارہ نکل آیا ہے۔ اسے دیکھ کر شبنم میں بھیگے ہوئے بسنتی گُل داؤدی کا خیال آرہا ہے۔ میں نے ابھی ابھی اپنے پہاڑ والے کاٹیج کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا ہے۔ پچھلے پہر کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ بے حد لطیف ہوا چل رہی ہے۔ اتنی محبت اور آہستگی سے کہ چیڑھ اور سفیدے کے چھریرے درختوں سے سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی ہے۔ کتنی دیر سے صبح کے اس پُرسکوت منظر کا یہی عالم ہے معلوم ہوتا ہے آج سورج نہیں نکلے گا۔ آج صبح نہیں ہو گی۔ کیا خبر آج تک کبھی سورج نہ نکلا ہو۔ کبھی صبح طلوع نہ ہوئی ہو اور محض ایک سُراب نما

چمک سی سورج کا بھیس بدل کر ازل سے انسان کو دھوکا دے رہی ہو۔

ایک فاختہ دلگداز نغمہ بکھیرتی پیپڑھ کے درخت پر سے اُڑ کر نیچے وادی کی طرف غوطہ لگا گئی ہے۔ اس کی درد بھری تان میرے دل میں سوئے ہوئے ان گنت خوابوں کو جگا گئی ہے۔ میری یادوں کے کھنڈروں میں کسی بھولے بسرے گیت کی بازگشت بن کر پھیل گئی ہے

میں نے لاہور چھوڑ دیا ہے۔ شہر چھوڑ دیا ہے۔ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میں اس جہنم سے نکل آیا ہوں جس کے بھڑکتے ہوئے بھیانک شعلوں نے میرے گلاب کے شگفتہ پھولوں کی کھیتیاں جلا کر راکھ کر دی تھیں۔ لیکن نادانستہ طور پر یادوں کے کچھ انگارے میرے ساتھ آگئے ہیں جو اگرچہ وقت کی ٹھنڈی راکھ میں دبے ہیں مگر کسی وقت اچانک ایک چنگاری چھوٹتی ہے اور میرے خیالات کے جنگل میں آگ لگا کر غائب ہو جاتی ہے۔ پھر یہ جنگل اُس وقت تک شعلوں کی لپیٹ میں رہتا ہے۔ جب تک کہ کسی دوسرے خیال کی آبشار اُسے سرد نہیں کر دیتی۔

وادی کے سبزہ زاروں اور پُرسکوں تنہائی نے مجھے تسکین بھی دی ہے اور پہلے سے زیادہ بے قرار بھی کر دیا ہے۔ شہر کے شور و غل میں میری کھوئی ہوئی محبّت کی سسکیاں دب گئی تھیں۔ لیکن اس کوہسار کی

سنسان تنہائی میں مجھے ان سسکیوں کی دکھ بھری آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ شاید اس آواز کو، اس زخمی فریاد کو، اس پرشکستہ المناک نوحے کو زلزلوں کی گڑگڑاہٹ، جوالامکھیوں کے دھماکے اور نیاگرا آبشار کا شور بھی نہ دبا سکے۔

میرے خدا! کیا محبّت کی ڈالی سے ٹوٹ کر جدائی کی سنگلاخ زمین پر گرے ہوئے پھول کو اب کبھی درخت کا ملاپ نصیب نہ ہوگا؟ کیا بانسری سے بچھڑا ہوا نغمہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا؟ کیا محبت سے چشمے کے پتھر کا منہ چوم کر گذر جانے والی لہر اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ کیا محبت کی گلیوں کا بھولا ہوا شام کو بھی گھر واپس لوٹ کر نہیں آتا؟ کیا محبت کا پھول صرف ایک بار کھلتا ہے اور کھل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرجھا جاتا ہے؟ کیا اتنے بڑے جنگل میں ایک بھی درخت ایسا نہیں جس کی چھاؤں میں کانٹے نہ ہوں؟ کیا اتنے بڑے شہر میں ایک بھی گھر ایسا نہیں جس کی دہلیز پر رات کو دیا جلتا ہو؟ ایک بھی جھولی ایسی نہیں جس کا دامن کسی ناکامِ محبّت کے آنسوؤں کو موتی سمجھ کر سمیٹ لے؟ ایک بھی دل ایسا نہیں جو محبّت کی گرمی سے دھڑک رہا ہو؟ جو کسی مجبورِ محبت کے ننگے پاؤں کی شکستہ آواز پر اپنے بازو پھیلا دے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو میرے خدا پھر یہ کمبخت پتلیوں کا تماشا کس کی خاطر رچایا گیا ہے؟ یہ پتھروں کے

بے جان ڈھیر کس لیے لگا دیئے گئے ہیں؟

میں کھڑکی سے ہٹ کر آتشدان کے پاس آگیا ہوں۔ یہاں کارنس پر صندل کی چھوٹی سی صندوقچی کے اندر میری محبت کی یادگاریں سو رہی ہیں۔ میں صندوقچی کا ڈھکنا کھولتا ہوں۔ کمرے میں صندل میں ملی ہوئی باسی گلاب کی پنکھڑیوں کی مہک پھیل گئی ہے۔ اس صندوقچی میں کچھ پرانے محبّت بھرے خطوط اور براؤن رنگ کے ملائم اور باریک بالوں کی ایک لٹ سنہری ربن میں بندھی پڑی ہے۔ خطوط نیلے رنگ کے احتیاط سے تہہ کیے ہوئے خوشبودار کاغذوں کا مجموعہ ہے۔ تقریباً ہر خط میں گلاب کے پھولوں کی باسی پنکھڑیاں پڑی ہیں۔ یہ خط شیریں کے ہیں جو کبھی اُس نے محبت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر بڑی گرمجوشی سے مجھے لکھے تھے۔ بہت سے خطوط اُس نے مجھ سے واپس لے لئے تھے۔ میرے پاس صرف یہ چند ایک خط ہی رہ گئے ہیں۔ لیکن سمندر کے طوفان کی شدت کا اندازہ اُس کی ایک لہر سے بھی ہو سکتا ہے۔ آگ کا ایک ہی شعلہ اُس کی شدت کو بیان کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میرے لیے ان خطوط کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ہزار ہزار داستانیں چھپائے بیٹھا ہے۔ یہ تو محبت کی بیکراں فصل کے بیج ہیں۔ لوگ فصل کاٹ کر لے گئے ہیں اور میرے پاس صرف چند ایک بیج ہی رہ گئے ہیں۔ کسی دن میں ان بیجوں

کو زمین پر ہل چلا کر بو دوں گا اور پھر وہاں سے ایک ایسی ہری بھری کھیتی جنم لے گی جس کی شادابی اور سرسبزی کی اس دنیا سے اُس دنیا تک دھوم مچ جائے گی۔

بالوں کی بندھی ہوئی لٹ بھی شیریں کی ہے۔

میں ان بالوں کو اُنگلی سے چھوتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی مرجھائے ہوئے پھول کی خشک سوکھی پنکھڑیوں کو ہاتھ لگا رہا ہوں۔ مگر ان بالوں میں شیریں کے جسم کی خوشبو، اس کے بدن کی حرارت اور براؤن بالوں کی چمک ابھی تک موجود ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اگر میں ان بالوں کو ہاتھ میں لے کر پیار کروں گا تو شیریں پلٹ کر اپنا خوبصورت آنکھوں والا چہرہ میری طرف کر دے گی اور کہے گی۔

"شاہد تم کتنے اچھے ہو؟"

وہ مجھے اسی طرح کہا کرتی تھی۔ اِس لیے نہیں کہ میں اچھا ہوں۔ بلکہ اس لیے کہ میں اُسے اچھا لگتا تھا۔ ایک لڑکی جب اپنے محبوب سے پیار کرتی ہے تو اس کی شخصیت میں اپنے آپ کو گم کر دیتی ہے۔ پھر دل ایک ہی تال پر دھڑکتے ہیں۔ سانس ایک ہی لے پر چلتی ہے۔ کان ایک ہی آواز پر کھڑے ہوتے ہیں اور آنکھیں ایک ہی چاند کو دیکھنے کے لیے کھلتی ہیں۔ پھر زخم ایک کو لگتا ہے اور درد دوسرے کو ہوتا ہے۔ آگ کہیں سلگتی ہے اور دھواں کہیں سے بلند ہوتا ہے۔ یہ محبت کی معراج

اور عشق کی انتہائی منزل ہوتی ہے۔ شیریں اور میں کبھی اسی منزل پر اکٹھے ہم سفر تھے۔ میرا سانس اس کے سینے سے ہو کر آتا تھا اور اُس کا دل میرے دل کا سہارا لے کر دھڑکتا تھا۔ الفاظ اُس کی زبان پر ہوتے اور مفہوم میرے دل میں ہوتا تھا۔ میں بات کرتا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ وہ بات کرتی تو لفظ پھول بن بن کر اُس کے ہونٹوں سے جھڑا کرتے۔ آج ان پھولوں کی ایک ایک پنکھڑی کو خزاں کے جھونکے اڑا کر لے گئے ہیں۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ ایک روز میری جھولی خالی رہ جائے گی تو میں اپنے دامن میں شیریں کی زبان سے جھڑے ہوئے اتنے پھول اکھٹے کر لیتا کہ ساری عمر ایک ایک پھول سے شیریں کی باتیں کرتے گذر جاتی۔ میں اگر جانتا کہ شالامار کی چاندنی راتوں میں چمکتی ہوئی ملاقاتیں ایک روز خواب ہو جائینگی تو میں سورج کی طنابیں پکڑ لیتا اور اُسے کبھی نہ طلوع ہونے دیتا۔ پھر کائنات پر ہمیشہ چاندنی رات ہی کی حکمرانی رہتی اور میں اپنی شیریں کے ساتھ سرو اور صنوبر کے درختوں کے سائے میں بیٹھا محبت کے ابدی گیتوں کی آوازیں سنا کرتا۔ لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ شیریں کا قلم میری محبت میں وصال کے گیت بُن رہا تھا اور قسام ازل کی قلم اپنے مجلہ تقویم میں، کچھ اور ہی لکھ رہی تھی اور جب سات آسمانوں کے اُوپر ایک بار قلم چل جاتا ہے تو اُس کے لکھے ہوئے کو سات سمندروں

کا پانی بھی نہیں مٹا سکتا۔ دیکھتے دیکھتے ایک آندھی اُٹھی اور آسمان لالہ زار ہو گیا۔ کسی قاتل کی آنکھ کی طرح سرخ ہو گیا۔ اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ وہ سنگریزے ہمارے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑے ہو گئے جنھیں ہم نے کبھی بڑی محبت سے دریا کی ریت پر چنا تھا اور جن کی مدد سے ہم نے اپنا ایک چھوٹا سا، پیارا سا گھر بنایا تھا۔ جہاں کھانا کھانے والا میز تھا۔ گرم ریشمی لحاف والا پلنگ تھا۔ میں تھا۔ میری شیریں بھی۔ سب کچھ تھا۔ اگر کچھ نہیں تھا تو گھر کا سکون اور عزم کی پختگی نہیں تھی۔ باقی سب کچھ تھا۔

شیریں کی یاد درد کی لہر بن کر دل سے اُٹھی ہے۔ یہ ہلکا ہلکا لطیف اور میٹھا زہر دل کے چشمے سے پھوٹ کر جسم و جان کی وادی میں چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں پھیلنے لگا ہے۔ میں نے صندوقچی بند کر کے کارنس پر رکھ دی ہے اور خود آتشدان کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ گیا ہوں۔ میں نے پائپ سلگا لیا ہے اور تمباکو کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے آنکھیں بند کر دی ہیں۔ پرسوں بائیس اگست ہے۔ میری محبّت کا جنم دن ہے۔

میں اس مرحوم دوست کی برسی منانے صرف ایک روز کے لیے وادیوں اور پہاڑوں سے اُتر کر لاہور جا رہا ہوں۔ جس طرح کوئی عقیدت مند یاتری مقدس دن کو دیوتاؤں کی مورتیوں کے درشنوں کے لیے مندر

میں آتا ہے۔

لاہور میرے لیے مندروں کے شہر سے کم نہیں۔ میں اس مندر کا بہت بڑا یاتری ہوں۔ یہاں میں اُن سڑکوں پر اپنے سکوٹر پر بیٹھا ایک بار پھر گذروں گا جہاں میری محبّت کی دیویاں کھڑی کھڑی پتھرا گئی ہیں۔ جہاں ہر قدم پر محبت کے مزار ہیں۔ میری محبّت کے مزار ہیں۔ میں وہ درخت دیکھوں گا جنھوں نے کبھی ہم دونوں کو بانہوں میں بانہیں ڈالے اکھٹے سیر کرتے دیکھا تھا۔ میں وہ بس سٹاپ دیکھوں گا جہاں شیریں میرے انتظار میں گھنٹوں کھڑی رہا کرتی تھی۔ میں وہ جگہ دیکھوں گا جہاں میں نے شیریں کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میں سڑک کے اس موڑ کے درشن کروں گا جہاں میں نے شیریں کو بس میں سے لیا تھا۔ اور وہ جگہ جہاں اُس نے میرے سکوٹر پر سے چھلانگ لگا دی تھی اور اُسے چوٹیں آئی تھیں اور میں نے بھاگ کر اُسے اُٹھا لیا تھا۔ میں قبرستان کی وہ ویران مسجد دیکھوں گا جہاں ایک دوپہر کو شیریں پسینے میں شرابور اپنے گھر والوں سے ناطہ توڑ کر مجھ سے نکاح کرنے آئی تھی۔ میں کیا کیا نہیں دیکھوں گا۔ کیا کیا زخم پھر سے نہیں کھاؤں گا۔ محبت کی یہ پرانی یادگاریں جو کبھی میری ہمدرد تھیں اور جنھوں نے میری محبت کو آگے بڑھانے میں مدد دی تھی۔ اب دشمن کے قلعے کے مورچے بن گئی ہیں جہاں سے مجھ پر جلتے ہوئے تیروں کی بارش ہوتی ہے۔

پھر بھی میں سینہ تانے ان تیروں کی بوچھاڑ میں گم شدہ محبت کی ان دکھی یادگاروں کی طرف بڑھتا چلا جاؤں گا۔ ایک ایک پھول کو آنکھوں سے لگا کر روؤں گا۔ ایک ایک موتی کو سنگریزوں میں سے چنوں گا۔ ایک ایک درخت سے گلے لگ کر آنسو بہاؤں گا اور جب سال بھر کے رکے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب ختم ہو جائے گا تو واپس پھر ان ہی پہاڑوں میں آجاؤں گا اور پھر دوسرے سال تک اپنی ویران محبت کے نوحے پڑھتا رہا ہوں گا اور ان دہکتی آگ کے شعلوں میں جلتا رہوں گا۔ غم و اندوہ کی وہ دولت جمع کرتا رہوں گا جو مجھے ایک سال بعد پھر اپنی محبوبہ کے سنگدل شہر میں جا کر لٹانی ہو گی۔ آنسوؤں کے وہ موتی جمع کرتا رہوں گا جو مجھے ایک ایک پرانی یادگار پر سو سو بار نچھاور کرنے ہوں گے۔

میری محبت جب شروع ہوئی تو میرے چاروں طرف پھولوں کی آبشاریں گر رہی تھیں۔ لیکن جب ختم ہوئی تو میں آتش فشاں پہاڑوں کے درمیان کھڑا تھا اور مجھ پر کھولتے لاوے اور دہکتے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ آغاز اس قدر شیریں تھا کہ میں شہد کی لذت کو بھول گیا۔ مگر انجام ایسا ہولناک اور تلخ کہ اس نے میری رگ رگ میں زہر گھول دیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں سیاہی سے نہیں بلکہ زہر سے اپنی داستانِ محبت قلم بند کر رہا ہوں۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ میں نے

شیریں کی ایک تصویر بنانی شروع کر رکھی ہے۔ جس روز یہ ختم ہو گئی۔ میں اُسے ساتھ لے کر جدائی کی چتا پر بیٹھ کر اپنا آپ بھڑکتے شعلوں کے حوالے کر دوں گا۔ شاید آگ بھی میری تصویر کے اُن رنگوں کو نہ جلا سکے جو میں نے شیریں کو دیئے ہیں۔ جس روز میں نے پہلے پہل شیریں کو دیکھا تو اس میں یہ رنگ نہیں تھے۔ اور میں نے پہلے روز شیریں کو لاہور کی ایک کلچرل سوسائٹی کے آفس میں دیکھا تھا۔

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

۲

جیسا کہ میں پہلے باب میں بتا چکا ہوں میں ایک فنکار یعنی آرٹسٹ ہوں۔ میں نے مصوّری کی تعلیم ولایت جا کر بھی حاصل کی ہے اور یوروپ کے دیگر مکتبۂ ہائے فکر کے علاوہ بنگال سکول سے زیادہ متأثر ہوں سب مجھے اُن کے دھیمے دھیمے سوگوار سے کلر اور اداس پس منظر بہت پسند ہے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں میں لاہور کی ایک مشہور فرم میں بطور آرٹسٹ ملازم تھا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ میں نیا نیا ولائت سے واپس آیا تھا۔ اگرچہ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پھر بھی یونہی شوقیہ میں نے اچھی خاصی تنخواہ پر اس فرم میں ملازمت کر لی۔ فرم ولائتی تھی اور وہاں مجھے بہت سی سہولتیں میسّر

تھیں جن کی وجہ سے میری آزادی پسند طبیعت نے کوئی قباحت محسوس نہ کی۔ مصوّری کے علاوہ مجھے بچپن ہی سے ریڈیو اور تھیٹر میں کام کرنے کا بھی شوق رہا ہے۔ مجھے یاد ہے میں اپنے اسکول کے ڈراموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتا تھا اور مشکل سے مشکل پارٹ بڑی آسانی سے ادا کر جایا کرتا تھا۔ مجھے سکول میں بہترین ڈرامہ کرنے پر کئی بار انعام بھی ملا تھا۔ میں ریڈیو پر بچّوں کے پروگرام میں بھی حصّہ لیا کرتا تھا اور بچّوں کے چھوٹے چھوٹے ڈراموں میں کام کیا کرتا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی بڑھتا چلا گیا اور میں شہر کی کلچرل سوسائٹیوں اور کالج کے ڈراموں میں باقاعدہ حصّہ لیتا رہا۔ کالج چھوڑنے کے بعد میں میو سکول آف آرٹس میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے میں نے مصوّری کی تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ولایت چلا گیا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ ۱۹۵۷ء کا زمانہ تھا اور اپریل کے آخری خوشگوار دن تھے کہ لاہور کی ایک مشہور کلچرل سوسائٹی کی جانب سے ایک ڈرامے کا اعلان ہوا۔ اس کلچرل سوسائٹی کے کرتا دھرتا میرے بڑے محترم تھے۔ وہ میرے فن کے قائل ہونے کے علاوہ مجھ سے بڑا پیار بھی

کرتے تھے اور بالکل اپنے بچّوں کی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک روز مجھے فون کیا اور ڈرامے کے سلسلے میں اپنے دفتر بلایا۔ میں دوسرے روز اپنے دفتر سے فارغ ہو کر اُن کے ہاں پہنچ گیا۔ اُن کا دفتر شہر سے باہر ایک بڑی ہی پُر فضا جگہ پر تھا۔ چاروں طرف باغ تھا۔ درمیان میں چھوٹی سی کوٹھی تھی جس کے ایک حصّے میں انھوں نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ میں نے اندر چِٹ بھجوائی۔ قریشی صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ میں چِق اٹھا کر اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں پہلے ہی سے دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک لڑکی تو قریشی صاحب کی بھانجی تھی جو میری واقف تھی اور جس کا نام شگفتہ تھا۔ چھوٹے سے قد کی گول مول سی لڑکی ــــ جس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اُس کی خیریت پوچھی اور قریشی صاحب سے ہاتھ ملا کر کرسی پر بیٹھ گیا

میں نے کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی شگفتہ تو خیر پردہ نہیں کرتی تھی لیکن اُس کے ساتھ والی لڑکی نے سیاہ برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ اُس کا نصف چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور آنکھیں اور پیشانی بغیر نقاب کے تھی گویا بادلوں میں سے آدھا چاند نکلا ہوا تھا۔ مجھے اس لڑکی کی آنکھیں اور پیشانی بڑی پیاری لگی۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ اور ہر آرٹسٹ کو زندگی کے بازار میں اپنے آئیڈیل کی ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ مجھے یوں

محسوس ہوا جیسے مجھے میرا آئیڈیل مل گیا ہو۔ جیسے میرے تخیل کی ساری تصویریں اپنے اپنے چوکھٹوں سے مجھے جھانکنے لگی ہوں۔ وہ لڑکی بھی کچھ محتاط سی ہو گئی تھی اور جب کبھی ایک دوسرے سے ہماری آنکھیں چار ہو جاتیں تو جلدی سے گھبرا کر آنکھیں جھکا لیتی۔ میں قریشی صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"شاہد میاں! بھئی ہم انارکلی ڈرامہ کر رہے ہیں اور تمھیں ہم نے شہزادہ سلیم کا کردار دیا ہے جو مجھے امید ہے تم پوری جانفشانی سے کرو گے۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔

اور انارکلی کون ہو گی؟"

"نیلوفر ہی کو لینا پڑے گا۔ ہاں تو کل سے اس کی ریہرسل شروع ہو رہی ہیں۔ تمھیں شام کو چھ بجے روزانہ یہاں آجانا چاہیے۔"

"ضرور آجایا کروں گا قریشی صاحب۔"

میں قریشی صاحب سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اُس آدھے چاند کو بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکی بار بار شرما جاتی اور اب مجھ سے آنکھیں چار نہیں کر رہی تھی۔ جب میں چلنے کے لیے اُٹھا تو میں نے قریشی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ اُن کی بھانجی شگفتہ کو

سلام کیا اور سیاہ برقعے والی لڑکی یعنی آدھے چاند کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سلام کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر اپنے سلیٹی رنگ کے سکوٹر پر بیٹھا اور گھر آگیا۔

اگلے روز ڈرامہ انارکلی کی ریہرسل شروع ہوگئی۔ میں بلا ناغہ دفتر سے واپس آکر قریشی صاحب کے دفتر جاتا اور ریہرسل میں حصّہ لیتا اس دوران میں نے دو ایک بار شگفتہ کو دیکھا لیکن وہ کالے برقعے والی لڑکی مجھے پھر دکھائی نہ دی۔ شگفتہ سے پوچھتے ہوئے بھی میں گھبرا رہا تھا کہ یہ کیا خیال کرے گی۔ اور پھر شگفتہ سے میری کبھی زیادہ بات بھی نہیں ہوئی تھی۔

ڈرامہ انارکلی شہر کے ایک خوبصورت ہال میں کھیلا گیا اور پہلے ہی روز اس کی دھوم مچ گئی۔ اخبارات اور رسالوں میں میرے کام کو بے حد سراہا گیا۔ نقادوں نے میرے فن کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے لوگ جوق در جوق ڈرامہ دیکھنے آنے لگے۔ ان میں کالج کے طلباء اور طالبات کی تعداد زیادہ ہوتی۔ ایک روز انٹرول کے درمیان میں تھیئٹر ہال کے ڈریسنگ روم میں بیٹھا اگلے ایکٹ کی تیاری کے سلسلے میں میک اپ وغیرہ کر رہا تھا کہ سیکرٹری اندر آیا اور کہنے لگا کہ باہر دو لڑکیاں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے چہرے پر کریم کی ہلکی سی تہہ

جماتے ہوئے پوچھا۔

"کس لیے ؟"

"شاید وہ آٹوگراف لینا چاہتی ہیں۔"

"انھیں اندر بھیج دو۔"

اس سے پہلے بھی میں ان گنت لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے آٹوگراف دے چکا تھا اور اب میرے لیے ان باتوں میں کوئی زیادہ کشش نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈریسنگ روم کا دروازہ پھر کھُلا اور میں نے آئینے میں سے دیکھا کہ وہی نصف نقاب والی لڑکی یعنی میرا آدھا چاند میرے پیچھے کھڑا ہے۔ میرے ہاتھ کریم کی شیشی پر وہیں جم کر رہ گئے میں حیران سا ہو گیا۔ یہ چاند میرے ڈریسنگ روم میں کیسے نکل آیا؟ میں جلدی سے کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس لڑکی کے ساتھ شگفتہ بھی کھڑی تھی۔ میں نے انھیں کرسیاں پیش کیں۔

"تشریف رکھیے۔"

شگفتہ نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھیے ہمیں آپ کے آٹوگراف چاہئیں۔ یہ میری سہیلی شیریں ہیں۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔ ہمیں آپ کا پارٹ بہت پسند آیا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"آپ کی نوازش ہے۔ ویسے میرا آٹوگراف لے کر آپ کیا کریں گی
میں کوئی اتنا بڑا فنکار نہیں۔ بلکہ ابھی طالب علم ہوں"
شگفتہ بولی۔
"اجی واہ! بھلا آپ کسر نفسی سے کیوں کام لے رہے ہیں۔
آپ تو لندن کے بی بی سی کے ڈراموں میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔
آپ تو اس فن کے ماہر ہیں۔ ہمیں تو آپ کے آٹوگراف لے کر بے حد
خوشی ہوگی"
"اگر اس میں واقعی آپ کی خوشی کا سوال ہے تو میں حاضر ہوں"
چنانچہ دونوں لڑکیوں نے اپنی اپنی آٹوگراف بکیں میرے سامنے
کر دیں۔ میں نے پہلے شگفتہ کی آٹوگراف بک ہاتھ میں لے کر اس
پر یونہی سا ایک شعر لکھ دیا۔ اس کے بعد شیریں کی بک ہاتھ میں
لی اور ایک نظر اسے دیکھا۔ اس نے معمول کے مطابق اپنا نصف
چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا اور بڑی بڑی شربتی آنکھیں لمبی لمبی
ریشمی پلکوں کے نیچے نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ جب شیریں نے مجھے آٹوگراف
بک دی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بے حد نازک اور خوبصورت
تھے۔ مخروطی انگلیاں، نازک اور ہموار جلد، بادام ایسے چمکیلے ناخن۔۔۔

جیسے کسی انتہائی خوبصورت آرٹسٹ لڑکی کے ہاتھ۔ یہ ہاتھ تو صرف دنیا کی بہترین تصویریں بنانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو ستاروں کو چھو سکتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگرچہ شیریں مصوّری نہیں کرسکتی لیکن اگر اس کے ہاتھ میں برش دے دیا جائے تو اُس کی دلکش، نازک اور فنکارانہ انگلیاں بہترین سے بہترین تصویریں پینٹ کر سکتی تھیں۔

میرا جی چاہا کہ میں ان ہاتھوں کا ایک چھوٹا سا مجسمہ بنا کر اس کو اپنے دل کے چبوترے پر رکھ لوں اور ساری عمر اُس کی پُوجا کرتا رہوں۔ میں ان ہاتھوں کی نزاکت، نرمی، روانی، تناسب اور خوبصورتی سے بے حد متأثر ہوا۔ میں نے آٹوگراف ہاتھ میں تھام رکھی تھی اور سوچ رہا تھا کہ کیا لکھوں۔ دراصل شیریں کی ٹُک ہاتھ میں لے کر میرے دماغ میں ان باتوں کا ہجوم ہو گیا تھا جو میں ایک ہی بار شیریں کو لکھ دینا چاہتا تھا۔ میں نے قلم کھولا اور یہ قطعہ لکھ دیا۔

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم میرے ساتھ چل سکو تو چلو
دور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورتِ شمع جل سکو تو چلو

شیریں قطعہ پڑھ کر نقاب کے اندر ذرا سی مسکرائی اور دھیمی سی

نقرئی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ شگفتہ نے بھی میرا رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور دونوں ڈریسنگ روم سے باہر نکل گئیں۔ کچھ وقت کے لیے تو میں جہاں کھڑا تھا وہیں بُت بنا کھڑا رہا۔ اچانک قریشی صاحب ہاتھ میں سکرپٹ تھامے اندر آئے۔

"بھئی شاہد جلدی کرو میاں وقت ہو رہا ہے اور تم نے ابھی میک اپ نہیں کیا۔ پہلی انٹری تمھاری ہے۔"

میں فوراً سنبھل گیا۔

"ہاں جی! بس دو منٹ میں تیار ہوتا ہوں۔"

اور میں آئینے کے سامنے بیٹھ کر جلدی جلدی چہرے پر کریم ملنے لگا۔ انٹرول کے بعد کھیل شروع ہوا تو میں نے سٹیج پر کام کرتے کرتے دیکھا کہ شیریں اور شگفتہ دونوں سٹیج کے بالکل پاس ہی سامنے والی قطار میں بیٹھی تھیں۔ شیریں کی میں صرف آنکھیں ہی دیکھ رہا تھا جو سٹیج کی فلڈ لائٹس میں چمک رہی تھیں۔ شگفتہ کی آنکھیں مجھ پر گڑی تھیں اور وہ بڑی دلچسپی اور دلجمعی سے میرا پارٹ دیکھ رہی تھی۔

ڈرامہ ختم ہوا۔ قریشی صاحب اور دوسرے کارکنوں نے میرے عمدہ کام پر مجھے مبارکباد دی۔ شگفتہ بھی شیریں کے ساتھ میرے پاس آئی۔۔۔ میں کچھ دیر اُن سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اُنھیں چھوڑنے تھیٹر ہال کے باہر تک

گیا۔ دونوں لڑکیاں تانگے میں بیٹھ گئیں۔ شگفتہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"ہم پھر کسی روز آئیں گی۔"

"میں ہمہ تن انتظار رہوں گا۔"

مخاطب میں شگفتہ سے تھا لیکن توجہ میری شیریں کی طرف تھی اور شیریں ہی کے دوبارا دیدار کے لیے میں نے یہ بات کہی تھی۔ لیکن شیریں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور نقاب سے نصف چہرہ ڈھانپے اپنی بڑی بڑی شربتی آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھنے اور ناقابلِ عبور جنگل کی دیوی بڑے بڑے تناور درختوں کے پیچھے سے مجھے اپنی سحر کار نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ مجھ پر ان آنکھوں نے جادو کر دیا تھا۔

تانگہ چل پڑا اور آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ڈرامہ دو روز مزید کھیلا گیا۔ دونوں ہی روز میں نے بڑی شدت سے شیریں کا انتظار کیا مگر وہ نہ آئی۔ اس دوران میں شگفتہ بھی نہ آئی۔ میں سٹیج پر کام کرتے ہوئے بار بار ہال میں اگلی قطاروں کی طرف دیکھ لیا کرتا۔ مگر گوہر مراد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہزاروں آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں مگر وہ آنکھیں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں جن کو دیکھنے کے لیے

میں تڑپ رہا تھا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ اس دوران میں مجھے شیریں کی کہیں بھی ایک جھلک دکھائی نہیں دی۔ میں قصداً دو ایک بار سکوٹر پر لڑکیوں کے کالج کے قریب سے گذرا مگر وہ نصف چاند کہیں بھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ دوسرے مہینے گورنمنٹ کالج کے ہال میں ایک اور ڈرامہ کھیلا گیا۔ اس کا انتظام بھی قدوسی صاحب کے سپرد تھا۔ اس ڈرامے میں بھی میں ہیرو کا رول ادا کر رہا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ پہلے ہی دن یہاں شیریںؔ سے ملاقات ہو گئی۔ شگفتہ اس کے ساتھ تھی۔ شیریںؔ کو اتنے دنوں بعد دیکھا تھا۔ دل میں خوشی اور بے تابی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ شیریںؔ کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر سینے سے لگا لوں اور آنکھیں بند کر لوں اور جب کھولوں تو ہزاروں سال گذر گئے ہوں۔ ہمارے ارد گرد سوائے خوبصورت گنجان جنگلوں، سر بفلک پہاڑوں، چاندی ایسی آبشاروں اور چہچہاتے پرندوں کے اور کچھ نہ ہو۔

لیکن ابھی ہمارے ارد گرد لوگ بیٹھے تھے جو اس بات کے منتظر تھے کہ ہم سے ذرا سی بھی لغزش ہو اور وہ ہمیں بدنام کرنے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ میں شیریںؔ کا پورا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا مگر اس نے کبھی نصف نقاب اوپر نہ اٹھایا تھا۔ بس صرف دو آنکھیں ہی تھیں جو اندھیری

رات میں جلتے ہوئے چراغ بن کر میری راہ نمائی کر رہی تھیں اور مجھے میری منزل کا نشان بتا رہی تھیں۔ میں شگفتہ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے گلہ کیا۔

"آپ نے اُس روز وعدہ کیا مگر نہ آئیں۔ میں انتظار ہی کرتا رہا۔"

شگفتہ میرے اس گلے سے یوں لگا جیسے بڑی خوش ہوئی۔

"معاف کیجئے گا آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ دراصل میں بڑی مصروف رہی۔"

شگفتہ صرف اپنا ذکر کر رہی تھی حالانکہ میرا مطلب شیریں سے تھا کہ وہ اُس روز کیوں نہیں آئی۔ شیریں خاموش کھڑی تھی۔ اتنے میں شگفتہ کی ایک پروفیسر وہاں آگئی۔ شگفتہ نے بڑے فخر سے اپنی پروفیسر سے میرا تعارف کرا دیا۔

"باجی یہ ہمارے شاہد صاحب ہیں۔ اس ڈرامے کے ہیرو، آرٹسٹ بھی ہیں۔ لندن، پیرس، سوئٹزرلینڈ سب جگہوں سے ہو آئے ہیں۔ بی بی سی میں بھی ڈراموں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔"

شگفتہ کے لیے یہ بڑی اہم باتیں تھیں کہ وہ کسی ایسے شخص کے پاس کھڑی ہے جو لندن اور پیرس کے بازاروں، کلبوں اور ہوٹلوں میں گھومتا رہا ہے۔ میرے لیے ان باتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی اور میں تو صرف

کنکھیوں سے شیریں کی بڑی بڑی جادو کرنے والی آنکھوں کو تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب میں ان آنکھوں پہ فرطِ عقیدت سے اپنے ہونٹ رکھ سکوں گا۔ جب میں ان آنکھوں کو قریب سے دیکھوں گا جب میں ان لمبی لمبی پلکوں کی چلمن اُٹھا کر اندر کی گہری وادیوں، جھیلوں اور جھیل کی تہہ میں چھپے ہوئے زمرد اور مرجان کے خوبصورت محلات کو دیکھوں گا۔ جب یہ آنکھوں والی جنگل کی دیوی میرا ہاتھ تھام کر مجھے جنگل کے تاریک اندھیروں میں لے جائے گی اور پھر اُن غاروں کی سیر کرائے گی جہاں ہر رات ایک نیا چاند طلوع ہوتا ہے۔ ہر روز ایک نیا سورج جنم لیتا ہے اور ہر شام روشنی کے نئے انار چھوٹتے ہیں۔

یہ ڈرامہ بھی پہلے کی طرح بہت کامیاب رہا اور لوگوں نے اسے بیحد پسند کیا۔ پورے ایک ماہ تک ڈرامہ کھیلا جاتا رہا۔ شگفتہ اپنی سہیلی شیریں کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے روز آجاتی اور میری آنکھوں اور دل کے لیے تسکین کا باعث بنتی۔ کیونکہ اُس کی وجہ سے میں شیریں کے دیدار کر لیتا۔ وہ چاند دیکھتا جو آدھا بادلوں میں چھپا ہوتا۔ وہ آنکھیں دیکھتا جو گہری جھیلوں میں ادھ کھلے کنول کے پھولوں کی طرح سطح پر نیم خوابیدہ ہوتیں۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ شگفتہ کی چھوٹی بہن بھی آجایا کرتی۔ یہ چھوٹی سی بچی تھی جو کانونٹ میں پڑھ رہی تھی۔ دونوں سہیلیاں اب ہماری ریہرسلوں

میں بھی آنے لگیں۔جس سے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔اب تقریباً ہر دوسرے روز شیریں کے درشن ہوتے۔میں اپنا پارٹ ختم کر کے ستون کے پیچھے آکر بیٹھ جاتا۔میرے بالکل سامنے ونگ میں شیریں اور شگفتہ بیٹھی ہوتیں۔وہ خوبصورت گھڑیاں میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔میں ان لمحات میں اپنی محبوبہ کو رُوبرو دیکھا کرتا تھا۔شیریں نے اپنا خوبصورت چہرہ نصف ڈھانپ رکھا ہوتا تھا۔دور سے اس کی فراخ پیشانی اور بڑی بڑی شربتی خواب گوں آنکھیں اندھیرے میں جگنوؤں کی مانند جگمگا رہی ہوتی تھیں۔دل چاہتا کہ ساری عمر اسی طرح بیٹھا رہوں اور شیریں کو ایک خاص ادا سے اپنا نرم و نازک ہاتھ پیٹ کے ساتھ لگائے اور دوسرے ہاتھ سے نقاب تھامے بیٹھی دیکھتا رہوں۔لیکن وقت شاید ہمارا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ گذرتا چلا جاتا ہے۔کبھی ہمیں اپنی محبتوں سے دور کرتا ہوا اور کبھی انھیں قریب لاتا ہوا۔کبھی دل پر ناامیدی اور ناکامی کے تیر چلاتا ہوا اور کبھی دل میں گڑے ہوئے تیر کو باہر نکالتا ہوا۔

ڈرامے کی مدت ختم ہو گئی۔شیریں اور شگفتہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہو گئیں۔شگفتہ کی جدائی کا اس لیے افسوس تھا کہ شیریں ہمیشہ اُس کے ساتھ ہوتی تھی اور شیریں کی جدائی کا اس لیے صدمہ تھا کہ میں اُس سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا۔خوابوں میں اُس کو اپنے پیار کی رنگین داستانیں

سنانے لگا تھا۔ آخری ملاقات میں میں نے اُن کے کالج کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ شیریں سیکنڈ ائر میں پڑھتی ہے۔ دو ایک بار اس کے کالج کے قریب سے اپنے سکوٹر پر گذرا مگر شیریں کی جھلک دیکھنے سے محروم رہا۔ ایک ہفتہ بعد مجھے اظہر کی معرفت ایک خط موصول ہوا۔ اظہر میرا دوست آرٹسٹ ہے اور لاہور میں اظہر سٹڈیو کے نام سے اُس نے آرٹ اور فوٹوگرافی کا ایک سٹوڈیو کھول رکھا ہے۔ شام کو میں اکثر اُس کے سٹوڈیو میں جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ خط پر جو ایڈریس لکھا تھا اس کی طرزِ تحریر عورتوں ایسی تھی۔ میں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ یہ خط شگفتہ کا تھا۔ لیکن اُس نے شیریں کو بھی بیچ میں شامل کر لیا تھا۔ یعنی اس طرح لکھا تھا کہ معلوم ہو کہ وہ اکیلی نہیں لکھ رہی بلکہ دونوں سہیلیاں مل کر خط لکھ رہی ہیں۔ اس خط میں انھوں نے میرے فن کی بڑی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ.....

"..... اخباروں میں بھی آپ کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ آپ نے دیکھا ہے ناں؟ ہم آپ کی اداکاری سے بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ ویسے بھی آپ بڑے قابلِ قدر انسان ہیں۔ اس دَور میں آپ ایسے انسانوں کا ملنا محال ہے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ دوسرا ڈرامہ کب کر رہے ہیں۔ ہم دونوں دیکھنے آئیں گی۔ ہمیں ضرور اطلاع کر دیجئے گا۔"

شگفتہ نے اس خط میں ساتھ ہی مجھ سے میرا صحیح ایڈریس اور دفتر کا فون نمبر بھی مانگا تھا۔ اس خط کا جواب میں نے مختصراً اور شکریے کے ساتھ اُسے اس کی ایک سہیلی کی معرفت پہنچا دیا۔ کچھ روز بعد میرے دفتر شگفتہ کا فون آ گیا۔ شگفتہ کے گھر پر فون لگا تھا اور وہ جب چاہے مجھے فون کر سکتی تھی۔ اُس نے کہا۔

"ہیلو شاہد صاحب! کیا حال ہے؟ جی ہاں میں شگفتہ بول رہی ہوں۔ سنائیے پھر کب کر رہے ہیں ڈرامہ ـــــ جی ہاں وہ بھی اچھی ہیں وہ میرے پاس ہی کھڑی ہیں....."

شیریں اُس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیا کسی طرح یہ فون شیریں کے ہاتھ میں نہیں جا سکتا۔ میں شگفتہ کو یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے شیریں کو سلام کہلوایا۔ شگفتہ مسکرائی۔

"..... آپ کا سلام کہہ دیا ہے۔ شیریں بھی سلام کہہ رہی ہے۔"

میرے کان گرم ہو کر جلنے لگے۔ کاش! میں شیریں کو اپنے سامنے دیکھ سکتا۔ اپنے کانوں سے اس کا سلام سُن سکتا۔ میں دیکھتا کہ مجھے سلام کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں نے کس دلکشی سے حرکت کی تھی اور آنکھوں میں کتنے ستارے جگمگانے لگے تھے۔

اب شگفتہ کے باقاعدہ خط اور فون آنا شروع ہو گئے۔ فون پر وہ

کبھی کہتی کہ شیریں بھی میرے پاس کھڑی ہے اور کبھی کہتی کہ میں اکیلی ہی فون کر رہی ہوں۔ خطوں میں وہ بڑی محتاط ہوتی اور عام طور پر اپنی گھریلو زندگی اور کالج کی مصروفیات کے بارے میں باتیں کیا کرتی۔ اب اُس نے شیریں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے نام سے مجھ سے مخاطب ہوا کرتی تھی۔ ایک روز اُس نے مجھے میرے دوست اظہر کے ایڈریس پر ٹافیوں کا ڈبہ بھیجا۔ ساتھ ایک نیلے رنگ کا کاغذ تھا جس پر "شگفتہ شیریں" لکھا تھا۔

وہ جب بھی فون کرتی میں اُس سے شیریں کا ضرور پوچھتا۔ اس پر وہ کبھی تو ٹال جاتی اور کبھی صرف اتنا کہہ دیتی کہ اب وہ مجھے کم ملتی ہے کیونکہ امتحان سر پہ آرہے ہیں۔ ہم دونوں پڑھائی میں لگی ہوئی ہیں۔ میں خاموش ہو رہتا۔ کیونکہ شیریں کے بارے میں زیادہ تذکرہ کرنے سے اس بات کا احتمال تھا کہ شگفتہ کو شبہ ہو جائے۔ لیکن دوسری طرف شگفتہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس نے باتوں ہی باتوں میں بڑے انداز سے اپنی محبت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ شگفتہ سے میرے محبت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اوّل تو اس لیے کہ میں شیریں کو اپنا سب کچھ دے بیٹھا تھا اور اب دل میں کسی کے لیے جگہ باقی نہ تھی۔ دوسرے شگفتہ میرے ایک محترم بزرگ کی بھانجی تھی جن کی میں بے حد

عزت کرتا تھا۔ میں شگفتہ کو کبھی عاشق کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک دن اُس نے اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ مجھے ایک رومال، بھیجا۔ رومال عطر میں بسا ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی چاندی کا ایک چھوٹا سا دل بھی تھا جس میں تیر لگا ہوا تھا۔ میں نے شکریے کے ساتھ یہ تحفہ رکھ لیا اور فون پر بھی شگفتہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہ کی۔ آخر میں مَیں نے شگفتہ سے کہا۔

"بھئی تم لوگ کسی روز مجھے ملو۔ تھوڑی دیر گپ شپ رہے گی۔ ایک عرصہ ہو گیا ہے تم لوگوں کو دیکھے۔"

ایک پل کے لیے شگفتہ ٹھٹھکی۔

"ہم لوگوں سے آپ کی کیا مراد ؟"

"یعنی بھئی تم اور تمھاری سہیلی شیریں۔ اچھی لڑکی ہے۔ وہ بھی بڑی سیدھی سادی ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لیکن ہمارا ملنا بڑا مشکل ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو سر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"

"فکر نہ کرو میں تم لوگوں کو سلیمانی ٹوپیاں اوڑھا دوں گا۔"

"اجی اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب تو لوگ لڑکی نظر نہ بھی آرہی ہو تو اُسے دیکھ لیتے ہیں۔"

شگفتہ کو باتیں کرنی خوب آتی تھیں۔ وہ اس قسم کی لڑکی تھی جو بہت باتیں کیا کرتی ہیں اور ہر آدمی سے باتیں کرلیتی ہیں اور کسی بات میں بھی شرم یا جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ اُن کے پاس ہر بات کا جواب موجود ہوتا ہے۔ سوائے اُس بات کے جو اُن سے شادی کی پہلی رات اُن کا خاوند اُن سے پوچھتا ہے۔ شگفتہ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ چھوٹی سی، گول مٹول سی، باریک ہونٹ، چوڑے نتھنے، کھلے کھلے رخسار — نگاہیں ہمیشہ چلتے وقت سامنے رکھتی تھی لیکن چاروں طرف سے باخبر رہتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے دیکھ کر مجھے اُس بحری جہاز کا خیال آجاتا تھا جو اگرچہ اوپر سے چھوٹا ہوتا ہے مگر پانی میں اپنی جسامت سے دوگنا زیادہ گھُسا ہوتا ہے۔ بڑی سست روی سے پانی میں پھونک پھونک کر چلتا ہے اور بھونپو بجا بجا کر اردگرد کے سٹیمروں کو پریشان کر دیتا ہے۔

دوسری بار فون پر شگفتہ سے میں نے ملاقات کا وقت لے لیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ دونوں کالج سے فارغ ہو کر اسمبلی ہال والے بس سٹاپ پر پہنچ جائیں گی۔ میں ٹھیک وقت پر بس سٹاپ سے ذرا پیچھے اُس سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا جو اُن کے کالج کی طرف سے آتی تھی۔ ٹھیک ایک بجے شگفتہ اور شیریں کو میں نے بس سٹاپ کی طرف آتے دیکھا۔ میں نے سکوٹر ایک طرف کھڑا کر رکھا تھا اور خود ایک کھمبے کے ساتھ لگا

سگرٹ پی رہا تھا۔ قریب آکر وہ دونوں رُک گئیں۔ میں نے شگفتہ اور شیریں کو آداب کہا۔ شگفتہ بڑی خوش خوش نظر آرہی تھی۔ اُس کے مقابلے میں شیریں کچھ خاموش اور اُداس اُداس معلوم ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں غم کی جھلک تھی۔ شگفتہ نے گھبرا کر کہا۔

"خدا کے لیے یہاں کھڑے نہ ہوں۔ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی۔"

ہم دونوں پلازا کی طرف چل پڑے اور شیریں وہیں بس سٹاپ پر رُک گئی۔ کیونکہ وہاں سے اُسے بس میں سوار ہو کر اپنے گھر گارڈن ٹاؤن جانا تھا۔ میں نے شیریں سے کہا۔

"آپ بھی تشریف لائیے۔"

شیریں نے دھیمی سی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"جی نہیں شکریہ۔"

میں نا اُمید ہو کر شگفتہ کے ساتھ چل پڑا۔ اُسے ایک گمنام سے ریستوران میں لے کر آگیا۔ یہاں شگفتہ میرے ساتھ صرف پانچ منٹ تک بیٹھی۔ اس دوران میں وہ بار بار گھڑی دیکھتی رہی اور یہی کہتی رہی کہ اُسے جلدی گھر جانا ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ میں نے اُس سے بڑی رسمی باتیں کیں۔ کیونکہ میرا مقصد فوت ہو چکا تھا۔ جس لڑکی کی خاطر میں

وہاں آیا تھا اور میں نے شگفتہ کو بلایا تھا۔ وہ تو بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے شگفتہ سے اس کے امتحانوں کا پوچھا۔ قریشی صاحب کی خیریت دریافت کی۔ میں نے آخر کہہ ہی دیا۔

"شیریں آپ کے ساتھ یہاں کیوں نہیں آئی۔ اگر وہ بھی آجاتیں تو اس محفل کی رونق میں اضافہ ہو جاتا۔"

شگفتہ نے ایک ایسا جواب دیا جس سے میں پریشان ہو گیا۔

"بات دراصل یہ ہے شاہد صاحب کہ یہاں مال روڈ پر ایک دفتر ہے جس میں شیریں کے منگیتر کام کرتے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں آئی کہ کہیں انھیں خبر نہ ہو جائے۔"

تو کیا شیریں کی منگنی بھی ہو چکی ہے؟ وہ خوش نصیب آدمی یہاں مال روڈ پر ہوتا ہے؟ میرا دل بجھ سا گیا۔ مجھے باتوں میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ میں خاموش ہو گیا۔ شگفتہ مجھ سے بڑی باتیں کرتی رہی۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے محبّت کرتی ہے اور مجھ سے اظہارِ محبت کی توقع رکھتی ہے۔ لیکن اس سے محبّت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میں نے زبانی باتیں کرنی مناسب نہ سمجھیں اور شگفتہ سے صرف اتنا ہی کہا کہ میں اُسے کل ایک خط لکھوں گا۔ اِس بات پر شگفتہ کا چہرہ کھل گیا۔

"آپ کیا لکھیں گے اُس میں؟"

"تم خود پڑھ لینا۔"

"پھر بھی ــــ"

"بس پڑھ لینا۔"

وہ مسکرائی اور پھر جلدی سے بولی۔

"اچھا بابا اب میں چلتی ہوں۔ بڑی دیر ہوگئی۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے اُسے خط لکھا۔

"شگفتہ! میں تمھیں یہ آخری خط لکھ رہا ہوں۔ جس کا جواب دینے کی تمھیں ضرورت نہیں محسوس ہوگی۔ میرے پاس تمھارے کئی ایک خطوط آتے رہے۔ میں نے بعض کا جواب دیا اور بعض کا نہیں۔ جواب نہ دینے کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلے تو تمھاری اور اپنی عزّت پیش پیش رہی۔ دوسری بھی اسی قسم کی بہت سی چیزیں تھیں۔ مثلاً تمھارے ماموں جان کی شرافت اور اُن کا میرے ساتھ مخلصانہ سلوک، میری خاندانی نجابت اور عزّتِ نفس ــــــ اور بہت سی باتیں تھیں جنھوں نے میرا ہاتھ تھامے رکھا اور میں تمھارے اظہارِ محبّت کا جواب نہ دے سکا۔ میں تمھارا بیحد ممنون ہوں کہ تم میرے فن کی قدردانی ہی نہیں بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتی رہی ہو۔ اس کے باوجود میں تمھارے خطوط کا جواب دیتا رہا۔ اس خیال سے کہ تمھاری دل شکنی نہ ہو۔ تم ایک بھولی بھالی اور بڑی ہی اچھی لڑکی ہو۔ میں ہمیشہ تمھاری

بہتری اور بھلائی کے لیے دُعا گو رہوں گا۔ تمھیں شاید یقین نہ آئے ہیں نے
ٹھیٹھ ایسے ماحول میں رہ کر بھی بُرائی سے گریز کیا اور اپنا دامن ہر شے
سے پاک رکھا۔ اس کے باوجود لوگ انگشت نمائی کرتے رہے۔ لیکن میں
نے پروا نہ کی۔ کیونکہ میرا ضمیر مطمئن تھا۔ میں نے تمھیں
جو خط لکھے تم خود جانتی ہو کہ میں نے اُن میں بھی انسانیت
اور شرافت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مگر اس کے باوجود مجھے
تمھاری عزّت کا خیال بھی تھا۔ اپنا وقار بھی پیشِ نظر تھا۔ میں بڑا رومانی
آدمی ہوں۔ آرٹسٹ ظاہر ہے بڑے محبت کرنے والے اور حوصلہ مند
انسان ہوتے ہیں اور بڑی سے بڑی دیوار پھاند جاتے ہیں۔ مگر میں ڈرتا
ہی رہا۔ میری انسانیت اور شرافت ہمیشہ آہنی دیوار بن کر میرے سامنے
آکھڑی ہوتی اور میں یہ دیوار ساری عمر نہیں کود سکتا۔ کیونکہ یہاں میں اپنے
آپ کو بے بس پاتا ہوں۔ میں تمھیں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن اس
خیال سے نہیں لکھ رہا کہ تمھاری دل شکنی ہوگی۔ میری دعا ہے کہ خدا تمھیں
خوش و خرم رکھے اور کسی غم کا سایہ بھی تم پہ نہ پڑنے پائے۔ تم بڑی اچھی
لڑکی ہو۔ میرے بارے میں کبھی کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ ہمیشہ یہ خیال
رکھنا کہ اچھے خاندان کے آدمی سے کبھی کوئی غلط کام نہیں ہو سکتا۔
شرافت ہر غلطی پر اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ تم تصوّر ہی تصوّر میں یہ

سمجھ لینا کہ شاہد مر گیا ہے۔ اچھے دوست کی طرح تم مجھے جب چاہو خط لکھ سکتی ہو۔ فون کر سکتی ہو۔ بلا سکتی ہو۔ لیکن اس توقع کے بغیر کہ میں تمہیں خط کا جواب بھی دے سکوں گا یا نہیں۔ تصویر کا ایک رُخ ہی نہ دیکھنا۔ میری مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھنا۔ پھر شاید تم مجھے معاف کر دو۔

شاہد"

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

۳

اس خط کے ساتھ ہی شگفتہ نے مجھے خط لکھنے اور فون کرنا بند کر دیا۔
یہاں شگفتہ کے چھوٹے سے کمرے کا دروازہ بند ہوتا ہے اور شیریں کے شہرِ زرنگار کا دروازہ کھلتا ہے۔ وہ شہر جس کی گلیوں میں سے گذرتے ہوئے مجھ پر پھول بھی پھینکے گئے اور پتھروں کی بارش بھی ہوئی مجھے آنکھوں میں بھی بٹھایا گیا اور میرے پاؤں تلے سے زمین بھی کھینچ لی گئی۔ مجھے شگفتہ کو خط لکھے کئی روز ہو گئے تھے۔ ہر محاذ پر خاموشی طاری تھی۔ مجھے شگفتہ کے ذریعے سے ہی شیریں کا کچھ حال احوال معلوم ہو سکتا تھا۔ اور شگفتہ نے میرا خط ملتے ہی عہد کر لیا تھا کہ وہ مجھے نہ کبھی خط لکھے گی اور نہ کبھی فون کرے گی۔ میں شیریں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔

لیکن اُس سے کیونکر ملوں؟ کیسے ملوں؟ ایک دن میں دفتر میں بیٹھا ایک ضروری ڈیزائن بنا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں اپنے کام میں بے حد مصروف تھا۔ اُس روز ایک کمپنی والوں کی جانب سے کام کو جلدی کروانے کی تاکید کے سلسلے میں بار بار فون آ رہے تھے اور میں تنگ آچکا تھا۔ گھنٹی بجتی رہی اور میں کام کرتا رہا۔ پھر سوچا کہ خوامخواہ یہ گھنٹی دماغ پریشان کر رہی ہے۔ چلو انھیں ایک بار پھر تسلی دے دو۔ میں نے ریسور اٹھایا۔

"ہیلو"

"جی سلام علیکم؟ آپ شاہد صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں! کہو شگفتہ بھئی کیا حال ہے۔ میرا خط لکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تم بول چال ہی بند کر دو۔"

"جی — جی میں شگفتہ نہیں۔ شیریں بول رہی ہوں۔"

ریسور میرے ہاتھ میں کانپ اٹھا۔ شیریں؟ شیریں بول رہی تھی؟ اور میں ریسور ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ میرے خدا اگر میں ریسور اُٹھاتا ہی نہ تو مجھ سے ایک ایسی بھول ہو جاتی جسے میں زندگی کے آخری لمحوں تک نہیں بھلا سکتا تھا۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ کی آواز شگفتہ کی آواز سے کچھ ملتی جلتی ہے

اور پھر مجھے بھلا کیسے یقین ہو سکتا تھا کہ آپ بھی مجھے کبھی فون کریں گی
کیسے آپ کے مزاج اچھے ہیں؟"

"جی ہاں - شکریہ۔"

دونوں طرف ایک منٹ خاموشی چھائی رہی - پھر شیریں نے پوچھا۔
"جی، وہ شگفتہ نے پوچھا ہے کہ اُس روز آپ کے سر میں درد تھا۔
اب کیا حال ہے؟"

"خدا کا شکر ہے - میں ٹھیک ہوں۔"

"شگفتہ نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنے امّی ابّا کے ساتھ پکچر دیکھنے
پلازا شام کو آ رہی ہوں - آپ بھی آئیے گا۔"

"کیا آپ بھی ساتھ آ رہی ہیں؟"

"جی کہہ نہیں سکتی۔"

"نہیں آپ ضرور آئیے گا - میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا۔"

"جی میں وعدہ نہیں کرتی - ویسے کوشش کروں گی۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

"اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

اس روز میں نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر نوکر سے سکوٹر کو خوب چمکا کر

گھر سے نکلا اور پلازا سینما والی سڑک پر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پورے سوا چھ بجے ایک پرانی سی کالی گاڑی سینما کے باہر رُکی اور اس میں سے شگفتہ اور اس کے امّی ابا باہر نکلے۔ شیریں اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نہیں آئی تھی۔ میں سخت نا اُمید ہوا۔ ظاہر ہے اگر وہ آتی تو ان لوگوں کے ساتھ ہی آتی۔ اب سینما دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سکوٹر پر سوار ہوا اور واپس گھر آ گیا۔

دوسرے روز شیریں نے پھر فون کیا۔ اُسے اس بات کا خیال رہا کہ وہ سینما نہیں گئی اور میں نے وہاں اس کا انتظار کیا ہو گا۔

"جی مجھے افسوس ہے کہ میں کل شگفتہ کے ساتھ نہیں جا سکی۔"

"میں تو ایک گھنٹہ سڑک پر کھڑا ہو کر ہو کر آپ کی راہ دیکھتا رہا تھا۔ پھر میں نے شگفتہ کو دیکھا تو واپس ہو گیا۔"

"آپ ان لوگوں کے ساتھ فلم دیکھ لیتے۔"

"میں صرف آپ کو دیکھنے وہاں گیا۔ نہ شگفتہ کو اور نہ فلم کو۔"

پھر ایک منٹ کی خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"شیریں!"

ایک لمحے کے بعد شیریں نے کہا۔

"جی"

یہ لفظ شیریں نے کچھ ایسے بھولپنے، راز دارانہ اور گرم سے لہجے میں کہا کہ میرا دل دھڑکنے لگا اور چہرہ گرم ہو گیا۔

"کوئی شعر سنائیے۔"

"جی مجھے تو شعر نہیں آتے۔"

"میں سناؤں؟"

"آپ کی مرضی۔"

میں نے شیرانی کے دو شعر سنائے۔ شیریں رخصت ہونے لگی تو میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کس لیے؟"

"میں شگفتہ کے بارے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی دراصل میں ملتے ہوئے گھبراتی ہوں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔"

ہم ایسی جگہ چل کر بیٹھیں گے جہاں آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"میں وعدہ نہیں کرتی۔"

"کوشش تو کریں گی۔"

"جی ہاں۔"

"تو کب تک اُمید رکھوں۔"

"میں فون کر کے آپ کو بتا دوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ شیریں!"

شیریں نے فون بند نہ کیا۔ میں نے ریسور اٹھائے رکھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ پہلے میں بند کروں۔ لیکن میں اپنی محبّت کی شان میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

"شیریں۔"

"جی۔"

اتنا کہہ کہ شیریں نے فون بند کر دیا۔ اور میں ریسور رکھ کر دل تھام کر رہ گیا۔ شیریں کی اس ایک ہلکی سی "جی" نے محبّت کے تمام دشوار مراحل پلک جھپکنے میں طے کر لیے تھے۔ تیسرے روز شیریں نے فون کیا تو میں نے اُس سے ملاقات کا وقت لے لیا۔

"میں کل صبح نو بجے پلازا سینما والے بس سٹینڈ پہ آجاؤں گی۔ لیکن صرف پانچ منٹ ٹھہروں گی۔"

"میرے لیے وہ پانچ منٹ پانچ ہزار سال کے برابر ہوں گے۔"

حقیقتاً میں شیریں کے ساتھ بسر کیے ہوئے پانچ ہزار سال بھی پانچ منٹ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ جب میں اُسے ملتا تھا تو وقت

آندھی بن کر اڑنے لگتا تھا۔ ذرا سی دیر میں دوپہر گذر جاتی تھی۔ اور جب اُس سے دوسرے روز ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہوتا تو دوسرا روز آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ بہرحال شیریں سے میری پہلی پُر محبّت ملاقات کا دن آ گیا۔

اس روز ۲۲ر اگست تھا۔ گرمی خوب پڑ رہی تھی۔ تین دن پہلے کہیں بارش ہو چکی تھی۔ جس کا حبس ابھی تک فضا میں موجود تھا۔ میں نے اس روز دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ صبح صبح اٹھ کر میں نے غسل کیا۔ نماز پڑھی۔ ناشتہ کیا اور سگریٹ سلگا کر اخبار پڑھتا رہا۔ بار بار گھڑی کی طرف نگاہیں اٹھتیں۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے سوا آٹھ پر آ کر رُک گئی تھیں۔ ایک گھنٹے سے صرف سوا آٹھ ہی بج رہے تھے۔ میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر باہر اپنے برآمدے میں آ گیا۔ خدا خدا کر کے کہیں ساڑھے آٹھ ہوئے اور میں سکوٹر پر سوار ہو کر پلازا سینما کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس روز میں نے سفید مکھن ژین کی ٹھنڈی پتلون اور ربوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی۔ میں پلازا سینما والے چوک کے بس سٹینڈ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سکوٹر میں نے پاس ہی کھڑا کر رکھا تھا۔ میں بڑی بیتابی سے شیریں کی راہ دیکھنے لگا۔ نو بج گئے مگر شیریں کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ نو بج کر پانچ منٹ پر مزنگ چونگی کی جانب سے ایک تانگہ آتا دکھائی دیا۔ جس کی پچھلی سیٹ پر ایک سیاہ برقعے والی لڑکی بیٹھی تھی۔ جب ذرا تانگہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکی نے

آنکھوں پر سے نقاب اٹھا رکھا تھا۔

یہ شیریں تھی۔

میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ تانگہ میرے بالکل قریب آکر کھڑا ہوگیا شیریں تانگے سے اُتر کر میرے پاس آئی۔ میں نے مزاج پوچھا۔ سکوٹر سٹارٹ کیا۔ وہ بڑی خاموشی اور وقار کے ساتھ میرے سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں اُسے لے کر ارجن ٹینا ریسٹوران میں آگیا۔ راستے میں شیریں کا جسم کچھ کچھ میرے جسم کے ساتھ لگا رہا۔ ایک بار تھوڑا سا دھکا لگا تو شیریں نے جلدی سے مجھے تھام لیا۔ جب اُس نے مجھے تھاما تو مجھے اتنی لذت اور تسکین ملی کہ سکوٹر میرے ہاتھ سے نکلتے نکلتے بچا۔ وہ بھی یقیناً میرے پیچھے بیٹھی میری گردن پر بالوں کو دیکھتی رہی ہوگی جن میں میں نے یارڈلے کریم لگا رکھی تھی۔ ارجن ٹینا میں آکر ہم ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔ یہاں میں نے شیریں کو پہلی بار اچھی طرح دیکھا۔ اُس نے چہرے پر سے پورا نقاب ہٹا رکھا تھا اور نظریں جھکائے فرش کو تاک رہی تھی۔ ستواں ناک، باریک ہونٹ، جیسے یاقوت میں سے تراش کر بنائے گئے ہوں۔ ذرا سا مسکراتی تو رخسار میں بائیں جانب چھوٹا سا گڑھا پڑ جاتا۔ مانگ درمیان میں سے نکلی ہوئی۔ ریشمی نرم اور ملائم بال جن میں سے ناریل کے تیل کی ہلکی ہلکی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ پھسل کر ماتھے پر آگئی تھی۔ آنکھیں ادھ کھلے بڑے کنول تھیں۔ جن پر

پلکوں کی ریشمی جھالر پڑی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ خوبصورت اُس کے ہاتھ تھے۔ نرم، نازک، لمبے اور مخروطی انگلیوں والے معلوم ہوتا تھا خدا نے اُسے مصور بنانے کے لیے اس کے ہاتھ بنائے ہیں۔ بعد میں جب میں نے شیریں کے پاؤں دیکھے تو وہ بھی بے انتہا موزوں اور خوبصورت تھے حالانکہ عام طور پر خوبصورت عورتوں کے پاؤں بھدّے ہوتے ہیں۔ لیکن شیریں کے پاؤں اتنے نازک اور دلکش تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ ان پاؤں پر چل کر بہشت کے بہت ہی خوبصورت حصّے سے آرہی ہے۔

چند ایک ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے شیریں کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دل کی کتاب کھول کر اُس کے سامنے رکھ دی۔

"شیریں! میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں بڑا صاف گو اور سچّا آدمی ہوں۔ جو بات میرے دل میں ہوتی ہے میں اسے بڑی بیباکی سے زبان پر لے آتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے شیریں کہ میں تم سے محبّت کرتا ہوں اتنی محبّت کہ اگر میں اس کی تشبیہہ سمندر کے قطروں اور آسمان کے ستاروں سے دوں تو شاید اُن کی گنتی ختم ہو جائے اور میری محبّت کا ایک پہلو بھی بیان نہ ہو۔ میں نے جس روز پہلے پہل تمھیں قریشی صاحب کے دفتر میں دیکھا تھا تو اپنا دل تمھارے قدموں پر بچھا کر دیا تھا۔ تمھاری محبّت بہار کا پہلا شگوفہ بن کر میرے دل کی ٹہنی پر پھوٹی ہے اور پھول بن کر میرے دل میں سدا

مہکتی رہے گی۔ یہ پھول پت جھڑ میں بھی نہیں مرجھائے گا کیونکہ میں اس کی آبیاری اپنے خون سے کر رہا ہوں۔ بلکہ میری موت کے بعد بھی یہ پھول میرے جسم سے اور پھر میرے جسم کی مٹی سے نمو حاصل کرتا رہے گا اور اس کی پنکھڑیاں سدا تر و تازہ رہیں گی۔ تم اتنی خوبصورت اتنی پیاری ہو کہ میں تمہاری ایک ہزار ایک تصویریں بنا کر بھی تمہاری خوبصورتی اور نزاکت کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ تمہارے ہاتھ قدرت نے صرف پرستش کرنے کے لیے بنائے ہیں۔ تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میں دنیا کی بہترین شاہکار تصویریں بنا سکتا ہوں۔ تم میرا آئیڈیل ہو۔ میری زندگی اور میرے فن کا آدرش ہو۔ میرے خوابوں کی مجسم تصویر ہو۔ میں لندن کی پکاڈلی پیرس کی گلیوں اور سوئٹزرلینڈ کی وادیوں اور اٹلی کی خوبصورت کلبوں میں بھی گھوما ہوں، لیکن مجھے اپنا آئیڈیل کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے شیریں ایسا حسن اور فطرت کے سانچے میں ڈھلا ہوا مجسمہ لوّر کی گیلری اور قاہرہ کے عجائب گھروں میں بھی نہیں دیکھا۔ شروع شروع میں شگفتہ کو میں نے اس لیے اُس کے خطوں کے جواب دیئے کہ میرا خیال تھا کہ تم بھی اُس میں شامل ہو۔ کیونکہ وہ ہمیشہ "ہمیں" کہہ کر لکھا کرتی تھی۔ میں نے شگفتہ سے کبھی محبت نہیں کی۔ اُس کو صرف اس لیے فون کر کے بلاتا کہ شاید تم بھی اُس کے ساتھ آ جاؤ۔ لیکن جب اُس نے مزید قدم بڑھانے شروع کر دیئے تو میں نے اُسے صاف لکھ دیا کہ

میں اُس سے محبت نہیں کر سکتا۔ شیریں! میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ صرف دوستی اور محبت کا طلبگار ہوں۔ مجھے بتاؤ کیا تم ہمیشہ میری دوست رہو گی؟ بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟ کیا جس آگ نے میرے دل میں الاؤ جلا رکھا ہے اُس کی ایک ہلکی سی چنگاری تمہارے دل میں بھی پھوٹی ہے یا نہیں۔ بولو شیریں! تم خاموش کیوں ہو؟ تم جواب کیوں نہیں دیتیں۔ تم نے نظریں کیوں جھکا رکھی ہیں؟"

شیریں نظریں جھکائے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور سینہ بار بار اُبھر کر نیچے ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر کہنے لگی۔

"مجھے تو شگفتہ نے یقین دلا دیا تھا کہ آپ اُس سے محبت کرتے ہیں۔ اسمبلی ہال والی ملاقات کے روز تو وہ خاص طور پر مجھے بھی دکھانے لائی تھی کہ دیکھو شاہد صاحب مجھ سے ملنے وہاں آئے ہوئے ہیں۔ میں یہ سن کر چپ ہو جاتی اور اداس ہو جایا کرتی۔"

میں نے پوچھا۔

"اُداس کیوں شیریں؟ تم اُداس کیوں ہو جایا کرتیں؟"

شیریں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"اس لیے کہ میں بھی آپ کو پسند کرنے لگی تھی۔ لیکن جب میں نے دیکھا

کہ آپ شگفتہ کو خط خط لکھتے ہیں اور شگفتہ بھی آپ سے پیار کرتی ہے تو میں دل تھام کر رہ گئی۔"

میں حیران رہ گیا کہ یہ چھوٹی سی گول مٹول لڑکی کتنا بڑا چکمہ چلا رہی تھی۔

میں نے فوراً شیریں سے پوچھا۔

"کیا تمہاری منگنی ہو چکی ہے شیریں؟"

شیریں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔"

میں ہنس پڑا۔

دیکھو یہ شگفتہ کتنی چالاک لڑکی ہے۔ جس روز تم اُس کے ساتھ اسمبلی ہال تک آئی تھی ناں اور میں نے تم سے درخواست کی تھی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ آجائیں۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"اُس روز جب میں نے شگفتہ سے پوچھا کہ شیریں آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئی تو اُس نے جانتی ہو کیا کہا تھا؟"

"کیا؟"

"کہنے لگی شاہد صاحب بات یہ ہے کہ یہاں مال روڈ پر ایک دفتر میں شیریں کا منگیتر کام کرتا ہے۔ اس لیے وہ ادھر نہیں آتی کہ کہیں اُسے

پتہ نہ چل جائے۔"

شیریں بھی اس بات پر حیران رہ گئی۔ پھر ذرا سا مسکرادی اور بولی۔

"شاید بے چاری نے اپنی محبّت کے جوش میں ایسا کیا ہے۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لیکن جھوٹ کے بادل چھٹ گئے ہیں شیریں اور سچائی کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر طلوع ہو چکا ہے۔ اس آفتاب کی سنہری روشنی میں میں تمھیں ایک تر و تازہ پھول کی طرح مسکراتے اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ یہ ارجن ٹینا ہوٹل کا کیبن نہیں بلکہ جنّتِ ارضی کا ایک زمرّدیں قصرِ شیریں ہے۔ اگر تم اس وقت میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو تمھیں محسوس ہوگا کہ میرے سینے میں دل نہیں بلکہ تمھاری محبّت کا سُرخ پھول دھڑک رہا ہے۔ میں تمھاری محبت میں اس طرح شرابور ہو گیا ہوں جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر تیز بارش میں مونئے کا شگوفہ بھیگ جاتا ہے۔ اگر تم میرے سینے پر کان رکھ کر سنو تو تمھیں ہر دھڑکن کے ساتھ میرے دل کا سرخ پھول تمھارا نام لیتا سنائی دے گا۔"

میں نے شیریں کا ہاتھ چوم لیا۔ شیریں نے نظریں جھکا رکھی تھیں اور اُس کا چہرہ شرم و حیا سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا دل بھی سینے کے اندر تیز تیز دھڑک رہا ہوگا۔ کیونکہ سچّی محبت اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی اور میں شیریں سے اُسی طرح محبّت کر رہا تھا جس طرح کوئی شب زندہ دار صوفی خدا کی ذات سے

محبت کرتا ہے۔

ہم کوئی دو گھنٹے ارجن ٹینا کے اس کیبن میں بیٹھے رہے۔ میں نے شیریں سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے گا ہے گا ہے ملتی رہے گی اور فون بھی کرتی رہے گی اگرچہ شیریں کا کالج سے گھر دیر سے پہنچنا اور گھر سے مجھے ملنے کے لیے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر بھی اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ملنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہے گی۔ میں اُسے چھوڑنے بس سٹاپ تک آیا۔ وہ گنگا رام ہسپتال والے بس سٹینڈ سے بس میں سوار ہوئی۔ جب تک بس نہ آئی ہم دونوں ایک طرف کھڑے ہوکر باتیں کرتے رہے۔ دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی، پیاری اور معصوم باتیں شیریں کسی وقت ذرا سا مسکرا دیتی اور میں بار یک نقاب کے اندر دیکھتا کہ اُس کے رخسار پر بائیں جانب ایک ننھا سا گڑھا پڑ جاتا تھا۔ شیریں کو گھر لے جانے والی، میری نظروں سے اوجھل کر دینے والی بس آگئی۔ وہ اس میں سوار ہوگئی۔ بس چل پڑی۔ میں سکوٹر پہ آ گئے نکل گیا۔ چوک سے واپس ہوا اور جب شیریں کی بس کے قریب سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ شیریں کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ایک طرف سے برقعے کا نقاب ذرا اٹھایا اور مسکرا دی۔ مجھے گویا دونوں جہان کی دولت مل گئی۔ میں اُس آدمی کی طرح پُرمسرّت اور شاداں گھر آگیا۔ جس کی اچانک لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آئی ہو اور وہ اپنی اچانک مل جانے والی

دولت کو دونوں ہاتھوں سے تھامے جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف بھاگا جا رہا ہو۔

شیریں نے مجھے اپنا ایک ایڈریس دیا تھا جس پر اُس نے کہا تھا کہ میں اُسے خط لکھ سکتا ہوں۔ اُسی رات میں نے اُسے اپنی محبّت کی زندگی کا پہلا خط لکھا۔ اپنے باغِ تمنّا کا پہلا پھول توڑ کر اپنی محبّت کی وادی کے قدموں پر نچھاور کیا۔ میں نے اُسے لکھا "شیریں ڈیر! آج کا دن ایک سہانے خواب کی طرح کتنی تیزی سے گذر گیا۔ میرے کانوں میں ابھی تک تمھاری آواز کی میٹھی سرگوشیاں گونج رہی ہیں۔ میرے ہونٹوں پر ابھی تک تمھیں کہے گئے الفاظ کانپ رہے ہیں۔ میری آنکھیں اب بھی تمھیں پیارا سا معصوم چہرہ جھکائے دیکھ رہی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں ابھی تک تمھارے نرم و نازک ہاتھ کا خوشگوار لمس موجود ہے لیکن تم میرے پاس نہیں ہو۔ تم اس وقت رات کا کھانا کھا کر اپنی چارپائی پر لیٹی ستاروں کو تک رہی ہو گی۔ یا گہری نیند میں کھو گئی ہو گی۔ تمھیں کیا خبر کہ تم سے محبّت کرنے والا تمھارے پیار کی شمع جلائے اس پر پروانے کی طرح بار بار فدا ہو رہا ہے۔

ایک عرصہ دراز کے بعد خدا نے میری دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ تم آئیں۔ مجھ سے ملیں۔ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیں اور پھر تم چلی گئیں۔ لیکن میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ تم میرے سکوٹر پر بیٹھی ہو اور ہم ارجن ٹینا ہوٹل کی طرف

جا رہے ہیں۔ میں نے اس خوبصورت ملاقات سے پہلے بھی تصوّر ہی تصوّر میں تم سے گھنٹوں باتیں کی ہیں۔ آج جب تم آئیں تو میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ سارا وقت میں ہی تم سے باتیں کرتا رہا تھا اور تم سنتی رہی تھیں۔ پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔ دل جتنا تشنہ تھا ابھی تک ویسے ہی تشنہ ہے۔ دماغ خوبصورت ان کہی باتوں سے اسی طرح بھرا ہوا ہے۔ شیریں تم کبھی اُس بچے کی حالت کا اندازہ لگا سکتی ہو جس کے دل میں چاند کو پکڑنے کی آرزو مچل رہی ہو اور پھر اچانک چاند اُس کے ہاتھ میں آجائے۔ شیریں! بالکل اُسی بچے کی سی میری حالت تھی۔ میں بھی ایک مدّت سے ایک حسین شہکار کا متلاشی تھا اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں گھوم رہا تھا۔ جگہ جگہ۔ گلی گلی۔ شہر بہ شہر — گمنام ملکوں کی بندرگاہوں پر۔ عرب کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں لندن کے بارونق بازاروں میں، پیرس کے پُرشور حسن و نغمہ سے اُبلتے ہوئے مے خانوں میں مجھے اُس حسین مجسمے کی تلاش رہی تصنّع اور بناوٹ سے بھرپور چہرے ہر قدم پر ملتے رہے لیکن جس حسین تمثیل کے لیے میں سرگردان تھا وہ مجھے کہیں نہ مل سکا۔ تھک ہار کر میں واپس آگیا اور اُس دن کا خاموشی سے انتظار کرنے لگا جس دن قدرت کو میری آرزو پوری کرنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرا شہکار ایک نہ ایک دن مجھے ضرور مل کر رہے گا۔ آخر وہ دن بھی

آگیا جب کہ میں نے تمھیں اپنے شہکار اور اپنے آیئڈیل کو پہلی بار قریشی صاحب کے دفتر میں شگفتہ کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ مجھے گویا ایک گمشدہ خزانہ مل گیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن تم مجھ سے دور تھیں۔ تم سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ میں نے کئی بار تمھیں دیکھا۔ کبھی دور سے کبھی قریب سے۔ مگر دل کی حسرت دل ہی میں رہی۔ دل کی بات زبان تک نہ لا سکا۔ اس کے باوجود میں نے اپنی آرزو کو مچلنے نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ قدرت اس معاملے میں بھی اپنے آپ ہی میری رہنمائی کرے گی۔ کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا ہو جائے گی۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ ایک روز تم میرے سامنے بیٹھی تھیں اور میں اپنے دل کی داستان تمھیں سرگوشیوں میں سنا رہا تھا۔ مگر میں نے اپنے دل کو مچلنے نہیں دیا۔ کیونکہ مجھے تمھاری عزت ملحوظ تھی۔ تم ہی ذرا سوچو شیریں! تم اتنی مدت کے بعد مجھے ملیں تو میں تم سے اس قدر باتیں نہ کہتا تو کیا کہتا؟ دل ڈرتا تھا کہ اگر آج بھی چپ رہے تو نہ جانے پھر تمھاری یہ آرزو کب پوری ہو۔ فوراً دل کی بات کہہ ڈالو۔ قدرت ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں دیا کرتی۔ میں نے تمھیں پہلا سوال یہ کیا کہ کیا تم صاف گوئی کو پسند کرتی ہو؟ تم نے کہا ہاں۔ اور میں نے تم پر بھروسہ کرتے ہوئے تم سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک عرصے سے میرے دل میں دفن تھا اور باہر نکلنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی کسی بھی

چیز کو تم سے چھپانا گناہِ عظیم سمجھا۔ جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے شیریں خدا شاہد ہے مجھے اس سے دور کا واسطہ نہیں۔ میں نے اپنے پیار کی بنیاد یں جذبات پر کھڑی نہیں کیں۔ بلکہ یہ عمارت میری محبت اور میرے خلوص کی اُس مضبوط چٹان پر اٹھائی گئی ہے جسے بلاخیز طوفان کے شوریدہ سر تھپیڑے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ جب تم مجھے نہیں ملی تھیں تم جب بھی میرے پاس ہی تھیں۔ تمہارا تخیل میرے پاس تھا۔ میں صرف اُس تخیل کی تصویر ہاتھ میں لیے تمہیں اتنے بڑے جہان میں کوچہ بہ کوچہ شہر بہ شہر، صحرا بہ صحرا اور جنگل جنگل تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اب جبکہ تم مجھے مل گئی ہو تو میں تمہیں اپنے سے کبھی بھی جدا کرنا گوارا نہیں کروں گا۔ کافر بتوں کو پوجتے ہیں اور اُن سے اپنے دل کی مرادیں حاصل کرتے ہیں۔ میں نے خدا کے بعد اُسی کے بنائے ہوئے حسنِ تخیل کو اپنایا ہے اور اُس کی عبادت کی ہے۔ شیریں! میں تمہارا پجاری ہوں۔ تم اپنے پجاری کو محبت اور عظمت کے اُس مقام تک پہنچا دو جہاں پہنچ کر فرشتے بھی اُس کی شخصیت پر رشک کرنے لگیں۔ میں زندگی بھر انتظار کروں گا کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں۔ اب میں خط کو ختم کرتا ہوں۔ میں چاہتا تو اپنے اس خط کو ایک کتاب کی شکل بھی دے سکتا تھا۔ بلکہ اتنا طویل خط لکھتا کہ تم ساری عمر اسے پڑھتی رہتیں۔ مگر تمہاری مجبوریاں پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب میں خط کو لکھنا بند کرتا ہوں۔ الفاظ

ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی کف آلود بپھری ہوئی موجیں بن کر اپنی سیپیوں میں مفہوم محبّت کے گہر ہائے ناسفتہ چھپائے بڑھتے چلے آرہے ۔لیکن میں قلم ہاتھ میں تھامے اس طوفانی سمندر میں تنہا کھڑا ہوں ۔ روشنی کے مینار کی طرح ——

صرف تمہارا ، شاہد"

اس خط کے مل جانے کی اطلاع شیریں نے مجھے فون پر دی ۔شیریں کے گھر پر فون نہیں لگا تھا ۔ اُسے فون کرنے کے لیے اپنی ایک سہیلی مسرّت کے ہاں جانا پڑتا تھا ۔ پھر بھی جب اُسے میرا خط ملا تو وہ اپنی سہیلی کے ہاں گئی اور وہاں سے اُس نے مجھے فون کیا ۔میں نے شیریں کی دھیمی اور محبّت بھری آواز پہچان لی ۔شیریں کی آواز اتنی دلکش اور میٹھی تھی کہ مجھے محسوس ہوتا جیسے کوئی چپکے سے میرے کانوں میں شہد ٹپکا رہا ہے ۔ میں اس آواز کو لاکھوں کروڑوں آوازوں میں بھی پہچان سکتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ قیامت کے روز جبکہ ہر طرف ایک بھیانک شور اور واویلا مچا ہوگا اور آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں کے پھٹنے اور زمین کے سینے میں گہرے شگاف پڑنے کی خوفناک آوازیں گونج رہی ہوں گی میں اپنی شیریں کی آواز کو فوراً پہچان لوں گا اور جہاں بھی وہ ہوگی پہاڑوں ، خندقوں ، آتش فشاں دہانوں اور دھرتی کے آگ اگلتے شگافوں کو عبور کرتا اُس تک پہنچ جاؤں گا ۔

شیریں نے شرماتے ہوئے فون پر خط کا شکریہ ادا کیا۔

"تم نے بڑا پیارا خط لکھا ہے شاہد۔"

"تم جیسے خط کہتی ہو وہ میرے دل کی وادیوں میں تمھاری محبّت کے جگمگاتے ہوئے سورج کی ایک ہلکی سی کرن ہے شیریں۔ اگر تم اس روشنی کو قریب سے دیکھو تو تمھاری آنکھیں خیرہ ہو جائیں شیریں۔ میں اگر ایسے دس ہزار خط بھی تمھیں لکھ دوں تو محبّت کا حق ادا نہ ہو گا۔ روشنی کی ایک کرن بھی ختم نہیں ہو گی۔"

"کاش! میں بھی تمھیں اتنا پیارا خط لکھ سکتی۔"

"تمھارے جوڑے سے نکل کر میری جھولی میں گرا ہوا ایک باسی پھول بھی میرے لیے فردوس گم گشتہ سے کم نہیں شیریں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیریں کے خط محبّت کے جوش میں اُبلتے ہوئے شفاف چشمے تھے۔ جن کی میٹھی لَے میں جنگل کی خوشبو دار ہوا محبت کی انوکھی داستانیں دہرا رہی تھی۔ وہ پیار کے لطیف سے لطیف تر جذبات کو بڑی خوبی سے ادا کر جاتی اور اس کا قلم بے زبان الفاظ کے ہونٹوں کو قوّتِ گویائی بخش دیتا۔ وہ قلم ہاتھ میں لے کر جب خط کے اُوپر "پیارے شاہد" لکھتی تو اس کی انگلیوں سے پھول جھڑنے شروع ہو جاتے اور کاغذ کسی مالی کا دامن بن جاتا جو رنگ برنگ پھولوں سے بھرا ہوا ہو۔ وہ جس قدر خود نازک، خوبصورت اور

دلکش تھی اُس کے خط اس سے بھی زیادہ نازک، خوبصورت اور دلکش ہوتے شیریں کے خط گویا ہماری محبت کی پرسکوں نیلی جھیل کی سطح پر کھلے ہوئے پاکیزہ خوشبودار سفید کنول تھے جو شبنم کے موتیوں کو اپنی پنکھڑیوں میں چھپائے چپ چاپ سو رہے تھے۔ میں آگے چل کر اس جھیل میں سے کچھ کنول لے کر ان صفحات پر رکھنے کی کوشش کروں گا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ ہم ایک دوسرے کو پیار بھرے خط لکھتے رہے دوسرے تیسرے فون پر بھی پیاری پیاری باتیں ہو جاتیں۔ محبت کے رنگین سفر کا آغاز تھا۔ آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ دونوں طرف جذبات کا ہیجان تھا۔ جوش تھا۔ امنگوں کا طوفان تھا۔

ہماری دوسری ملاقات شالامار باغ میں ہوئی۔ میں نے پلازا والے بس سٹاپ سے شیریں کو لیا۔ اُسے سکوٹر کے پیچھے بٹھلایا اور ہم شالامار آ گئے۔ اس روز آسمان ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شیریں نے برقعہ پہن رکھا تھا۔ اُس کا لباس بڑا سادہ مگر بڑا پُرکشش اور خوبصورت تھا۔ سفید شلوار، سیاہ سینڈل، وائل کی پھولدار قمیص اور سفید دوپٹہ۔ باغ میں آکر اُس نے برقعہ اتار دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے چل رہے تھے۔ آم کے جھنڈوں میں کوئل بول رہی تھی بارش کی دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی۔ فضا میں گیلی زمین، گھاس اور پھولوں کی خوشبوئیں گھُل مل رہی تھیں۔

شیریں کے ماتھے پر بالوں کی ایک سیاہ لٹ جھول رہی تھی۔ ہم ایک بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئے۔

شالامار باغ کے ہوٹل والا لڑکا ہمارے پاس آیا۔

"صاحب چائے لاؤں؟ ایک منٹ میں لے آؤں گا صاحب۔"

واقعی وہ ایک منٹ میں واپس آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹرے تھا۔ چائے، کیک اور پیسٹری سے لدا ہوا۔ ٹرے سفید رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ٹرے ہمارے پاس رکھ کر چلا گیا۔ میں نے چائے بنائی۔ ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ پہلی ملاقات کی طرح اس بار بھی شیریں نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں اور مجھ سے بات کرتے ہوئے شرما رہی تھی۔ لیکن ہم نے خط و کتابت اور ٹیلیفون کے ذریعہ ایک ہی مہینے میں کوئی دو سال کی مدت طے کر لی تھی۔ میں نے شیریں کا نازک ہاتھ تھام کر کہا۔

شیریں ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے۔" شیریں نے دھیمی آواز مگر پُر شوق لہجے میں کہا۔

"کہیں مجھے بھُول تو نہ جاؤ گی؟"

شیریں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ویسی کی ویسی پکڑی رہی اور وہ بارہ دری کے نیچے اُگی ہوئی ہری ہری گھاس کو غور سے تکنے لگی۔ میری بات کا جواب دو شیریں۔ کہیں مجھے بھول تو نہ

جاؤ گی ؟"

شیریں نے پیالی ٹرے میں رکھ دی اور میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ کر بولی "میں آپ کو کیسے بھلا سکتی ہوں۔ میں تو چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتی۔"

"مجھے زندگی کے کسی مرحلے میں چھوڑ نہیں دو گی ؟"

"کبھی نہیں شاہد۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"میرے پیار سے اُکتا تو نہیں جاؤ گی شیریں ؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں شاہد ـــــ کبھی کوئی پیار سے بھی اکتا یا ہے۔ اور پھر آپ کے پیار سے ؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

میرے لیے شیریں کے یہ پیار سے الفاظ صحیفۂ آسمانی سے کم نہیں تھے یہ تو گویا ستاروں کی زبان میں ادا کی گئی سرمدی لوری تھی۔ پتھر پر کھنچی ہوئی گہری لکیریں تھیں۔ زمین کی بنجر چھاتی پر بکھرے ہوئے خوشبودار پھولوں کے بیج تھے جو ہوا کے پہلے ہی جھونکے، بارش کے پہلے ہی چھینٹے میں دیکھتے دیکھتے زمین سے نازک ڈنٹھل بن کر پھوٹے اور پھر شگوفے اور پھر سنہری پنکھڑیوں والے پھول بن کر خوشبو اڑانے لگے، مسکرانے لگے۔ میں نے دعا کی ـــ اے میری محبت کے مسکراتے ہوئے لہلہاتے ہوئے پھولو! تم خزاں کی بے رنگ اور بے رحم ہواؤں میں بھی پھلو پھولو اور اسی طرح مسکراتے رہو! لیکن اس

اُس وقت میں بھول گیا تھا کہ خزاں ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ وہ جب اپنا زرد چہرہ اور ویران آنکھیں لیے وادی میں داخل ہوتی ہے تو بچھر میں اُگے ہوئے پھول بھی مُرجھا جاتے ہیں اور درخت کی ڈالی پر لگا ہوا آخری پتّا بھی ایک آہ بھر کر ٹوٹتا ہے اور زمین پہ گر پڑتا ہے۔

مگر ابھی بہار نے آنکھ ہی کھولی تھی۔ ابھی سنہری، گرم اور روشن سورج کی پہلی کرن ہی پہاڑوں کی چوٹی پر سے اُچھل کر وادی میں سونا بکھیرتی ہوئی آن گری تھی۔ ابھی شیریں سے میری دوسری ملاقات ہی تھی۔ ابھی میری نو دمیدہ محبّت نے خوشی کا دوسرا قہقہہ ہی لگایا تھا۔ ابھی تو نوشگفتہ پھولوں نے اپنی پنکھڑیاں سنہری دھوپ میں پہلی بار ہی کھولی تھیں۔ ابھی تو شیریں میرے سامنے بیٹھی تھی اور ہم شالامار باغ کی ایک بارہ دری میں بیٹھے تھے۔ جہاں کبھی مغل شہزادہ اپنی نورجہاں کے ساتھ بیٹھا کرتا ہوگا۔ یا انارکلی سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوگا۔ لیکن وہ محبت کی حقیقی لذّت سے محروم تھا۔ بادشاہ ہو کر بھی محبّت کے لطف سے محروم تھا۔ کیونکہ اُس نے کبھی پلازا سینما کے بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر اپنی نورجہاں کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اور اس کی نورجہاں کبھی گھر والوں سے چھپ کر اُس سے ملنے شالامار نہیں آئی تھی۔ اُن دونوں نے ایک بھی رات ایسی نہیں بسر کی تھی جس کی صبح کو انھیں اپنے اپنے گھر والوں سے چوری چوری ایک دوسرے سے

ملنا ہو۔ وہ تو جب چاہے ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ جہاں چاہے تخلیہ کروا سکتے تھے۔ جس مقام کو چاہے محبّت کے تنہا مقام میں تبدیل کروا سکتے تھے۔ ایسی محبّت کو ہم محبّت ضرور کہیں گے۔ لیکن یہ محبّت ایک ایسا پھول ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ ایسا درخت ہے جس کی چھاؤں نہ ہو۔ ایسی آنکھ ہے جس میں ایک بھی آنسو نہ ہو۔

اتنے میں چائے والا لڑکا آکر ٹرے اور سامان واپس لے گیا بوندا باندی رُک گئی اور بادل زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ ہوا مزید خنک اور نم دار ہو گئی تھی۔ مغربی جانب آم اور سرو کے درختوں میں کوئل کی درد بھری آواز اُسی طرح گونج رہی تھی۔ میں اور شیریں اٹھ کر سرو کے درختوں سے بھرے ہوئے قطعے میں ٹہلنے لگے۔ انار کے ایک پیڑ کی اوٹ میں آکر میں نے شیریں کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ شیریں کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس کا سانس گرم ہو گیا اور اُس نے محبّت میں چُور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"شیریں! تم نے مجھے اپنا بے پناہ پیار دیا ہے۔ کہیں یہ مجھ سے کسی روز چھین تو نہ لو گی؟"

شیریں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ میں بڑی ڈرپوک لڑکی ہوں۔ میں

ڈر ڈر کر قدم اٹھا رہی ہوں۔ پھونک پھونک کر چل رہی ہوں۔ سوچتی ہوں شاید زمانہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب دیکھ کر طوفان مچا دے۔ ہنگامہ کھڑا کر دے۔ شاید ہم ہزاروں میل ایک دوسرے سے دور جا پڑیں۔ پھر کیا ہوگا؟"

میں نے شیریں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"محبّت کرنے والوں کو دنیا کا کوئی طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔ شیریں! ہم ازل سے ابد تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔"

پھر میں نے شیریں کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا۔

"میری طرف دیکھو شیریں"

شیریں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں اور جھیل کی سطح پر کھلے ہوئے سفید کنول کے پھولوں کا رنگ سنہری ہونا شروع ہوگیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں شیریں کی آنکھوں میں نہیں بلکہ کسی پہاڑ کی گہری گھاٹی میں جھانک رہا ہوں جس کی تہہ میں آسمانی رنگ کے حیرت انگیز پھول کھل رہے ہیں۔ شیریں کے ہونٹ ذرا سے کھلے تھے۔ میں نے شیریں کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ یہ میری محبّت کا پہلا بوسہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے گلاب کے پودے پر کھلے ہوئے پھول پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ہوں۔ ان ہونٹوں میں شبنم کی نمی تھی۔ پنکھڑیوں کی ریشمی

نزاکت تھی اور گلاب کی دھیمی دھیمی گھری گھری خواب آور خوشبو تھی۔ شیریں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا دِل دھڑک رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے پاس آکر دھڑک رہا تھا۔ میں اُس کے دل کی دھڑکن کو اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہا تھا۔ شیریں کے ہونٹ خوشبو اڑا رہے تھے۔ انگور کے اُس گچھے کی طرح جو اپنی بیل پر لگا لگا پک گیا ہو اور جیسے پہلی بار نسیم صبح کے جھونکے آکر چھو رہے ہوں۔ اُس پھول کی طرح جس نے پہلی بار بہار کی چاندنی رات میں آنکھ کھولی ہو۔ شیریں کے ہونٹ کھلے تھے گویا سُرخ پکے ہوئے انار کا منہ کھل گیا تھا اور اُس کا میٹھا رس میرے حلق میں اُتر رہا تھا اور میں گہرے سمندروں میں اُتر رہا تھا، لاکھوں، کروڑوں پھولوں کی نرم نرم پنکھڑیوں کے ڈھیر میں اُتر رہا تھا۔ سنہری بادل مجھے اپنے تخت پر بٹھلائے اَن دیکھی وادیوں، سمندروں، آسمانوں اور زمینوں میں اڑائے لیے جا رہے تھے۔ گویا آسمان نے زمین کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے اور کائنات کی ہر شئے دوسری شئے سے بغل گیر ہو گئی تھی۔

جب میں نے اپنا چہرہ اُوپر اٹھایا تو شیریں کی آنکھیں اُسی طرح بند تھیں اور اُس کے ہونٹوں پر میری محبت کی سنہری مہر چاند بن کر جگمگا رہی تھی۔ میرے پیار کا شہر یاقوت بن کر اُس کے ہونٹوں سے ٹپک رہا تھا۔ سورج بن کر اس کے ہونٹوں کے پیچھے سے طلوع ہو رہا تھا۔ کہکشاں بن کر اس کے

چہرے پر یہاں سے وہاں تک بچھ گیا تھا۔ شیریں کے ہونٹ کانپ رہے تھے
نرم گھاس کی اُس شرمیلی پتّی کی طرح جیسے بیکراں سمندر کی طرف سے آنے والا
گرم ہوا کا جھونکا چھُو گیا ہو۔

"شیریں! شیریں! میری شیریں"

"شاہد.... میرے شاہد....."

مجھے یوں لگا جیسے کوئی سات سمندر پار سے مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے۔
جیسے دنیا کی سب سے بلند چوٹی پر سے کسی نے مجھے میرا نام لے کر پکارا ہے
جیسے کسی نے ساری کائنات کی لگام میرے ہاتھوں میں دے دی ہے۔
گہرے سمندروں کے سارے موتی نکال کر میرے قدموں میں ڈھیر کر دیئے
ہیں۔ میں نے شیریں کو لپٹا لیا۔ ساری کائنات کو لپٹا لیا۔

اب ایک بار پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ شیریں انار کے
پیڑ کا سہارا لے کر کھڑی تھی۔ میں اُس کے پاس ہی کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔
شیریں مجھے دیکھ رہی تھی۔ گہری اور پُراسرار نظروں سے اچانک اُس کی
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں کانپ اُٹھا۔ میں شیریں کو پہلی بار روتے ہوئے
دیکھ رہا تھا۔ میں نے شیریں کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا ہوا شیریں؟ یہ آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

"اپنی بے بسی پر رونا آ گیا ہے شاہد۔"

"بے بسی کیسی شیریں؟"

"سوچتی ہوں اگر میں تمہاری نہ ہو سکی تو زندگی تمہارے بغیر کیسے گذرے گی؟ یہ سفر اکیلے کیسے طے ہوگا۔ یہ طویل اور کٹھن راستہ تنہا کیسے کٹے گا؟"

مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میں نے شیریں کا ہاتھ چوم لیا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا شیریں! تم مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوگی۔ ہم ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہیں ہوں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہ کر سکے گی۔"

"ٹھیک ہے شاہد ــــ لیکن میں بڑی ڈرپوک لڑکی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہیں پیچھے نہ رہ جاؤں۔ تم سے زبردستی جُدا نہ کر دی جاؤں۔"

میں نے شیریں کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اپنے ہونٹوں سے چُوم لیے۔

"اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتی ہو تو بڑے سے بڑا طوفان بھی تمھیں ڈگمگا نہیں سکتا۔"

شیریں نے آہ بھر کر کہا۔

"محبت تو چھوٹا سا لفظ ہے شاہد۔ میں تو تمہاری پُوجا کرتی ہوں۔ عبادت کرتی ہوں۔"

"پھر تمھیں سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔"

"کبھی کبھی اپنے آپ سے ڈر آنے لگتا ہے شاہد۔"

"تم اپنا آپ میرے حوالے کر دو شیریں۔"

"وہ تو میں کر چکی ہوں شاہد۔"

"پھر ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اتنے میں بادل زور سے گرجا۔ قریب ہی سے کسی مالی کی آواز آئی۔ وہ کسی لڑکے کو آواز دے رہا تھا۔ ہم دونوں واپس چل پڑے۔ بادلوں کے سرمئی سایوں میں ہم شالامار کے سرسبز گھاس کے قطعوں کی پتھریلی روشوں پہ چلے جا رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے۔ محبّت کی۔ پیار کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ باہر آکر میں نے ہوٹل والے کو چائے کا بل ادا کیا۔ شیریں کو سکوٹر کے پیچھے بٹھایا اور ہم مال پر کیسینو میں آ گئے جہاں ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد میں شیریں کو پلازا والے بس سٹاپ پہ لے کر آ گیا۔ جہاں سے اُسے گارڈن ٹاؤن والی بس میں سوار ہونا تھا۔

۴

میں نے شیریں کو ایک خط لکھا جس میں دوسری ملاقات کے لطیف تاثرات کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ شیریں نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ محبّت کی سب سے بلند چوٹیوں پر گرنے والی پاکیزہ برف کی مانند تھا۔ میں نے اس کے جواب میں ایک اور خوبصورت خط لکھا۔ اور یہ سلسلہ چل نکلا۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ گویا پھولوں سے لدی ہوئی ایک زنجیر تھی جس نے ہمیں ایک دوسرے کو پیار کے ابدی اور مضبوط رشتے میں باندھ دیا۔ شیریں ہمیشہ ہلکے نیلے رنگ کے چھوٹے سائز کے پیڈ پر مجھے خط لکھتی۔ اس کی تحریر شگفتہ اور حروف کھلے کھلے اور متوازن ہوتے۔ عام لڑکیوں کی طرح اکھڑے اکھڑے اور اندر کو مڑے ہوئے نہیں ہوتے

تھے۔ اس کا ہینڈ رائیٹنگ بڑا خوبصورت اور صحت مند تھا۔ یہ ہینڈ رائٹنگ نفسیاتی نقطہ نظر سے ایک ذہنی طور پر تندرست اور مضبوط ارادے والی لڑکی کی دلالت کرتا تھا۔ اُس کے خطوط عطر میں بسے ہوتے۔ وہ خود گرمیوں میں خس کا عطر اور سردیوں میں حنا کا عطر استعمال کیا کرتی تھی۔ حنا کا عطر خاص مشرقی عورت کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ اگر آپ اس عطر کو آنکھیں بند کر کے سُونگھیں تو آپ کو اس میں شرمیلی دلہن کی چوڑیوں کی جھنکار، اس کے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور دھیمی دھیمی شرم و حیا میں ڈوبی ہوئی سرگوشیاں سنائی دیں گی۔

میں نے شیریں کو لکھا۔

"میری رانی شیریں!

تمھارے خط بڑے خوبصورت، سادہ اور بامعنی ہوتے ہیں۔ تمھاری طرزِ تحریر میں حقیقت کی جھلک اپنی بے پناہ خصوصیات کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اس طرح رواں نظر آتی ہے جیسے یہ سب کچھ میرے ہی خیالات کی ترجمانی ہے۔ تمھارے تصوّرات کا ذہنی کھیل جسے تم محض خیالی کھیل ہی سمجھتی ہو۔ درحقیقت اپنے اندر بہت کچھ جاذبیت رکھتا ہے۔ یہ تمھارے عہدِ وفا کی پختگی کی ایک زندہ مثال ہے اور تمھارے دلی جذبات کی ایک زندہ تصویر ہے جس کا ہر نقش میرے دل پر مسلّط اور کندہ ہے

شیریں! تم بہت سی خوبیوں کی مالکہ ہو۔ یہ تمہاری تعریف نہیں بلکہ یہ ہمارے اُس عہد و پیمان کی تعریف ہے جس کی بنیاد ہم نے نیک نیّتی اور پاکیزگی سے رکھی ہے اور جسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

تمہارے دل کے مدّو جزر کی قدر میرے دل میں ہے۔ جسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ شیریں! اگر دنیاوی مجبوریوں کے تحت تم زندگی بھر میرا ساتھ نہ بھی دے سکو تو بھی مجھے تم سے شکایت نہ ہو گی۔ شیریں! میں قسم کھاتا ہوں اُس مالکِ حقیقی کی کہ میں تب بھی تمہیں انہی نظروں اور اسی عزّت و احترام سے دیکھوں گا اور ملوں گا جتنا کہ اب۔ شیریں میں جھوٹ نہیں بولتا میرا خدا شاہد ہے کہ اگر تم کسی غیر کی قسمت سے وابستہ کر دی جاؤگی تو میں تمہیں کبھی طعنہ نہیں دوں گا۔ میں تم سے کبھی نفرت نہیں کروں گا بلکہ میں اُن حسین لمحات کی یاد میں اپنی باقی زندگی خوشی خوشی بسر کر دوں گا۔ جن لمحات کو تمہارا پیار ان دنوں رنگین بنا رہا ہے اور انھیں زندہ و لافانی کر رہا ہے۔ میں تمہاری ایک پل کی ملاقات کا بھی بدلہ نہیں چکا سکتا۔ اور مجھے پورا پورا احساس ہے کہ تمھیں میری وجہ سے گھر میں کس قدر تکلیف اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے معاف کر دینا شیریں! تمھیں بے بس پا کر میرا اپنا قرار چھن جاتا ہے اور دل بھر آتا ہے اور آنسو دل ہی دل میں پی جاتا ہوں اور بہت زیادہ مضبوطی سے تمہارے پیار کا دامن تھام کر تمہارے

سکونِ قلب کی خاطر دعائیں مانگتا ہوں۔ میں کبھی ایسا نہ کرتا لیکن کیا کروں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

میں تمھیں پیار کا سہارا دے کر کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا اور اپنے اس عہد پر جو قدم بھی آگے بڑھاؤں گا وہ ہرگز ہرگز پیچھے نہ ہٹاؤں گا۔ بلکہ اس پر مضبوطی سے گامزن ہو کر دنیا سے بے پروا و بے نیاز ہو کر تمھیں دیئے ہوئے سہارے کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچاؤں گا۔ چاہے مجھے اس میں جان تک کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ چاہے دنیا والے میری اس راہ میں حائل ہو کر مجھے بے سہارا و بے یار و مددگار ہی کیوں نہ بنا دیں یا تمھیں مجھ سے چھین کر جدا ہی کیوں نہ کر دیں۔ میں اپنے کندھوں پہ پیار کے سہارے کا بوجھ اٹھائے ہوئے اپنی ساری زندگی ختم کر دوں گا لیکن دنیا کے خوف یا سختیوں سے ڈر کر یا تنگ آ کر اس سہارے کو نہیں چھوڑوں گا۔

شیریں! تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ میں تمھاری عزّت پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ تمھارے خیالات کی پاکیزگی اور تمھارے کردار کی بلندی اُن سفید بادلوں کی طرح پاکیزہ ہے جو اُونچے اُونچے پہاڑوں سے آتے ہیں۔ تمھارے اخلاق پر کسی بھی تنقید کی گنجائش نہیں۔ شیریں! تمھیں بھی میرے خلوص پہ کبھی شک نہیں کرنا چاہیے۔ تم تو میری زندگی کا حسین اور سہانا خواب ہو۔ میں اس خواب کے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی دولت ٹھکرا سکتا ہوں۔ تم نے

مجھے خلوص اور محبت بخشی ہے۔ اس کے عوض اگر میں جان کی قربانی بھی دے دوں تو سودا مہنگا نہیں رہے گا۔ میرے متعلق تم بھی کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم ہر دُکھ سکھ میں میری ہم سفر رہو۔ ہم ایک دوسرے سے کبھی کوئی بات نہ چھپائیں۔ اپنے فیصلے ہم خود کیا کریں۔ ہماری اپنی زندگی ہو۔ زندگی کے بارے میں اپنے نظریے ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ روٹھیں۔ ہم کبھی کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ ہماری خوشیاں ایک ہوں۔ ہمارے رنج ایک ہوں۔ اور بس!

میں نے شیریں! تمھیں اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیا ہے۔ ایک ایک بات ظاہر کر دی ہے۔ اپنی تمام کمزوریاں تمھارے سامنے بے پردہ کر دی ہیں۔ اپنی زندگی کا ایک ایک کونہ عریاں کر دیا ہے تمھیں اپنی زندگی کے ایوان کی سا تھ لے کر شروع سے آخیر تک سیر کروائی ہے۔ میں دولتمند نہیں ہوں۔ فنکار ہوں۔ آرٹسٹ ہوں۔ مجسّم ایثار۔ مجسم محبّت اور مجسم خلوص ہوں۔ میرے پاس انھی چیزوں کا خزانہ ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمھیں کسی شدّت سے چاہتا ہوں۔ میں واقعی تمھیں والہانہ اور وحشیانہ پیار کرتا ہوں۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے اپنے پیار سے ڈر آنے لگتا ہے شیریں! کہ کہیں تم میرے اس شدید پیار سے اُکتا نہ جاؤ اور شیریں! اگر تم واقعی اس پیار کو پسند کرتی ہو تو یقین کرو کہ میں تمھیں اتنا پیار کروں گا، اتنا چاہوں گا کہ ہم ایک دوسرے

میں سما کر رہ جائیں گے۔ تمھیں میرے متعلق کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے تمھیں پہلے دن کہا تھا شیریں کہ میں تمھارے اعتماد کی پاسبانی میں اپنی جان بھی دے دوں گا۔ میں فن کار ہوں شیریں! اور فن کار کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ شاید تمھارا ساتھ زندگی کے آخری لمحوں تک دے گا۔ بشرطیکہ تم بھی ثابت قدم رہ کر میرے ساتھ رہو۔ اگر تم میرا ساتھ نہ دے سکیں تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کبھی تمھاری بے وفائی کا طعنہ نہ دوں گا۔ اور کبھی اُن راہوں پر سے نہیں گذروں گا۔ جہاں کبھی تم نے میرے ساتھ عہد و پیمان باندھے تھے۔ شیریں! میں نے تم سے محبّت کی ہے اور محبّت میں صرف میں نے قربان ہونا سیکھا ہے۔ دوسروں کو قربان کرنا نہیں سیکھا۔ اور صرف اسی لیے میں تمھیں ایک بات ——— صرف ایک بات کہتا ہوں شیریں کہ اگر تمھیں اپنی محبت پر بھروسہ ہے تو تم میری محبت پر اپنے سے بڑھ کر بھروسہ کر سکتی ہو اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر تم اپنی اور میری محبّت پر بھروسہ کرتے ہوئے آگ میں بھی کُود جاؤ گی تو وہ گل زار بن جائے گی۔ اس سے زیادہ میں تمھیں اور کیا اعتماد دلا سکتا ہوں۔

تمھاری تحریر کا ایک ایک لفظ شیریں میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہے اور اُس کا ہر نقش میرے سینے میں پیوست ہو چکا ہے۔ تم نے جس خوبصورتی سے اپنے احساسات کو اُجاگر کیا ہے وہ کسی تعریف کا محتاج

نہیں ۔شیریں! میں صدق دل سے تمہاری پرستش کرتا ہوں ۔ گھر میں ، دفتر میں ۔سینماؤں میں ۔ہوٹلوں میں ، چلتے پھرتے ، سوتے جاگتے ۔غرضیکہ زندگی کے ہر اُس ماحول میں جہاں سانس لیتا ہوں ۔یہاں تک کہ میں نے رات کی تنہائیوں میں تمھیں اٹھ اٹھ کر یاد کیا ہے اور تمھاری اور اپنی خیریت کے لیے دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھائے ہیں کہ خداوند کریم ہمیں دشمن کی نظروں سے محفوظ رکھے اور ہم پاکیزگی سے محبت کا دامن اس مضبوطی سے پکڑیں کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہ چھڑا سکے ۔ہم اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہ کر ہر اُس آنے والی کمزوریوں کو دبا دیں جو کبھی بھی نہ اُٹھ سکیں ۔ اور ہم بغیر کسی مزاحمت کے رفتہ رفتہ اپنی منزل کی جانب قدم اٹھاتے جائیں اور بڑھتے جائیں ۔ انشاء اللہ وہ دن دُور نہیں جب ہم ان کمزوریوں پر فتح پا لیں گے ۔ہمارے دامن بدنما داغوں سے پاک ہیں ۔خدا ہمارے ساتھ ہے ۔

شیریں! زندگی کے نشیب و فراز کو مستعدی اور سنجیدگی سے عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں ۔ بلکہ قدم رکھ کر پیچھے ہٹا لینا بدنامی اور ذلت کا باعث ہوتا ہے ۔ دل میں بدگمانیوں اور شکوک کا پیدا ہونا محض اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور حوادثِ زمانہ کا خوف ـــــ! لیکن ہمیں ان سے جنگ کرنا ہوگی اور آخر کار ہم ان پہ قابو پا کر فتح حاصل کر کے رہیں گے ۔

سمندر میں چھوٹے چھوٹے مدّوجزر کا آنا ایک بہت ہی معمولی بات ہے۔ یہ مدّوجزر سمندر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ سمندر تو بہت بڑے بڑے طوفانوں کا خوگر ہوتا ہے وہ ان معمولی زیروبم سے خائف نہیں ہو سکتا۔ ہمارے باہم سفر کے آغاز کی بنیاد پاکیزگی ہے۔ اس لیے ہماری شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اپنی منزل کی جانب ہمارا ہر قدم مضبوط، ہر عزم اور پائیدار ہونا لازمی ہے۔ دنیا والے دو ملے ہوئے دلوں کی کشادہ راہوں میں حائل ہو کر اپنی کمینگی خصلت کا اظہار کرتے ہی آئے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ پوری بہادری اور اعتماد سے ان کے حربوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں مزید ذوق وشوق سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہی جانا چاہیئے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے سامنے اور اونچا دیکھنا چاہیئے۔ ہم دونوں اس بلندی پر ہوں گے جہاں دنیا والوں کے ہاتھ تو کیا اُن کی گرد بھی نہ پہنچ سکے گی۔ ہم نے اپنی محبت کی بلند و بالا عمارت کا سنگِ بنیاد مٹی گارے پر نہیں رکھا۔ بلکہ اس کی بنیادیں چٹانیں اور پہاڑوں کے پتھر کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہیں۔ اس عمارت سے تو اگر سمندر بھی آن ٹکرائے تو اسے متزلزل نہیں کر سکتا۔ سمندر کے خوفناک تھپیڑے ناکام ہو کر واپس سمندر کی طرف چلے جائیں گے۔ ہمارا کوئی بھی پیچھا نہیں کر سکتا۔ ہمارا اپنا سایہ ہی ہمارا نگہبان ہے۔ یقین کرو شبیریں! میں اپنے میں اور تجھ میں کوئی تمیز نہیں رکھتا۔ تم کچھ

اندر پاکر ایک حیرت انگیز لذت محسوس کرتا ہوں - میں اس پاکیزہ نشے میں چوبیس گھنٹے مخمور رہتا ہوں - میں اپنے ہوش و حواس کو پوری طرح قابو میں رکھ کر اس آسمانی نشے سے لطف اندوز ہوتا ہوں - میں اسے ایک حسین خواب نہیں کہوں گا بلکہ ایک ٹھوس حقیقت کا نام دوں گا - اس میں تم میری برابر کی شریک ہو اور ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہو - میرے پاس ہوتی ہو - ایک پل کے لیے بھی مجھ سے جُدا نہیں ہوتی ہو - میرا ایمان ہے کہ تم ہی میرے دل کی دھڑکن ہو - تم ہی میری غمخوار ہو - تم ہی میری جان ہو - تم ہی میری روح اور زندگی ہو - اور تم میرے تخیل کے حسین خواب کے شہکار کی تعبیر ہو جیسے میں بہت پہلے اپنے دل کے جھروکوں میں جھانکا کرتا تھا اور ایک آہ سرد کھینچ کر اپنی کم حوصلگی کا تمسخر اڑایا کرتا تھا - لیکن آج اسے پُورا ہوتے دیکھ کر پھوُلا نہیں سماتا - قدرت نے میرے فن میں زندگی بخش کر اس قدر جلدی تمھیں دے کر میرے خواب کو پُورا کیا ہے اور آرزو کی تکمیل کی ہے اس کے عوض میں اگر قدرت کے حضور میں تمام جہازوں کے سر اُس کے قدموں میں ڈال دوں اور ہر وقت سربسجود رہوں تو بھی ایک پل کا احسان نہیں اُتار سکتا -

خدا کی قسم تم میرے جسم کا ایک لطیف جزو بن چکی ہو - میں ہر سانس میں تمھاری خوشبو پاتا ہوں - میں ہر آہٹ میں تمھارے قدموں کی چاپ

سنتا ہوں۔ میں تم سے ہمکلام ہو کر تمہارے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہوں۔ اور تمہیں بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ ہم ایک ایسے جھولے میں جھولتے ہیں جو نہ تو زمین پر اور نہ ہی آسمان پر ہے۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان معلّق ہے۔ یہ جھولا جادو کا جھولا نہیں۔ بلکہ زندہ اور مجسّم ہے اور اسی کی دھڑکن سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ زندہ ہے اور حرکت کرتا ہے اور جسے لوگ دل کہہ کر پکارتے ہیں۔ رات کی خاموشیوں میں یہ میرے جسم سے الگ ہو کر میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہے۔

میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں شیریں کہ تم میری ساری زندگی کی جستجو کی تکمیل ہو۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ہاں اگر تم مانو تو مجھے اپنے اعتماد کی بھیک دے دو۔ اور بس! وہی اعتماد جو میری نس نس میں سما چکا ہے۔ وہی اعتماد جس پر میں نے تمہیں حاصل کیا ہے۔ وہی اعتماد جو ہماری محبّت اور ایثار کی بنیاد ہے۔ جو میں تم پہ ہر لمحہ کر سکتا ہوں اور کرتا ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ میں تمہارے اعتماد پر کبھی آنچ نہ آنے دوں گا۔ تمہارے اس اعتماد کی امانت کو میں اپنی زندگی سے بھی زیادہ محبوب اور محفوظ رکھوں گا۔ خدا کے لیے مجھ پر اعتماد کرو بس اور مجھے اور زیادہ نہ چھوڑو کہ میں مایوس ہو کر اپنے آپ کو کمزور سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں۔ میں سچ کہتا ہوں شیریں کہ تمہارے اعتماد نہ کرنے سے میں ماضی کے خوفناک ماحول میں

یک دم کھو جاتا ہوں اور اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔ میں نے تم پر بھروسہ کر کے قارون کا خزانہ حاصل کیا ہے۔ لیکن کیا تم مجھ پر اعتماد کر کے میری خوشی نہیں خرید سکتیں ؟ کاش تم مجھ پر اعتماد کرنے لگو۔ میرے ان خیالات سے یہ مطلب نہ لینا کہ میں کوئی چیز تم پر زبردستی مسلّط کر رہا ہوں بلکہ میرے ان الفاظ کو سامنے رکھنا کہ میں تم سے اعتماد کی بھیک مانگ رہا ہوں اور اپنی خود اعتمادی کے ساتھ مجھے یہ ثابت کرنے کا موقع فراہم ہو جائے گا کہ سچّے دل سے پیار کرنا ایک بہت بڑا ایثار ہے جو کسی کے کہنے سننے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حسنِ اخلاق کے اس بلند مقام کو حاصل کر سکوں گا جسے شاید دنیا والے محض خیالِ خام ہی سمجھتے آئے ہیں اور آج تک کسی میں یہ ہمّت نہیں ہوئی جو اس راستے پر گامزن ہو کر ثابت قدم رہا ہو۔ میرا یہ شوق، میری یہ پرواز محض بناوٹی نہیں بلکہ میرے دل کی دھڑکن اس کی شاہد ہیں۔ میں تمھیں کبھی کسی حالت میں مجبور دیکھ کر کبھی طعنہ نہیں دوں گا۔ میں تمھارے اعتماد کا تمسخر نہیں اڑاؤں گا۔ مجھے موقع دینا تمھارا فرضِ فرضِ اولین ہے میں تمھاری اس امانت کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھوں گا۔ تم بھی کہو کہ ہاں میں تم پر اعتماد کرتی ہوں شاہد ـــ

تمھارے حسین خیالات جو تمھاری ہر تحریر میں موجود ہیں۔ یقین کرو کہ

میں ان خیالات میں گم ہو جاتا ہوں اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں جہاں سوائے تمھارے اور کوئی نہیں ہوتا اور پھر مجھے یہ دنیا مصنوعی اور عارضی معلوم ہونے لگتی ہے۔ بے شک تمھارے خیالات کی پروانہ قابلِ رشک ہے جسے میں صرف دل کے آئینے میں اُتار لیتا ہوں اور بس۔ اب میں خط لکھنا بند کرتا ہوں۔ صرف قلم روکتا ہوں۔ دماغ کو نہیں روک سکتا جو تم سے باتیں کیے جا رہا ہے۔ تمھاری یاد میں سوچے جا رہا ہے۔

صرف تمھارا شاہد"

اب میں یہاں شیریں کے تین خط نقل کر رہا ہوں۔ محبت کے گمشدہ باغ کی پھلواڑی میں سے تین خزاں نصیب شگوفے چن کر انھیں کاغذ کی خشک ہتھیلی پہ رکھتا ہوں۔ اگرچہ تحریر پھیکی پڑ گئی ہے۔ سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ لکھنے والی کا ذہن بدل گیا ہے۔ لیکن تحریر کا مفہوم نہیں بدلا۔ الفاظ کی پنکھڑیاں مرجھا گئی ہیں۔ مگر خوشبو ابھی تک ویسی کی ویسی ہے۔ یہ ہے پہلا باسی لیکن کھلے ہوئے سے زیادہ تر و تازہ شگوفہ!

"پیارے شاہد!

اس وقت رات کے تین بجے تھے جب کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں شاہد کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ سوچا تھوڑا سا شریف بن جانا چاہیے اور پڑھنے کے ارادے سے اٹھ بیٹھی۔ کیونکہ صبح ٹیسٹ تھا۔ پڑھنا کیا خاک

تھا۔ بار بار خواب کی باتیں آکر پریشان کرنے لگیں اور ذہن خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور میں ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکی۔ نیند کے جھونکے بار بار آرہے تھے۔ میں صحن میں آگئی۔ اِس خیال سے کہ شاید کچھ ہوش آجائے۔ میری نیند بہت بُری ہے شاید ـــ نہ آئے تو ساری رات نہیں آتی۔ لیکن جب آنکھ لگ جائے تو پھر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں کہاں ہوتی ہوں۔ کوئی ڈھول بھی پیٹے تو مجھ پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ اگر آنکھ کھل بھی جائے تو ہوش میں نہیں آتی۔ آنکھیں کھول ہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں۔ لیکن ہوش میں پھر بھی نہیں ہوتی۔ خواب پھر بھی دیکھتی رہتی ہوں۔ جاگتے میں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ تمھیں بھی یاد کرتی ہوں تو اکثر اسی حالت میں ہوتی ہوں۔

شاہد! آجکل کتنی پیاری راتیں ہیں۔ صحن میں آکر دیکھا۔ اُف ایسے لگ رہا تھا جیسے ہر طرف سونا ہی سونا بکھرا پڑا ہے۔ ٹھنڈی اور پیاری چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے چاندنی بہت پسند ہے۔ ایکدم چاند پر نظر پڑتے مجھے وہ بات یاد آئی۔ شاید میں نے تمھیں بتائی تھی کہ چاند جب چڑھے گا تو اس کی چاندنی کوئی اور۔ تم بتاؤ کون ہو سکتی ہے بھلا؟ چاند اپنے آپ کو تصوّر کریں اور جھوٹ نہ بولنا۔ سمجھے!

پھر مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی چشمے کے کنارے چاندنی رات میں بیٹھی ہوں۔ بڑی پاگل ہوں جو صحن کو چشمہ سمجھنے لگی۔ لیکن قصور سارا تمھارا

ہی ہے۔ تمہارا تصوّر ہی پاگل بناتا ہے مجھے۔ پہلے میں بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے ایسی باتیں کبھی نہیں سوچی تھیں۔ میرا معمول تھا۔ کالج گئے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہے اور رات کو گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ بس یہی کام تھا۔ میں پڑھا بھی زیادہ نہیں کرتی تھی۔ صرف اتنا جس سے پاس ہو سکوں۔ باقی فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ فرسٹ آنے والے دنیا میں بہت چھوڑ رکھے ہیں۔ ہم تو پاس ہی ہو جاتے تھے تو سمجھتے تھے کہ بڑا معرکہ سر کر لیا ہے۔

دیکھو تم کہتے ہو خط میں بڑی روانی ہوتی ہے۔ میں تو کچھ لکھتی لکھتی جانے بیچ میں کیا کیا کچھ نہیں لکھ جاتی۔ ساڑھے تین بجے رات میں ڈرائینگ روم میں گئی۔ الماری میں سے کتاب "پھول اور کانٹے" نکالی۔ ساتھ ہی تمہارا خط نکالا۔ پہلے خط پڑھا۔ پھر کتاب پڑھتی رہی۔ اس طرح پچھلے پہر سوا چار کا وقت ہو گیا۔ پھر تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔

لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں۔ ایک ہی خیال ہے۔ ایک ہی تصوّر ہے۔ باتیں چند ہیں۔ وہی ہماری اپنی باتیں۔ اُن کو کیا لکھوں۔ کئی بار تو لکھ چکی ہوں کہ میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ خاص کر اس وقت جبکہ میں تنہا ہوتی ہوں اور یہ سوچتی رہتی ہوں کہ کیا ہم اسی طرح دوست رہیں گے۔ اور پھر دعا مانگتی ہوں کہ خدا کرے ہم اسی طرح ہمیشہ ایک دوسرے کے بے غرض دوست رہیں۔ اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے بے غرض

ایثار کا خونِ ناحق نہ بہائیے۔ دل نہ دکھائیے۔ میں تو شاید تمہیں کبھی بھی نہ بھلا سکوں شاہد! کیونکہ میں بہت حسّاس ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی فراموش نہیں کیا۔ مجھے اپنی زندگی کے تلخ اور شیریں سارے لمحے پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ اور میں اُن کو کبھی نہیں بھول پاتی۔ بلکہ کبھی کبھی فرصت کے لمحات میں انہیں یاد کر کے اداس ہو جایا کرتی ہوں۔ جیسے ٹامس مور نے اپنی ایک طویل نظم میں لکھا ہے اور جس کا ہمارے ایک شاعر نے بڑی کامیابی سے ترجمہ کیا ہے۔

اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی دلچسپیاں گذرے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر میرے دلِ صد چاک پر

جب اُداس ہوتی ہوں تو خوشی کے لمحات کو یاد کرتی ہوں اور جب خوش ہوتی ہوں تو غمگین لمحوں کو یاد کر لیتی ہوں۔ کیونکہ یہ میرا تجربہ ہے کہ مجھے زیادہ خوشی راس نہیں آتی۔ اور میں خوشی کا چہرہ دیکھ کر ڈر جاتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے اس خوشی کے بدلے بہت سا غم سہنا پڑے۔

پیارے شاہد! لکھنے کو تو بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ ہر وقت سوچتی رہتی ہوں کہ اب کے خط میں یہ باتیں لکھوں گی۔ لیکن جب خط لکھنے بیٹھتی

ہوں تو سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ پھر وہ ساری باتیں کوشش کے ساتھ یاد کرتی ہوں۔ لیکن یاد نہیں آتیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ باتیں چونکہ بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ سوچتے ہوئے کہ کونسی بات لکھی جائے کچھ بھی نہیں لکھا جاتا۔ کالج کی باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اُن سے تمھیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میرے خط تم سے زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ تمھیں یہ کبھی بھی شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ میرے خط مختصر ہوتے ہیں۔ ویسے تو میں تمھیں پوری کتاب بھی لکھ دوں تو تم مطمئن نہیں ہو گے۔ اب میں حقیقت میں "پھول اور کانٹے" کی ہیروئن نہیں ہوں کہ اُس جیسے خط لکھ سکوں اور پھر میرا تو مطالعہ بھی اتنا وسیع نہیں کہ کچھ ادبی رنگ دے سکوں۔

اچھا اب اجازت دو۔ بہت ساری بے معنی باتیں لکھ چکی ہوں۔ تم اپنے مطلب کی کوئی بات نکال لینا۔ باتیں تو میں تمھارے ہی مطلب کی کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن کروں کیسے؟ اچھا خدا حافظ۔

تمھاری شیریں"

یہ ہے اس پھلواڑی کا دوسرا شگوفہ!

"میرے اپنے شاہد! اس وقت میں اپنے کمرے میں خاموش اور اُداس بیٹھی ہوں۔ سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ اور طبیعت پریشان سی ہے۔ سوچا تمھارے متعلق سوچنا شروع کر دوں۔ شاید کچھ سکون مل جائے

بہت دیر تک سوچتی رہی۔ نہ جانے کیا کیا بے ربط سی پاگلوں والی باتیں سوچتی رہتی ہوں۔ پہلے تو یہ سوچتی ہوں کہ ہم کس طرح ملے۔ کیا کیا باتیں ہوئیں تم کیا سوال کرتے رہے اور میں کیا جواب دیتی رہی۔ یہ سب کچھ جب سوچتی ہوں تو خبر نہیں کیوں یہ دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ہم ایک دوسرے کے پاس رہیں دونوں کہیں دور پہاڑ کی وادی میں چلے جائیں۔ جہاں کوئی نہ ہو۔ ہمارے آس پاس سبزہ ہو۔ پھول کھلے ہوئے ہوں اور ہم کسی اونچے پتھر پر بیٹھے ہوں۔ پاس ہی ایک پیارا سا چشمہ ہو۔ جس کے مدھر گیت کانوں میں رس گھول رہے ہوں۔ میں یہ گیت سن کر مدہوش سی ہو جاؤں۔ پاگل تو تمھارا پیار مجھے بنا ہی دیتا ہے۔ تھوڑی سی کسر جو رہ گئی ہے وہ چشمے کے گیت پوری کر دیں۔ پھر میں پاگل سی ہو کر تمھارے سینے پر اپنا سر رکھ دوں۔ تم میرے بالوں میں کنگھی کرتے رہو۔ بے ربط سی باتیں سناتے رہو۔ سوال کرو۔ تو میں بہکے بہکے الفاظ میں تمھیں جواب دیتی رہوں۔ جب ہوش آئے تو ہم اتنی باتیں کریں۔ اتنی باتیں کریں کہ ہمارے ہونٹ تھک جائیں۔ اپنی ہی باتیں دنیا کی نہیں ۔ دنیا جائے جہنم میں۔ ہمیں اس سے کیا؟ ہمیں تو اتنی فرصت ہی نہ ہو۔ ہم تو اپنے پیار ہی میں گم رہیں۔ دیوانوں کی طرح اپنی ہی لگن میں کھوئے رہیں۔ ویسے تو میں اب بھی کھوئی رہتی ہوں۔ اگر تمھیں حقیقت بتاؤں شاید تو تم مجھ پر ہنس دو اور ضرور کہو۔ کیسی پاگل لڑکی ہے۔

لیکن میں کیا کروں۔ تم ہی نے تو مجھے پاگل بنایا ہے۔ اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ کھڑی ہوتی ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے تم پیچھے کھڑے ہو اور ابھی مجھے پکڑ لوگے۔ سوتی ہوں تو خوابوں میں آجاتے ہو۔ کتاب پڑھنے لگتی ہوں تو آنکھیں کتاب پر ہوتی ہیں اور دماغ کہیں اور پہنچا ہوتا ہے۔ افسانے پڑھا کرتے تھے تو اُن میں اسی قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں تو اب اپنا افسانہ بننے کو تیار ہے۔ جس کا انجام معلوم نہیں کیا ہو۔

شاہد! جب انجام کا سوچتی ہوں تو جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ یہی خیال آتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو۔ کہیں میں مر تو نہیں جاوں گی اس غم سے کہ تم سے دُور کردی گئی ہوں؟ اب میرا دل دُور جانے کو نہیں کہتا شاہد۔ میں اپنے پیار میں کسی دوسرے کو بھی اپنے مقابل نہیں دیکھ سکتی۔ یہ سوچتی ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور پھر گھنٹوں روتی رہتی ہوں۔ کتنی بے نیازی سے میرے سامنے کہہ دیتے ہو کہ تمھاری تو شادی ہو جائے گی۔ تمھیں مجھ سے اچھا شوہر مل جائے گا۔ مجھے اتنا دکھ ہوتا ہے، کہ بیان نہیں کرسکتی۔ مجھے کسی شوہر کی ضرورت نہیں شاہد۔ میں تو ساری زندگی تمھاری یاد میں گذار سکتی ہوں۔ کاش دنیا مجھے اس کی اجازت دے دے۔

میرے خیالات کا مذاق مت اُڑانا شاہد۔ میں جذباتی لڑکی نہیں ہوں اور نہ ہی ہرجائی ہوں۔ میں تو ایک مستقل مزاج لڑکی ہوں۔ اگر دنیا اجازت

دے تو میں تمھیں اپنے وعدوں پر قائم رہ کر دکھادوں۔ صرف تم ہی نہیں
بلکہ دنیا مان جائے کہ ایک لڑکی نے وعدہ کیا اور اُسے نبھایا۔ لیکن میں
یہ جانتی ہوں کہ دنیا مجھے مجبور کر دے گی۔ زمانہ بہت ظالم ہے۔ کاش
یہ کسی کے دل کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتا۔ اس دل میں تو تم بھی
نہ جھانک سکے۔ تم بھی یہ نہ جان سکے کہ میرا دل کیا چاہتا ہے۔ صرف
تمھیں اور تمھیں چاہتا ہے شاید۔ اس میں صرف تمھارا ہی پیار ہے۔ یہ تم
سے ایک پل کے لیے بھی دُور نہیں رہنا چاہتا۔ ہر وقت تمھاری قربت
چاہتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے۔ ہر وقت تمھارے ہی پاس بیٹھی رہوں۔
تمھاری ہی باتیں سنتی رہوں۔ کتنی تسکین ملتی رہتی ہے مجھے تمھاری باتوں
میں! تمھارے سینے سے لگ کر تو میں دنیا جہان کو بھول جاتی ہوں۔ جب
تمھارے پاس ہوتی ہوں تو معلوم نہیں کونسی خیالی اور سنہری دنیا کی سیر
کرتی رہتی ہوں۔ تم میرے ساتھ ہوتے ہو۔ لیکن جب تم نہیں ہوتے اور
میں حقیقت میں قدم رکھتی ہوں تو تمھارا تصوّر میرا ساتھ دیتا ہے۔ خدا کا
لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے تمھارا تصوّر دے دیا۔ ایسا تصوّر جسے
کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس زندگی کو ایک سہارا تو مل گیا۔ شاید میں اسی سہارے
پر دنیا میں چند روز زندہ رہ سکوں۔ اگر میں مر گئی شاید تو تم مجھے بھول نہیں جانا۔
نہیں تو میری روح بہت بے چین رہا کرے گی اور تمھارے در پہ ہمیشہ

اپنے پیار کی بھیک مانگنے آیا کرے گی۔ کبھی کبھی خیرات ڈال دیا کرنا۔ پھر یہ خوشی سے واپس چلی جایا کرے گی۔ ویسے میں تمھیں زندگی میں خوش اور پُرمسرت دیکھ کر مسکرایا کروں گی۔

کبھی کبھی رات کے وقت جب تم اپنے پلنگ پر لیٹے ہوا کروگے تو میں آسمان سے آہستہ آہستہ زمین کی طرف آیا کروں گی۔ تم بڑے اطمینان سے لیٹے ہوئے ہوگے۔ تمھیں نیند آرہی ہوگی۔ اُس وقت آیا کروں گی، تاکہ تم زیادہ پریشان نہ ہوجایا کرو۔ پھر تم مجھے ایک نظر دیکھ لیا کروگے اور پُرسکون گہری نیند سو جایا کروگے۔ میں واپس چلی جایا کروں گی۔ لیکن کہیں ایسا نہ کرنا کہ تمھیں نیند آرہی ہو اور جب میں آؤں تو جھنجھلا کر مجھے بے وقوف لڑکی کہہ دو۔ تمھارا تو کچھ نہیں بگڑے گا شاید! لیکن میرا دل ٹوٹ جائے گی اور میری روح دوسری دنیا میں بھی بے چین رہے گی۔ دیکھا کیسی پاگلوں والی باتیں سوچتی رہتی ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ سوچ پر میرا اختیار نہیں۔ مجبور ہوکر مجھے ایسی باتیں سوچنی ہی پڑتی ہیں۔ نہ سوچوں تو اور کیا کروں میرے پاس ہی تو ایک موضوع ہے سوچنے کا۔ اپنی ہی زندگی کے متعلق۔ مجبور زندگی کے متعلق — اُکتا تو نہیں جاؤگے ان باتوں سے۔ لیکن خود ہی تو کہا کرتے ہو کہ شیریں! مجھے کیوں نہیں بتاتی باتیں؟ اس لیے تمھیں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہیے۔ اب میں تم ہی سے ایسی باتیں کیا کروں گی۔

اب اور کیا لکھوں۔ تمھارا خط تو بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ میرا تو ایسا ہی فضول سا۔ پاگلوں والا ہوتا ہے۔ مجھے تو خط لکھنا ہی نہیں آتا۔ اب بتاؤ اور کیا لکھوں۔ کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں۔ لیکن کہہ نہیں سکتی۔ گھر سے یہ عہد کر کے جاتی ہوں کہ خوب باتیں کروں گی مگر جب سامنے جاتی ہوں تو ہوش نہیں رہتا نہ معلوم وہ باتیں جو میں کرنا چاہتی ہوں کہاں اور کدھر چلی جاتی ہیں اور میں خاموش ہو کر بیٹھی رہتی ہوں۔

تم نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ تمھیں ابھی منزل نہیں ملی۔ تو وہ کونسی منزل ہے شاید جسے تم پانا چاہتے ہو؟ مجھے بتا دو نا۔ شاید کچھ مدد کرسکوں۔ مجھے تسلیاں دیتے ہو۔ خود تمھاری حالت کیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو میری حالت تم سے مختلف ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو تم مجھے پہچان نہیں سکے۔ کاش پہچان سکو۔ میرے چہرے سے میرے دل کی حالت جان سکو۔ شاید مجھے بھی پریشانیاں گھیر لیتی ہیں۔ میرے سامنے بھی وہ تمام لمحے رقص کرتے ہیں۔ میں بھی دیوانہ وار اُن کی طرف بڑھتی ہوں لیکن وہ نہ جانے کہاں چھُپ جاتے ہیں۔ پھر میں بھی اکیلی رہ جاتی ہوں۔ کیا ہم دونوں کی کوئی منزل نہیں شاید؟ تو پھر ہم کیوں ملے؟ خدا نے ہمارے دلوں میں یہ تڑپ کیوں پیدا کر دی؟ جبکہ راستے الگ الگ تھے۔ راستہ تو شاید ایک ہی ہے جس پر ہم گامزن ہیں۔ لیکن آگے جاکر شاید دو راستوں میں تبدیل ہو جائے اور ہم وہاں سے الگ

ہو کر اپنی اپنی منزل کو چلے جائیں۔ شاید پیچھے دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ شاہد! وعدہ کرو۔ جہاں سے ہماری منزلیں الگ ہوں گی ہم اُس مرکز کو یاد رکھیں گے۔ جہاں سے ہم جُدا ہوئے تھے اور مختلف منزلوں کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ ہم اُس سفر کو یاد رکھیں گے جو ہم نے اکھٹے طے کیا تھا اور اُن باتوں کو بھی یاد رکھیں گے جو ہم نے وقت کاٹنے کے لیے کی تھیں۔ تاکہ ہمارا سفر اچھی طرح گذر جائے۔ اور ان باتوں کے سہارے ہم اُن تکلیفوں کو برداشت کریں گے جو ہمیں زندگی کی کٹھن منزل میں ملیں گی۔

کیا ایسا ہو سکے گا شاہد؟ کیا تم مجھے یاد رکھ سکو گے؟ تمھیں تو شاید یقین نہیں آیا میرے پیار کا۔ میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں؟ حالانکہ میں تم کو سب کچھ بتا چکی ہوں۔ اپنا دل کھول کر سامنے رکھ چکی ہوں۔ شاید کوئی لڑکی اتنی جرأت نہ کر سکی ہو گی جتنی کہ تمھارے پیار میں کھو کر میں نے کر دی ہے۔ سب کچھ تمھارے حوالے کر دیا۔ اپنا پیار۔ اپنا دل۔ اپنی روح۔ ذہن سب کچھ اگر میں مجبور نہ ہوتی تو اپنا جسم بھی تمھارے قدموں میں ڈال دیتی شاہد —— لیکن مجھے اپنا نہیں۔ اپنے شریف ماں باپ کا خیال ہے۔ اُن کی عزت پیش نظر ہے۔ میری کوئی جان بھی لے لے تو پروا نہیں۔ یا جتنی چاہے تکلیفیں دے دے میں برداشت کر سکتی ہوں۔ لیکن اپنے ماں باپ کی عزت پر کوئی دھبہ نہیں لگانا چاہتی۔ میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ میں اُس دن

اپنا گلا خود گھونٹ لوں گی جس دن میری وجہ سے میرے ماں باپ کی عزّت پر کوئی حرف آئے شاہد! تمھیں اپنے کے لیے تو میں چٹانوں سے ٹکرا سکتی ہوں۔ میں نے بھی تمھیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ مجھے بھی تمھارے قرب کی شدّت سے خواہش ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ تمھارے سامنے بیٹھ کر تمھیں اس طرح پوجوں جس طرح پجارن اپنے دیوتا کو پوجتی ہے۔ میں تو اُس سے بھی سبقت لے جاؤں۔

اپنے دیوتا کے چرنوں کو ہی دنیا کی سلطنت سمجھوں اور اُس کے قدموں ہی سے چمٹی رہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں۔ دنیا میرے اور پجارن کے دیوتا میں فرق سمجھتی ہے۔ وہ تو سب کے سامنے پوجا کر سکتی ہے اور اُسے کوئی کچھ نہیں کہتا اور میں چھپ کر پوجا کرتی ہوں تو اندر سے میرا دل کانپتا ہے۔ یہ ڈر رہتا ہے کوئی دیکھ نہ لے۔ اور اگر کوئی دیکھتا نہیں تو میرا مذہب بیچ میں حائل ہو جاتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ سوائے شوہر کے کسی کی طرف بھی دیکھنا گناہ ہے کتنی بڑی شرطیں ہیں۔ کتنی کڑی شرطیں ہیں۔ ایک ناتواں اور جذباتی لڑکی کے لیے۔ جب تصوّر کرتی ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے میں لوہے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ کتنی مجبور زندگی ہے۔ شاید تم اُکتا گئے ہو۔ شعر سناؤں کوئی خاص مطلب تو نہ ہو گا سوائے اس کے کہ میری حالت کو ظاہر کر دیں۔

دل میں اک درد اُٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

کھُل گیا اک آہ سے بے تابیِ دل کا بھرم
جب دھواں اُٹھا تو انگارے نظر آنے لگے

اک تماشہ ہے اپنی حالت بھی
آنکھ نم ہے تو دل تپیدہ ہے

اب اجازت دو۔ بہت پریشان کر دیا ہے میں نے ــــ فقط
ہمیشہ تمھاری شیریںؔ

اب میں یہاں شیریںؔ کا تیسرا خط نقل کر رہا ہوں۔ تیسرا پھول پیش
کر رہا ہوں۔

"پیارے شاہد!
تم تو اس وقت بڑے آرام سے سو رہے ہو گے۔ مگر دیکھو میں کیسی پاگل لڑکی ہوں۔ صرف اِس لیے جاگتی رہی کہ آج موقع ہے تمھیں خط لکھوں گی۔ اگر سو گئی تو ہو سکتا ہے ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے۔ یہی سوچ کر سوئی نہیں۔ اب لکھ رہی ہوں۔ آدھی رات کو ــــ اپنے پاگل پن پر خود ہنسی آ رہی ہے

مگر...... تم مت ہنسنا۔

تم سناؤ کیسی گذر رہی ہے؟ ہم تو دور سے بھی تمھیں نہ دیکھ سکے۔ اتنے عرصے میں تمھیں دیکھنے اور تم سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ کیا تمھارا دل بھی ملنے کو نہیں چاہتا تھا؟ سچ بتاؤ۔ کہیں تمھیں مجھ سے پیار کم تو نہیں ہوگیا؟ جب کوشش کرتی ہوں۔ اِتنی دُور پیدل جاتی ہوں۔ صرف اِس خیال کے ساتھ کہ تم راستے میں مل جاؤ گے اور میں تمھیں دُور ہی سے دیکھ کر خوش ہولوں گی۔ اتنی دُور اسی خوشی کا احساس لے جاتا ہے۔ مگر جب تم نہیں ملتے تو اس قدر دُکھ ہوتا ہے کہ بیان نہیں کرسکتی باقی راستہ روتے ہوئے طے کرتی ہوں

خط لکھنے بیٹھی تھی تو بہت سی باتیں یاد تھیں۔ مگر اب تو کچھ بھی یاد نہیں آرہا۔ شاید کوئی بات اس لیے نہیں سُوجھ رہی کہ رات بہت خاموش ہے۔ اُف کس قدر خاموشی ہے۔ شاید تم اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس خاموشی میں جب کوئی آواز پیدا ہوتی ہے تو ڈر کے مارے بدن کانپنے لگتا ہے۔ خود میرے دل کی دھڑکن مجھے ڈرانے لگتی ہے۔ خاموش رات میں دل کی دھڑکن کی آواز بھی کس قدر تیز ہوجاتی ہے۔ صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس وقت مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے۔ کاش تم میرے پاس ہوتے اور میں تمھارے ساتھ لگ جاتی۔ تمھارے سینے میں منہ چھپا دینے سے کس قدر

سکون ملتا ہے۔ اتنا سکون شاید دنیا پر حکمرانی کر کے بھی نہ مل سکے۔ مگر اس وقت تم بھی میرے پاس نہیں ہو۔ جب مجھے تمھاری ضرورت ہوتی ہے۔ جب میں تمھارے لیے بے چین ہوتی ہوں۔ دل تڑپنے لگتا ہے۔ کاش ایسے وقت تم آجایا کرو۔

اب تم کہو گے۔ میرا تصوّر تمھارے پاس نہیں ہوتا؟ ہوتا تو ضرور ہے مگر تصوّر آخر تصوّر ہے۔ کب تک یہ طلسم مجھے بہلاتا رہے گا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تمھیں ملے ہوئے۔ ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ صدیوں سے ایک دوسرے کے واقف ہیں۔ نہ جانے کب تک تمھارا تصوّر میرا جی بہلاتا رہے گا۔ بجائے سکون کے میری طبیعت زیادہ بے چین ہو جاتی ہے۔ جب کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو میرے دل میں بُرے بُرے خیالات آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آخر میں خیال آتا ہے کہ کیوں نہ خودکشی کر لوں۔ ایسی زندگی سے موت ہزار درجے بہتر ہے۔ اُن لوگوں کے لیے موت ایک نعمت ہے جن کو دنیا سکون نہیں دے سکی۔ جن کے لیے اتنی وسیع دنیا ایک محدود سی شئے بن کر رہ گئی ہے۔ ایسے لوگ موت کی وسعتوں کو تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر یہ چیز بھی تو اپنے اختیار سے باہر ہے۔ مذہب اور سماج یہاں بھی حائل ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی باتیں

شاید مرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیتی ہوں گی۔ اگر کوئی لڑکی خودکشی کر لے تو لوگ یہی کہیں گے۔ نہ جانے کیوں مر گئی۔ ماں باپ نے تنگ کیا ہوگا۔ یا شاید کیا وجہ ہو؟

لڑکی کی زندگی کس قدر مجبوری کی زندگی ہے۔ سب سے بڑا گناہ وہ یہی کرتی ہے کہ وہ ایک لڑکی کی حیثیت سے پیدا ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لڑکی ہوں۔ میرا بھی یہی گناہ ہے۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک شخص کو پسند کرتی ہوں۔ اور اب یہ حالت ہے کہ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ تم بھی کہو گے۔ یہ کیا فلسفہ لے بیٹھی۔ مگر میں تو پہلے ہی لکھ چکی ہوں کہ خط طویل ہوگا۔ اور چاہے اس کی طوالت بے معنی باتوں پر ہی محمول کیوں نہ ہو۔ اچھا اب کوئی دوسری بات کرتی ہوں۔

ایک ماہ کا عرصہ ہو گیا ہمیں ملے ہوئے۔ مگر یوں لگتا ہے۔ جیسے ایک سال گذر گیا ہے۔ کئی موسم گذر گئے ہیں۔ سرما آیا۔ گرمیاں گئیں۔ بہار آئی خزاں آئی۔ اور خزاں کا موسم بھی گذر گیا۔ یہ دن بہت اُداسی سے گذر رہے ہیں۔ گھر کی چار دیواری کے اندر بند۔ گرمی بہت زیادہ ہے اور امتحان سر پر ہیں۔ خدا پاس کرے۔ دُعا کرنا۔ تمھارے ریڈیو کے پروگرام سُنے۔ بہت اچھے تھے۔ مگر میں زیادہ تعریف نہیں کروں گی۔ موڈ نہیں۔ کیونکہ آج تم مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔ . . . . اور جب تم

شدّت سے یاد آنے ہو اور میں تمھیں دیکھ نہیں سکتی تو غصہ بھی آنے لگتا ہے کہ کس نواب سے پالا پڑ گیا۔ دنیا ہی بدل گئی۔ اس وقت بھی یہی حالت ہے۔ تم بُرا مت ماننا۔

خط زیادہ طویل نہیں ہو سکا۔ حالانکہ دل چاہتا تھا کہ یہ خط اتنا طویل ہو جائے کہ تم پڑھتے پڑھتے اکتا جاؤ۔ کم از کم اتنا عرصہ تو یاد کرو گے مگر کمرے میں بہت گرمی ہے اور صبح میں نے بہت زیادہ پڑھا تھا۔ آنکھیں بھی جلنے لگی ہیں اب تو ۔۔۔ صحن میں تو ہوا ہو گی۔ رات کو یہاں موسم بڑا خوبصورت ہو جاتا ہے۔ مگر میں باہر بیٹھ کر تمھیں خط نہیں لکھ سکتی۔ اس لیے یہاں بند کمرے کی گرمی میں بیٹھنا پڑا۔ تمھارے لیے سب کچھ برداشت کر لیتی ہوں۔ حالانکہ گرمی تھوڑی دیر کی بھی بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ مگر تمھارا خیال جب ساتھ ہو تو معلوم نہیں کیسے میں ٹھیک رہتی ہوں۔ اب تم مغرور مت ہو جانا۔

میں تمھیں بہت سی باتیں لکھنا چاہتی تھی مگر جانے کیا وجہ ہے۔ لکھ نہیں سکی۔ تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک فقرہ کہیں کا ہے تو دوسرا فقرہ کہیں کا۔ خط ملے تو شدّت سے یاد کرنا ۔۔۔ بہت شدّت سے! اتنی شدّت سے کہ میں تڑپ اٹھوں۔ اور پھر تمھارا تصوّر اتنا سکون دے کہ میں پندرہ بیس گھنٹے پلنگ پر لیٹی سوئی رہوں۔ گہری نیند سو سکوں دبیسی

نیند ۔ جیسی نیند میں تم سے ملنے سے پہلے کیا کرتی تھی۔ اور جو تمھیں دیکھنے سے آنکھوں میں اُسی وقت لہرانا شروع کر دیتی ہے۔ کتنی پیاری خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے اُس وقت ۔ مگر میں تمھیں بتاؤں گی نہیں۔ تم خود سوچو۔ تمھاری اپنی رانی"

میں نے شیریں کو ایک بار رانی لکھا تھا۔ اُسے میرا یہ القاب بیحد پسند آیا۔ چنانچہ اب وہ اکثر خطوط میں اپنے نام کی جگہ رانی لکھنے لگی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ میں آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ لندن بی بی سی کے اُردو ڈراموں میں بھی حصّہ لیتا رہا ہوں۔ چنانچہ شوق پورا کرنے کے لیے لاہور ریڈیو سٹیشن سے بھی اکثر پروگراموں میں حصّہ لیا کرتا۔ ایک بار ریڈیو پر سے ایک ڈرامہ ہوا جس میں میں ہیرو تھا اور ہیروئن کا نام اتفاق سے شیریں تھا۔ میں نے شیریں کو لکھا کہ وہ ڈرامہ ضرور سُنے۔ اُس روز میں نے اپنی شیریں کو ذہن میں رکھ کر اس قدر جذبات انگیز کردار ادا کیا کہ ریڈیو والے حیران رہ گئے۔ لوگوں نے تعریف کے بے شمار خطوط لکھے۔ لیکن میں نے تو صرف اپنی شیریں کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ شیریں نے لکھا۔

"شاہد پیارے!

تمھارا ڈرامہ سنا۔ بہت ہی اچھا تھا۔ سب نے تمھاری بہت تعریف

کی جس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ بہت پیاری آواز تھی تمھاری۔ جذبات سے بھرپور ۔۔۔ ذہن میں مجھے رکھا تھا ناں؟ جب ہی تو تمھاری آواز میں سے محبت کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ شاہد! اگر تمھاری زندگی میں واقعی کوئی ایسی شیریں آگئی جس نے تمھاری زندگی کو شیریں بنا دیا تو کیا تم اُس شیرینی میں کھو کر اُس ہستی کو بھُلا دو گے جس کی زندگی میں محض تمھاری وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تلخی پیدا ہوگئی؟ اگر اس مدہوشی میں کھو کر یاد نہ رکھ سکو تو مجھے یہ کبھی نہ کہنا کہ میں تمھیں یاد نہ رکھ سکا۔

تم سچ بولنے کے عادی ہو۔ مگر اُس وقت میری خاطر یہ جھوٹ ضرور بول دینا۔ اور کہنا کہ ہاں شیریں؟ تم مجھے ویسے ہی یاد ہو۔ میں تم سے اب بھی ویسے ہی محبت کرتا ہوں اور ساری زندگی تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ میں جس غلط فہمی میں مبتلا ہوں ساری عمر اُسی میں مبتلا رہنا چاہتی ہوں۔ آج بقول تمھارے بیشک یہ ایک حقیقت ہے کہ تم مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔ لیکن جانے مجھے کبھی کبھی کیوں ایسے محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے ایک وقت آئے گا جب تم مجھے بھُلا دو گے۔ تم کہتے ہو میری طرف سے تمھیں اطمینان ہونا چاہیے۔ پریشان نہ رہا کرو۔ مگر باوجود اس اطمینان کے میں پریشان رہتی ہوں۔ خدا میری حالت پر رحم کرے۔ اب اور کیا لکھوں!

لکھنے والی بات تو صرف یہ تھی کہ میں نے تمہارا ڈرامہ سُنا اور بے حد خوش ہوئی اور فخر سے سر اونچا ہو گیا میرا۔ اب اجازت!

تمہاری اپنی
رانی "

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

۵

شاید وہ ساون کی آخری جھڑیاں تھیں۔

آسمان صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ برسات کا چل چلاؤ تھا۔ راتیں ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی۔ گہرے سرمئی بادلوں نے آسمان کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ شیریں کو ملے، اُس کا پیارا پیارا چہرہ دیکھے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ دو روز پہلے اُس نے فون پر کچھ دیر باتیں کی تھیں اور ہفتہ پہلے اس کا ایک خط بھی آیا تھا جس کا میں نے دوسرے ہی روز جواب لکھ دیا۔ موسم اس قدر خوبصورت اور رومانٹک ہو رہا تھا کہ دل بے اختیار شیریں کو یاد کرنے لگا۔ لیکن میں اُسے کسی طرح سے بھی بلا نہ سکتا تھا۔ نہ میں اُسے براہِ راست فون کر سکتا تھا اور نہ اُس کے گھر جا سکتا

تھا۔ بس یہی ایک امید تھی کہ جب اُسے کالج سے چھٹی ہو تو اُسے راستے میں جا ملوں۔ آج یہ امید بھی ٹمٹما رہی تھی کیونکہ میرا اسکوٹر ورکشاپ میں مرمت کے لیے پڑا تھا۔

سارا دن شیریں کی یاد میں سوگوار رہا۔ کوئی کام نہ ہو سکا۔ یونہی ایک ڈیزائن پر الٹی سیدھی پنسل کی لکیریں کھینچتا رہا۔ کوئی گیارہ بجے بارش شروع ہو گئی۔ اتنی زور کی بارش ہوئی کہ چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔ میں دفتر کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور شیریں کا تصور ذہن میں لے کر باہر دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور تیز بارش میں بھیگتے ہوئے درختوں کو دیکھتا رہا۔

بارش مدھم ہو گئی۔ پھر رُک گئی۔ ہوا بڑی خوشگوار اور خنک ہو گئی تھی۔ موسم کی دلفریبی نے ہر شخص پر تفریح کا موڈ طاری کر دیا تھا۔ دوپہر کو ہلکا سا لنچ کرنے کے بعد میں نے چائے پی اور آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور خیال ہی خیال میں شیریں سے باتیں شروع کر دیں۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ یا اللہ! یہ میری شیریں کا فون ہو۔ کہتے ہیں کسی وقت زبان سے جو بات نکل جاتی ہے وہ فوراً پوری ہو جاتی ہے۔ وہ گھڑی بھی ایسی ہی فیصلہ کن اور شبھ گھڑی تھی۔ میں نے ہیلو کہا اور اُدھر سے آواز آئی۔

"میں شیریں بول رہی ہوں شاہد!"

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ فرطِ مسرّت سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا

اور دل سینے میں کسی معصوم بچّے کی طرح مچلنے لگا۔

"شاہد! آج موسم کس قدر پیارا ہے۔ میں کالج سے چھٹی کر کے گھر جا رہی تھی کہ دل نہ مانا۔ وہ تمھیں ملے بغیر گھر نہیں جانا چاہتا۔ اس لیے تمھیں فون کر رہی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے آ کر مل جاؤ۔ میں پلازا والے بس سٹاپ پر انتظار کروں گی۔"

"میں ابھی پَر لگا کر تمھارے پاس پہنچ جاتا ہوں شیریں! تم بس سٹاپ کی طرف چل پڑو۔"

"مگر جلدی آنا شاہد! دل تمھارے بغیر بہت اُداس ہے۔"

"فکر نہ کرو میری جان! میں آ رہا ہوں۔"

کم بخت سکوٹر کو بھی اُسی روز خراب ہو کر ورکشاپ میں پڑنا تھا۔ مگر مجھے تو دنیا کی بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی شیریں سے ملنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ اگر سڑکیں ٹوٹ کر دریا بھی بن گئی ہوتیں تو میں اپنے جسم کو کشتی بنا کر نکلتا اور اپنی شیریں سے جا ملتا۔ جب انسان کسی سے محبت کر رہا ہو تو اُس کے اندر اتنی شدید قوّت، اتنا شدید جذبہ کہاں سے آ جاتا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بس میں سوار ہو کر یہ فاصلہ طے کروں۔ میں چھاؤنی کے علاقے میں تھا اور شیریں پلازا سینما کے قرب و جوار میں تھی۔ میں جلدی سے دفتر سے باہر نکلا اور بس سٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا اور

بس کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں پی آئی اے والوں کی خوبصورت بس سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اِس بس کا ایک ڈرائیور میرا واقف تھا۔ میں بے اختیاری طور پر سڑک کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جب بس ذرا قریب آئی تو میں نے ڈرائیور کو پہچان لیا۔ میں نے ہاتھ لہرایا۔ ڈرائیور نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور بس کھڑی کر لی۔ میں بھاگ کر بس میں سوار ہو گیا۔ بس شہر کی طرف چل پڑی۔

"شاہد بابو آج دفتر سے جلدی چھٹی کر لی۔ سکوٹر کہاں گیا آپ کا؟"

میں نے اُسے بتایا کہ سکوٹر خراب ہو گیا ہے اور مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں بہت جلدی شہر پہنچنا تھا۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے جب بس مزنگ چونگی کے پاس پہنچی تو ہلکی ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی۔ میں نے ڈرائیور کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور گنگا رام ہسپتال کے سامنے اُتر پڑا۔

بارش باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔ سڑک پر جا بجا پانی کھڑا تھا۔ میری خاکی پتلون کے پائنچے بھیگ گئے تھے اور قمیص بھی بھیگ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا پلازا سینما والے بس سٹاپ کی طرف چلا جا رہا تھا۔

میں نے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر سے بس سٹاپ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ شیریں سیاہ برقعے میں اپنا آپ لپیٹے بس سٹاپ کے درخت کے نیچے سمٹی سمٹائی کھڑی تھی۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر شیریں نے نقاب اُٹھا لیا

اُس کے ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں جو اس نے سینے کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔
میں نے مسرّت سے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے شیریں کو سلام کیا۔ اس کا چہرہ جو ایک لمحہ پہلے مرجھایا ہوا تھا مجھے سامنے دیکھ کر پھول کی طرح کِھل اُٹھا۔ اس کا سیاہ برقعہ درخت کی شاخوں پر سے ٹپکتے ہوئے بارش کے پانی سے بھیگ رہا تھا۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔

"شاہد! مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

میں نے درخت پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ تو بارش ہے شیریں! اگر شہر میں چاروں طرف آگ بھی لگی ہوتی تو میں یہاں آنے سے رُک نہیں سکتا تھا۔"

پھر میں اور شیریں بارش میں بھیگتے ہوئے لارنس روڈ کی طرف چل پڑے تانگے کا وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بارش باقاعدہ شروع ہو چکی تھی۔ شیریں کی شلوار کے پائنچے پانی میں تر بتر ہو رہے تھے۔ میں بھی بھیگ رہا تھا۔ شیریں کے خوبصورت پاؤں اور سینڈل پر جا بجا کیچڑ کے دھبّے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ بارش کی پھواروں میں نہا کر تر و تازہ ہو رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ فراخ پیشانی سے آکر لپٹ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے ساتھ فتح مندی اور مسرّت کے بھرپور احساس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی شہزادی اپنے من پسند شہزادے کو سوئمبر میں جیتنے کے بعد لیے

جارہی ہو۔ ہم بارش، کیچڑ، پانی اور دنیا والوں کی ہر قسم کی رکاوٹوں سے بے نیاز آپس میں ایک دوسرے سے پیار و محبت کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے لارنس باغ کی طرف چلے جارہے تھے۔ ہم باغِ جناح میں آگئے۔ بارش میں باغ کا منظر عجیب دلکشا اور دل فریب تھا۔ ہم جلدی جلدی چلتے باغ کے اوپن ایئر کیفے والے سبز کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ شیریں نے گیلا برقعہ اُتار کر کرسی پر پھیلا دیا۔ شیریں کی قمیص کہیں سے گیلی اور کہیں سے خشک تھی۔ جس طرح وادی کے اُوپر بادلوں کے ٹکڑے آجائیں تو نیچے کہیں بادلوں کے سائے ہوتے ہیں اور کہیں دھوپ چمک رہی ہوتی ہے شیریں کی سفید شلوار ٹخنوں کے اُوپر تک گیلی ہو رہی تھی اور سینڈل کیچڑ میں لت پت تھا۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا اور شیریں سے باتیں کرنے لگا۔

"آج تو خدا نے میرے دل کی دعا منظور کی ہے شیریں۔"

"وہ کیسے؟"

"میں صبح ہی سے تمھاری یاد میں سوگوار تھا۔ تمھیں یاد کر رہا تھا۔ دل تم سے ملنے کو بے تاب تھا کہ اچانک تمھارا فون آگیا اور معلوم ہُوا کہ

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی"

شیریں ہنس پڑی اور میں نے دیکھا کہ بارش میں بھیگے ہوئے چہرے پر اس کے دانت معمول سے زیادہ سفید اور خوبصورت لگ رہے تھے۔

میں شیریں سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اُس کے معصوم اور بھولے بھالے چہرے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ سورج مکھی کے پھول کی طرح جو سورج سے قوتِ نمو بھی حاصل کرتا ہے اور اپنا چہرہ بھی اُس کی طرف سے نہیں ہٹاتا۔ میں شیریں کے خوبصورت مکھڑے کو دیکھ بھی رہا تھا اور اس کی پُراسرار گہری آنکھوں اور گرم دہکتے ہوئے نازک رخساروں سے اپنی محبت کی پھلواڑی کی آبیاری بھی کر رہا تھا۔ میرا یقین تھا کہ بارش کا پانی جو شیریں کے گالوں پر سے ہو کر زمین پر گرے گا وہاں سوائے نرگس کے پھولوں کے اور کچھ پیدا نہ ہوگا۔

بارش کے کچھ کچھ قطرے ابھی تک شیریں کے دلکش چہرے پر چپک رہے تھے۔ جس طرح گیندے کے پھول پر صبح صبح شبنم کے موتی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دمکنے لگتے ہیں۔ بالوں کی دو تین لٹیں گیلی ہو کر اس کے چوڑے ماتھے پر آن گری تھیں۔ میں نے کئی بار انھیں اپنے ہاتھ سے پیچھے ہٹایا۔ شیریں نے ہر بار شرما کر نظریں جھکا لیں۔ کاش! ساری زندگی بارش ہوتی رہتی۔ میں ساری زندگی شیریں کے بالوں کی گیلی لٹیں اپنے ہاتھ سے پیچھے ہٹاتا رہتا اور شیریں ساری عمر میرے سامنے بیٹھی شرما کر نظریں بار بار نیچی کرتی رہتی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ جو بھی پیاری اور خوبصورت اور زندگی کو آگے بڑھانے والی بات ہوتی ہے وہ اِس دنیا میں بار بار کبھی نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک بار ہوتی ہے اور پھر ہمیشہ

کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ چنار کے آتش بار درخت کی چھاؤں میں گلابی پنکھڑیوں والا پھول صرف ایک بار کھلتا ہے اور پھر مرجھا جاتا ہے اور پھر کبھی نہ کھلنے کے لیے خاک میں مل جاتا ہے۔ انگور کی سوکھی ہوئی بیل پر سے جھڑ کر گرا ہوا خشک اور زرد پتّا چکرا کر زمین پہ آتا ہے۔ اور ہوا اُسے اُڑا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جانے کس دیس میں لے جاتی ہے کہ پھر وہ کبھی واپس انگور کی ٹہنی پہ نہیں آتا۔ سمندر کے سینے سے اچھل کر جو لہر ساحل کی چٹان کا منہ چُوم کر واپس جاتی ہے۔ پھر پلٹ کر نہیں آتی۔ ہزاروں لہریں اس کے بعد آتی ہیں۔ لیکن وہ ایک لہر پھر کبھی اپنی شکل نہیں دکھاتی۔ پھر کبھی اپنے شبنمی گیلے ہونٹوں سے اُس ہجر نصیب ویران چٹان کا منہ نہیں چومتی۔

شیریں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہیں اس کے سراپا کی بلائیں لے رہی تھیں۔ دنیا نے اپنا بہترین خزانہ میرے قدموں میں لاکر ڈھیر کر دیا تھا۔ وقت نے اپنا بیش قیمت اور سب سے زیادہ حسین لمحہ مجھے عطا کر دیا تھا۔ سمندر نے اپنے انمول ترین اور پوشیدہ ترین سیپ کا منہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ یہ ہیرے جواہرات کا ڈھیر شیریں کے جاتے ہی

مٹی کا تودہ بن جائے گا۔ وقت کا یہ قیمتی اور روشنیوں سے جگمگاتا ہوا لمحہ شیریں کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی کسی مرگھٹ سے اُٹھتا ہوا دھواں بن کر رہ جائے گا اور یہ سمندر کی تہوں سے نکل کر اپنے انمول موتیوں کو ساتھ لے کر میرے پاس آیا ہوا سیپ شیریں سے بچھڑنے کے بعد پتھر کا ایک بے رنگ اور بیکار ٹکڑا بن کر میرے ہاتھوں سے گر پڑے گا اور میں اُن ہاتھوں کو ملتا ہوا رہ جاؤں گا جن ہاتھوں سے میں نے اپنی شیریں کے گیلے بالوں کی خوشبودار لٹ سلجھائی تھی۔ پس اگر وقت کو گذرنا ہی ہے تو اس کا زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھا لینا چاہیے۔ پھول کو اگر کھِل کر مرجھانا ہی ہے تو اُسے چمکیلی دھوپ میں جی بھر کر دیکھ لینا چاہیے۔ اس کی ایک ایک پنکھڑی کو ہاتھ سے چھُو کر، ہونٹوں سے چُوم لینا چاہیے۔ اگر سمندر کی طرف سے آنے والی لہر پھر کبھی واپس نہیں آئے گی تو اُسے اپنے سینے میں جذب کر لینا چاہیے۔ اُس کا ایک قطرہ بھی سمندر کو واپس نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے شیریں کو گرم گرم چائے کی پیالی بنا کر دی۔ گرم چائے پی کر اُس کے چہرے پر خون کی سرخی جھلکنے لگی۔ اگرچہ بارش باہر رُک گئی تھی۔ لیکن خوشگوار ہوا کے ٹھنڈے جھونکے چل رہے تھے اور کیبن کی کھڑکی کا جالی دار پردہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ میں نے پردہ چُن دیا کیونکہ اُس وقت وہاں کوئی شخص تھا۔ بارش میں دُھل کر درختوں کی جھکی ہوئی ڈالیاں

جھول رہی تھیں۔ گراونڈ میں اُگی ہوئی لمبی پتلی گھاس کے خوشے لہرا رہے تھے۔ میں نے شیریں کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہا۔

"شیریں! میں تم سے پھر ایک بار پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہیں مجھے بُھلا تو نہیں دو گی؟"

شیریں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں شاہد۔ بھلا میں آپ کو کیسے بُھلا سکتی ہوں۔ اب تو آپ میری زندگی میں اتنے قریب آ چکے ہیں کہ اگر میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتی۔"

میں نے پائپ سلگا کر بڑی افسردگی سے کہا۔

"میں کبھی کبھی ڈرنے لگتا ہوں شیریں کہ کہیں تم میرے پیار سے اُکتا نہ جاؤ۔ کہیں تمھارا دل میری محبّت سے بھر نہ جائے۔"

شیریں نے میری طرف بڑی محبّت سے دیکھ کر کہا۔

"کبھی پیار سے بھی کسی کا دل بھرا ہے۔ اور پھر میرا دل آپ کے پیار سے کیسے بھر سکتا ہے۔ میں تو آپ کے پیار کے سہارے پر ہی تو زندہ ہوں۔ کبھی کوئی زندہ انسان ہوا سے گھبرایا ہے جو کہ اُس کی زندگی کا بنیادی جزو ہے۔ کبھی پانی میں رہنے والی مچھلی کا دل پانی سے بھرا ہے؟ کبھی نہیں۔ اور کبھی سورج کی کرن اپنے سورج سے

بیزار ہوتی ہے۔ شاہد! تم میری زندگی کی بنیاد ہو۔ میری روح تمہارے جسم سے غذا حاصل کرتی ہے۔ میں تمہارے پیار سے کیسے اُکتا سکتی ہوں خدا کے لیے تم ایسی باتیں آئندہ سے کبھی نہ کیا کرو۔"

میں خاموش ہو گیا۔ میرا دل خوشی کے بے پایاں جذبے سے معمور ہو گیا تھا۔ جس شخص کو شیریں جیسی لڑکی کا بھرپور پیار نصیب ہو اُسے اور کیا چاہیے۔ اس کی تو راتیں دن سے بھی زیادہ روشن ہوں گی۔ بھلا اس کے دنوں کی روشنی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں شیریں کی محبّت میں شرابور ہو چکا تھا۔ میرے لیے اس کے بغیر زندگی کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں اُس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔ وہ میری نس نس میں سما چکی تھی۔ خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی تھی اور سایہ بن کر میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور میری زندگی کی حفاظت کر رہی تھی۔ وہ میرے دل میں دھڑکن بن کر سما چکی تھی اور سانس بن کر میرے ساتھ ساتھ سانس لے رہی تھی۔ جب وہ میرے سامنے، میرے پاس، میرے بالکل قریب بیٹھی ہوتی تو مجھے یقین نہیں آیا کرتا تھا کہ کبھی سورج بھی آسمان کی بےکراں بلندیوں سے اُتر کر میرے پاس لارنس باغ کے کیبن میں آسکتا ہے۔ پھر میں اُسے ہاتھ سے چھوتا۔ اُسے اپنے سینے سے چمٹا لیتا۔ اُس کے دھڑکتے ہوئے نازک اور گرم بدن کی طلسمی

حرارت کو اپنے جسم کے ساتھ محسوس کرتا۔ اس کے خوشبودار گرم گرم سانسوں کو اپنے سانسوں میں گُم ہوتے محسوس کرتا۔ اس کے کپڑوں سے اٹھتی ہوئی خَس کے عطر کی خوشبو کو اپنی روح کے ذرّوں میں حلول ہوتے محسوس کرتا۔ پھر اس کے ملائم رخساروں پہ ہاتھ کی انگلیاں پھیرتا۔ اس کے نیم وا، ادھ کھلے شبنمی ہونٹوں کو چومتا اور اُس بے پایاں کیف، اُس آسمانی اور ناقابلِ بیان لذّت کی کوئی واضح تصویر ذہن میں بنانے کی کوشش کرتا۔ لیکن ہر بار ناکام ہوتا۔ میرے پاس وہ رنگ ہی نہیں تھے جن کی مدد سے اُس لذّت اور سرور کی تصویر کشی کی جاسکتی تھی۔

پھر جب شیریں مجھ سے جُدا ہو جاتی اور میں کسی سڑک پر اکیلا رہ جاتا تو مجھے اپنے آپ پہ اُس پھُول کا گمان ہوتا جسے کسی نے باغ میں سے توڑ کر سڑک پر پھینک دیا ہو۔ یا اُس بدنصیب ستارے کا گمان ہوتا جو آسمان کی رفعتوں سے ٹوٹ کر فٹ پاتھ پر آن گِرا ہو۔ پورا دن میں شیریں کے ساتھ گذارے ہوئے لمحوں کی بھرپور یاد میں مگن رہتا۔ خیال ہی خیال میں اپنے آپ مسکرا دیتا۔ کچھ یاد کر کے آنکھیں بند کر لیتا۔ لیکن دو ایک روز کے بعد پھر آگ تیز ہو جاتی اور دل شیریں سے ملنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ——— سکوٹر پہ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر کو جاتے ہوئے مجھے شیریں کے منہ سے نکلے ہوئے پیار بھرے

جملے سنائی دیتے۔ اُس کی آواز کی گرمجوش سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ اپنی گردن پر اس کے خوشبودار گرم سانس کا لمس محسوس ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی وہ میرے کندھے پر اپنا سر رکھ کر کہے گی۔

"شاہد! میرے شاہد! میں تم سے بے پناہ محبّت کرتی ہوں...."

پھر میں بیتاب ہو جاتا اور دل کہتا کہ سکوٹر کا رُخ شیریں کے گھر کی طرف موڑ دو اور وہ جس حالت میں جیسے بھی بیٹھی ہو اُسے ساتھ لے کر شالامار کی پُرکیف فضاؤں میں گم ہو جاؤ۔

شیریں مجھ سے ریڈیو کے ڈرامے کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی۔

"تم نے ذہن میں مجھے رکھ کر وہ پارٹ ادا کیا تھا ناں؟"

"کیوں نہیں شیریں! سوائے تمھارے میرے ذہن میں اور کسی کی جگہ نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔"

شیریں نے خوش ہو کر کہا۔

"جب ہی تمھاری آواز جذبات سے بھرپور تھی۔ سچ میں تو گھر میں سب کے ساتھ بیٹھی شرما رہی تھی۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ان سب کو علم ہو گیا ہے کہ تم دراصل شیریں ہی سے مخاطب ہو۔"

میں ہنس پڑا اور پائپ میں نیا تمباکو بھرنے لگا۔

"شیریں! تم گھر جا کر فوراً ہی یہ گیلے کپڑے بدل لینا۔ دیکھو تمھیں

میری تاکید ہے میری شیریں کہ کپڑے جاتے ہی بدل لینا۔ خدانخواستہ تمھیں کچھ ہو گیا تو مجھے بے حد صدمہ ہو گا۔ میں تو تمھارے پاس آ کر تمھارا سر دبانے سے بھی مجبور رہوں گا۔"

"فکر نہ کرو شاہد! میں جاتے ہی کپڑے بدل لوں گی۔ مجھے تو خود گیلے کپڑے پسند نہیں۔ اگرچہ میں یہی کپڑے پہن کر ساری عمر تمھارے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔"

میں نے شیریں کا ہاتھ تھام کر محبت سے دبایا۔

"کاش ایسا ہو سکتا شیریں ــــ کاش ہم دونوں ساری عمر اسی سبز کھڑکیوں والے کیبن میں بیٹھے رہ سکتے۔ کاش وقت ایک دم تھم جائے اور پھر لاکھوں سال کے بعد جب ہم اس کیبن سے باہر نکل کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ سورج نے طلوع ہونا بند کر دیا ہے۔ آسمان پر لاتعداد چاند نکلے ہوئے ہیں اور زمین پر ان گنت پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہر طرف بہار اور چاندنی ہے۔ نہ کہیں جھلسا دینے والی دھوپ ہے اور نہ انسان کی آزادی کو سلب کر دینے والی زنجیریں ہیں۔ نہ چھپ چھپ کر تیر چلانے والے ظالم لوگ باقی ہیں اور نہ بدنام کرنے والی لمبی لمبی زبانیں موجود ہیں۔ نہ جُدا کر دینے والے فاصلے ہیں۔ نہ دور لے جانے والی بسیں

ہیں۔ نہ رشتہ داروں کے طعنے ہیں۔ نہ ماں کی جھڑکیاں ہیں۔ نہ باپ کی گھُرکیاں ہیں۔ نہ دنیا والوں کا خوف ہے۔ نہ اپنوں کا سہم ہے۔ ہر طرف محبّت ہی محبّت ہے اور اس خواب ایسی پھولوں سے بھری ہوئی چاندنی رات میں سوائے ہم دونوں کے اور کوئی بھی انسان زندہ نہیں......"

شیریں ٹکٹکی لگائے میری باتیں سن رہی تھی۔ جب میں نے بات ختم کر کے شیریں کا ایک بار پھر گرم اور تازہ خون سے دھڑکتا ہوا ہاتھ چوُما اور اس کی مخروطی دلکش اُنگلیوں کو بوسہ دیا تو وہ بولی۔

"شاہر! جو کچھ تم نے کہا ہے کبھی ایسا ہو سکتا ہے؟"

میں نے پائپ کا کش لے کر کہا۔

"اگر تم محبّت میں ثابت قدم رہو تو ایسا ضرور ہو سکتا ہے۔"

"مگر کیسے؟ میں تو محبّت میں تم سے بھی زیادہ ثابت قدم ہوں۔"

"پھر تمھیں مجھ سے زیادہ محبّت کی پختگی، لافانیت اور ابدیت کا احساس ہونا چاہیے۔ کم از کم میں تو اس وقت زمانے کے گرم سرد تھپیڑوں سے بے نیاز ہو کر تمھارے پاس بیٹھا ہوں۔ کم از کم

اس وقت ضرور میرے چاروں طرف چاند ہی چاند اور پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے سوائے بہار کے اور شیریں کے اور کچھ نہیں۔"

"میرے لیے تو صرف تمھارا میرے پاس ہونا ہی کافی ہے"

شیریں نے شرماتے ہوئے اتنا کہا اور پھر حجاب سے نظریں جھکا لیں۔ ہوا کا ایک شریر جھونکا سبز کیبن کی کھڑکی کا پردہ لہراتا اندر آیا اور شیریں کی زلف کو پریشاں کر کے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ایک بار پھر اُس زلفِ پریشاں کو پیچھے ہٹایا اور قریب تھا کہ میں شیریں کے یاقوتی ہونٹ چوُم لیتا کہ ہوٹل کا ملازم گرم چائے کی کیتلی لیے کیبن کا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوُا۔

میں شیریں کی زلف کو پیچھے ہٹا کر خود بھی پیچھے ہٹ گیا۔ شیریں بھی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ چائے پینے کے بعد شیریں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا اور ہونٹوں کو سکیڑ کر بولی۔

"ہائے ہائے —— اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ وقت کا تو پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"ہاں شیریں! جب تم میرے پاس بیٹھی ہو تو وقت کو پر لگ جاتے ہیں۔ وہ گذرتا نہیں بلکہ اُڑتا ہے۔ ہوا بن کر اُڑتا ہے۔"

مجھے بھی شیریں کی گھریلو پابندیوں اور اس کی سماجی مجبوریوں کا خیال آگیا۔ میں جانتا تھا اُس کے گھر والے بڑے سخت گیر لوگ ہیں جیسا کہ ہر شریف گھرانے کے لوگ اپنی کنواری لڑکیوں کے بارے میں ہوتے ہیں اور جیسا کہ انھیں قدرتی طور پر ہونا چاہیے۔ ہم دونوں کیبن سے اُٹھ کر باہر باغ میں آگئے اور پیدل چلنا شروع کر دیا۔ موسم اس قدر خوشگوار اور ہوش رُبا ہو گیا تھا کہ ہوا میں نشہ سرایت کر گیا تھا اور مجھے غالبؔ کا وہ شعر یاد آرہا تھا ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

اور پھر جب ایک محبت کی متوالی نازک اندام پیارے پیارے ہونٹوں، مخروطی اُنگلیوں اور پُراسرار شربتی آنکھوں والی لڑکی ساتھ ہو تو موسم اپنے آپ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ پھر تو بادل نہ بھی چھائے ہوں تو بارش شروع ہو جاتی ہے۔ چاند نہ بھی ہو تو چاندنی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ ہوا نہ بھی ہو تو ہواؤں کے میٹھے گیتوں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ شیریں برقعے میں لپٹی لپٹائی نصف نقاب اُٹھائے میرے ساتھ، پہلو بہ پہلو چلی جا رہی تھی۔ ہم چھوٹی چھوٹی محبت کی پیاری پیاری باتیں بھی کیے جا رہے تھے اور راستہ بھی طے

ہو رہا تھا۔ لارنس باغ کی حدود ختم ہو گئیں۔ ہم پلازا سینما والے بس سٹاپ پر آ گئے۔ بس سٹاپ ہم کتنی ہی دیر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ دو تین بسیں نکل گئیں مگر کبھی میں نے شیریں سے درخواست کر کے بس چھڑوا دی اور کبھی شیریں نے میری خاطر بس کو چلے جانے دیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب اُسے مجھ سے جُدا ہونا تھا۔ وہ بس بھی آ گئی جس میں شیریں کو سوار ہونا تھا۔ یہ بس خوش نصیب بھی تھی اور بدنصیب بھی۔ بدنصیب اس لیے کہ وہ شیریں کو مجھ سے جدا کر رہی تھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اس میں شیریں سوار ہو کر جا رہی تھی۔ یہ سعادت صرف اسی ایک بس کے حصے میں آئی تھی کہ اُس کی آغوش میں، اُس کی ایک سیٹ پر شیریں کو بیٹھ کر اپنے گھر گارڈن ٹاؤن جانا تھا۔

شیریں بس میں سوار ہو کر چلی گئی۔ اُس نے بس کی کھڑکی میں سے تھوڑا سا نقاب اُٹھا کر مجھے مسکرا کر دیکھا اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سڑک پر اکیلا رہ گیا۔ اگر میرے پاس سکوٹر ہوتا تو میں تھوڑی دُور تک اُس کے ساتھ جا سکتا تھا۔ یا کم از کم آگے جا کر واپسی پر اُس کی ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب ایسا ہونا ناممکن تھا۔ چند ایک لمحے میں بس سٹاپ پر کھڑا پاٹپ

ہونٹوں میں دبائے بس کو مزنگ چونگی کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ جب بس موڑ گھوم گئی تو میں واپس گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سارا راستہ یہ سوچتا رہا کہ اب شیریں کی بس فلاں جگہ کھڑی ہوئی ہوگی۔ اب فلاں جگہ پر سے گذر رہی ہوگی۔ اب شیریں داہنی جانب فلاں منظر دیکھ رہی ہوگی۔ محبت میں انسان کیسی کیسی پاگلوں ایسی باتیں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔

اگلے روز شیریں نے مجھے فون کرکے میری خیریت دریافت کی اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ مجھے ایک طویل خط لکھ رہی ہے۔ دو روز گذر گئے مگر شیریں کا محبت نامہ مجھے نہ ملا۔ تیسرے روز مجھے دفتر میں نیلے رنگ کا لفافہ موصول ہوا۔ میں نے خوشی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھول کر خط نکالا۔ ہلکے نیلے رنگ کے چھوٹے پیڈ کے خوبصورت کاغذ پر شیریں کی شگفتہ تحریر مسکرا رہی تھی۔

" شاہد پیارے! گھر میں کچھ مہمان آگئے تھے جس کی وجہ سے میں تمھیں اُسی روز خط نہ لکھ سکی۔ رات بھر گھر میں ہنگامہ رہا۔ اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں اور میں بستر پہ بیٹھی تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ خط لکھنے کے بعد کالج کا کام کروں گی اگر دماغ تمھاری

یاد سے غافل ہُوا تو) کیونکہ امتحان سر پہ ہیں۔

سناؤ تمھارا کیا حال ہے۔ مجھے تو تم نے اپنا مریض بنا رکھا ہے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ آنکھوں میں تمھاری تصویر گھومتی رہتی ہے۔ رات جو چند گھنٹے سوئی ہوں تو اس میں بھی جو خواب دیکھا تو تم میرے ساتھ تھے۔ گذری ہوئی باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی رہیں۔

یہ تو تھیں میرے دل کی باتیں۔ اب میں تمھیں چند ایسی باتیں بتاتی ہوں جن کا تعلق میری ذات سے ہے۔ تمھیں بہت سی باتیں بتا چکی ہوں۔ تم میری ہر بات پر اعتبار کرنا۔ کیونکہ میں تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اور غور سے سنو! اور مجھے روکنا نہیں۔ ٹوکنا نہیں۔ ورنہ میں کچھ نہ کہہ سکوں گی۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ امید ہے تم میری باتوں کو غور سے سنو گے اور یقین کرو گے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں بہت بدنصیب ہوں اور اپنی بدنصیبی کی دو وجوہات بتائی تھیں۔ لیکن تم نے انھیں مذاق میں ٹال دیا تھا۔ حالانکہ میں نے یہ باتیں اپنی کسی سہیلی کو بھی نہیں بتائی تھیں۔ شاہد! باپ دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے کہ اُس ہستی کے سامنے باقی سب ہستیاں ہیچ ہوتی ہیں اور یہ اس لیے کہ اُس کے پاس ایسا پُرخلوص پیار ہوتا ہے۔ جس کی قیمت دنیا میں نہیں مل

سکتی - چاہے باپ غریب ہو یا امیر —— غریبی اور امارت دونوں میں باپ کے پیار کا ترازو برابر رہتا ہے - لیکن میری یہ بدنصیبی ہے کہ مجھے یہ پیار حاصل نہیں - خدا کے فضل و کرم سے میرا باپ زندہ ہے - خدا رہتی دنیا تک زندہ رکھے - میں نماز کے بعد ہمیشہ یہی دعا مانگتی ہوں اور میرے دل میں اپنے باپ کے لیے ویسی ہی عقیدت اور محبّت ہے جیسی کہ ہونی چاہیے - میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے اُن کا دل دُکھا ہو اور انھیں مجھ سے شکایت پیدا ہوئی ہو - یا اُن کی عزّت پر دھبّہ لگا ہو - اور نہ میں کوئی ایسا کام کبھی کروں گی - لیکن اس کے بدلے میں مجھے کیا ملا ؟ چند ایسے الفاظ جنھوں نے میرا سکون مجھ سے چھین لیا - اور یہاں تک میرا دل جلایا کہ میں نے اپنی موت کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں - نفل مانے کہ مجھے ٹی بی ہو جائے اور میں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں - رو رو کر آنکھیں خراب کیں تاکہ اندھی ہو جاؤں اور کسی کی صورت نہ دیکھ سکوں -

میں تمھیں کہہ رہی تھی کہ میں بہت بدنصیب ہوں - تمھارے لیے ایسی باتیں معمولی ہیں - تم مرد ہو - مرد بہادر ہوا کرتے ہیں - لیکن عورتیں اگر بہادر بھی ہوں تو مردوں کے سامنے اُن کی بہادری جواب

دے جاتی ہے۔ کیا اس سے تمھیں اندازہ نہیں ہوا کہ میری اور کیا بدنصیبی ہو گی کہ ایک چیز میرے سامنے ہے اور میں اُسے حاصل نہیں کر سکتی۔ بلکہ دیکھ دیکھ کر ترستی رہتی ہوں۔ اور اب میری یہ حالت ہے۔ میں سب کام کرتی ہوں۔ اپنے باپ کا ہر حکم بجا لاتی ہوں۔ احترام کرتی ہوں۔ میرے دل میں اُن کی عقیدت ہے۔ لیکن اب اس عزّت اور عقیدت میں ایک خلش بھی ہے جو اُس وقت مجھے زیادہ تکلیف دیتی ہے۔ جب میں اپنے باپ کا حکم بجا لاتی ہوں۔

پھر بھی میں بڑی احتیاط برتتی ہوں۔ کسی رشتہ دار کے ہاں نہیں جاتی۔ اگر جاتی ہوں تو صرف چند لمحوں کے لیے۔ اس سے زیادہ نہیں امی کے کہنے پر بھی نہیں۔ مجھے اس قدر ڈر لگتا ہے کہ خدانخواستہ اگر کسی کو ہماری محبّت کا علم ہو گیا تو سر پر قیامت ہی ٹوٹ پڑیگی۔ میں اپنی عزّت کی حفاظت خود کرتی ہوں۔ مجھے بہت سے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ دھیان نہ دوں لیکن اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی اور خود ہی اندر اندر جلتی رہتی ہوں۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لیتی ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔

کالج کی لڑکیاں مجھ سے جلتی ہیں۔ منہ پر کچھ بعد میں کچھ ——— یہ

اُن کی عادت ہے۔ میں کوئی لائق لڑکی نہیں ہوں۔ خوبصورت بھی نہیں ہوں۔ کوئی خاص خوبی نہیں۔ سوائے اس کے کہ جو مجھے بلاتا ہے ہنس کر جواب دیتی ہوں۔ بعض لڑکیاں مجھے پسند کرتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ دیکھ کر بعض لڑکیاں مجھ سے حسد کرتی ہیں کہ میں اُن سے زیادہ کلاس میں مقبول ہوں۔ شگفتہ ہی کی بات لے لو۔ civics کے پروفیسر نے نوٹ اچھے لکھنے پر ساری کلاس کے سامنے میری تعریف کی اور کاپی پر "ویری گڈ" لکھ دیا۔ شگفتہ نے مجھ سے کاپی مانگی۔ میں نے دے دی۔ اُس نے گھر جاکر نوٹ اُتارے اور کاپی پر سے "ویری گُڈ" مٹا دیا۔ بہت دنوں بعد کاپی دی۔ میں نے الماری میں رکھ دی۔ جب دوبارا نوٹ دکھانے لگی تو وہ ریمارکس مٹے ہوئے تھے۔ اور کسی نے کاپی لی ہی نہیں تھی۔ ظاہر تھا یہ حرکت شگفتہ نے کی تھی۔ لیکن میں نے اُسے بالکل نہیں جتایا۔ کیونکہ میری جو تعریف کلاس میں ہوئی تھی وہ ہو چکی تھی۔ اور سب لڑکیوں کو معلوم ہو چکا تھا۔ یہ تو خیر معمولی بات ہے لوگ تو اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ تم مجھے امارت کا طعنہ دیتے ہو اور کہتے ہو کہ امارت ہمارے درمیان حائل ہے۔ میں نے شاید تمھیں پہلے خط میں یہ

لکھ دیا تھا کہ امارت تمھارے حصّے میں ہے اور غربت میرے حصّے میں لیکن تم نے یقین نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ امارت ہمارے درمیان حائل ہے لیکن وہ امارت میری نہیں بلکہ تمھاری ہے۔ میں تو غریب خاندان کی لڑکی ہوں۔ معمولی سی لڑکی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم نے اُسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے۔ میں بھی اب اپنے آپ کو بہت خوبصورت سمجھنے لگی ہوں۔ لیکن حقیقت کچھ اور رہی ہے۔ اس لیے میں کبھی مغرور نہیں ہوئی۔ کیونکہ میں جو کچھ بھی ہوں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اور یہ میری عادت ہے کہ میں کبھی بھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوئی۔ کیونکہ میرا یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنی فطرت پر Depend کرتا ہے۔ اچھا خاندان ہونا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جہاں فطرت اچھی نہ ہو وہاں خاندان کی اچھائی بھی کچھ اثر نہیں دکھاتی۔

امیری اور غریبی یہ غیر متعلق باتیں ہیں اور اس سے انسان کی فطرت کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ایک مزدور بھی اچھے خاندان سے تعلق رکھ سکتا ہے۔ جس طرح ایک اچھے خاندان کا آدمی غریبی آ جانے پر مزدوری کر سکتا ہے۔ نیک اخلاق والا غریب آدمی بد اخلاق سیٹھ سے ہزار درجے بہتر ہے۔ انسانیت کا رشتہ بہت بلند ہے۔ میں نے جو تم سے رشتہ استوار کیا ہے اس کی بنیاد بھی انسانیت پر ہے۔ مجھے اس سے

کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کس خاندان سے ہو۔ تم امیر ہو یا غریب ہو۔ تمھارا اخلاق اچھا ہے تو تم بہت اچھے ہو۔ اور یہی نظریہ تمھارا بھی ہونا چاہیے۔ میں جو کچھ ہوں۔ اگر تمھیں پسند ہوں تو بہت اچھی ہوں۔ میری فطرت اگر اچھی لگتی ہے تمھیں تو تمھیں میرے خاندان سے کیا۔ میں نے یہ خیال کبھی نہیں کیا۔ اگر یہ خیال ہوتا تو میں تم سے اتنی محبت نہ کرتی اور تمھیں ملنے گھر والوں کو چھوڑ کر اُن کی عزت خطرے میں ڈال کر تم سے ملنے کبھی نہ آیا کرتی۔ تمھیں پہلی بار سٹیج پر دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور جب میں شگفتہ کے ساتھ واپس آئی تھی تو تمھاری شکل آنکھوں میں چھپا کر لیتی آئی تھی۔

میری کوشش کے باوجود بھی تمھاری تصویر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اُس وقت میں تمھارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن محبت اپنا کام کر چکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے ایک احساس یہ بھی تھا کہ اگر ہم کبھی مل بھی گئے تو ہمارا ملاپ وقتی ہوگا اور یہ صرف اپنی تلخ یاد چھوڑ جائے گا۔ اگر میں مجبور ہوں تو تم بھی مجبور ہو۔ اور میں تمھیں کبھی مجبور نہ کروں گی کہ میری خاطر تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ میں تمھیں اپنی بدنصیبیاں گنوا چکی ہوں۔ جن میں سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ میں اپنے آپ

کو تمھارے لائق نہیں سمجھتی۔

میں بہت مجبور لڑکی ہوں شاہد! — ایک اعتبار سے مجبور نہیں بھی ہوں لیکن حالات نے مجھے مجبور رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میری تمام قوتیں مفلوج کر دی ہیں۔ یا میں اُن قوتوں کو استعمال میں لانا نہیں چاہتی۔ تم ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ امیر ہو، خوبصورت ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فنکار ہو۔ آرٹسٹ ہو۔ تم مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ میری زندگی تو دکھی زندگی ہے۔ اُس میں تو کوئی خوشی نہیں۔ تمھارے سامنے تو میں بہت خوش ہوتی ہوں اور تم بھی میری اس وقتی خوشی سے دھوکہ کھا جاتے ہو۔ اور مجھے بہت خوش سمجھنے لگتے ہو۔ لیکن حقیقت میں، میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتی ہوں۔ حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ظاہر رکھ رکھاؤ سے کام لوں۔ اپنی عزت اور وضع داری کے لیے انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور اُسے قائم رکھنے کے لیے وہ اپنے آپ سے بھی فریب کرتا ہے۔

مجھے بھی تم ویسا ہی سمجھ لو۔ لیکن کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں۔ بالکل نہیں۔ میں یہ جانتی ہی نہیں کہ احساسِ کمتری کیا چیز ہے۔ میں ہر حال میں شاکر رہنے کی عادی ہوں۔ ویسے کبھی وقتی طور پر خیال آجاتا ہے۔ مگر فوراً ہی خدا کا شکر بجا لاتی ہوں اور معافی

مانگ لیتی ہوں۔ اور اُن لوگوں پر نظر کرتی ہوں جو مجھ سے بھی زیادہ عاجزی کے عالم میں ہیں۔ مجھے تو خدا نے بے پناہ نعمتیں دے رکھی ہیں۔ ہاتھ پاؤں، دل دماغ اور سب سے بڑھ کر تم ۔۔۔!

میں نے تم سے پہلے دن ایک جھوٹ بولا تھا۔ لیکن میں نے محض اپنی مجبوریوں کی بنا پر یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک مجھے مل سکتے ہو۔ در اصل میں تمھیں اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر میں نے کہا تھا کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ یہ سب اس خیال سے کہ تم میری پروا نہیں کرو گے۔ میرا خیال چھوڑ دو گے اور اُن مصیبتوں سے ہم دونوں بچ جائیں گے جو محبّت کی راہ میں چل کر ہم پر نازل ہونے والی تھیں۔ لیکن آج میں تم سے اس جھوٹ پر معافی مانگتی ہوں۔ بڑی عاجزی سے معافی مانگتی ہوں۔ کسی کا قصور معاف کر دینا ہی سب سے بڑی سزا ہوتی ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن میں نے تمھارا ہی فائدہ سوچا تھا کہ تمھارا خیال کم ہو جائے اور تم مجھے بھول جاؤ۔ میں اکیلی اس آگ میں جلنا چاہتی تھی۔ تم مجھے اچھے لگتے تھے اور معلوم نہیں کیوں میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی میرے ساتھ اس آگ میں جلو۔

میں اپنی حالت کو دیکھ کر تمھاری حالت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ کہ تم بھی میرے ساتھ تڑپو۔ میں آہستہ آہستہ تمھیں بھلا

دینا چاہتی تھی۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکی تھی۔ اور پھر جب تم نے دوبارا ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں اُسے ٹھکرا نہ سکی اور اس طرح مجبور ہوتی رہی اور آج یہ حالت ہوگئی ہے کہ ایک پل کا بھی چین نصیب نہیں ہے۔ تمھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ تم مرد ہو لیکن میرا سکون ـــــ زندگی بھر کے لیے تباہ و برباد ہوجائے گا۔

امید کے خلاف شاید یہ خط تمھارے لیے خوبصورت نہ ہو۔ تم نے کہا تھا کہ پیارا سا خط لکھنا۔ پیاری باتیں کیا لکھوں؟ دکھڑے ہیں سن لو۔ لیکن آخر کب تک سنو گے۔ ایک دن تم بھی اکتا جاؤ گے۔ جتنی باتیں تھیں سب کچھ بتا چکی ہوں۔ سب کچھ کہہ چکی ہوں۔ اب تم اور کیا مجھ سے سُننا چاہتے ہو؟ جب خط لکھتی ہوں تو پہلے سوچنے میں وقت ضائع کرتی ہوں۔ پھر فضول سی باتیں لکھنی شروع کر دیتی ہوں۔ اور اب بدنصیبی کا رونا لے کر بیٹھ گئی ہوں۔ لیکن آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔ رونا فضول ہے۔ رونے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی۔ بدنصیبی خوش نصیبی میں تبدیل ہونے سے رہی۔ میری قسمت میں خوشی کہاں؟ کبھی جنگلوں میں بھی محفلیں ہوتی ہیں۔ یا انجمنیں سجی ہیں؟ کبھی ویرانوں میں بھی بہار آئی ہے اور پھول کھلے ہیں؟ ہماری تو صحرا جیسی زندگی ہے جس میں کوئی ہنگامہ ہو بھی تو پتہ نہ چلے ـ ـ ـ صرف تمھاری ذات نے اس ویران اور سپاٹ زندگی میں ایک وقتی ہنگامہ بپا کیا ہے لیکن جب اس کا شور و غل خاموشی میں تبدیل ہو جائے گا تو پھر وہی ویرانیاں ہوں گی تنہائیاں ہوں گی۔ پریشانیاں ہونگی اور ہم ہوں گے۔

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

آخر ان کانٹوں سے کب تک ننگے پاؤں مقابلہ کریں گے۔ مقابلہ کرتے کرتے ایک روز تھک کر گر پڑیں گے۔ لڑتے لڑتے مرجائیں گے۔ مجھے تو اپنا یہی انجام نظر آتا ہے۔ اپنی زندگی تو بس اب اسی ڈھب سے گذرے گی اور ذراسی بھی امید نہیں کہ اس سے ذرا بھی مختلف ہو۔ آثار ہی ایسے ہیں۔ تمہیں دعائیں دیا کروں گی۔ اُن چند دنوں کے لیے جو کہ تمہاری وجہ سے خوشگوار بن گئے۔ چاہے ان دنوں کی یاد میں ایک خلش، ایک بے چینی اور ایک چبھن ہی کیوں نہ ہو۔ پھر کیا ہوا۔ نہ ہونے سے غم ہی بہتر ہے۔ کم از کم وہ دل کے ساتھ تو لگا ہے اب میرا خیال ہے کہ خط لکھنا بند کر دوں۔ وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے باریک پن سے لکھ رہی ہوں۔ خط بہت ہی لمبا ہے۔ پہلے بارہ بجے سے ڈھائی بجے تک لکھا تھا۔ اب رات ساڑھے نو بجے سے گیارہ بجے تک لکھا ہے۔ ہاتھ تھک گیا ہے اور ذہن بالکل خالی ہو گیا ہے۔ اگر کوئی بات ہوئی تو پھر لکھوں گی۔

اچھا پیارے شاہد اب اجازت دو۔ اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ اور پچھلی کوتاہیوں کی بھی معافی چاہتی ہوں۔ خدا حافظ

خواستگارِ معافی صرف تمہاری شیریں"

۶

موسمِ سرما آگیا۔
دن روشن اور گرم ہو گئے اور راتیں چمکیلی سرد اور تاروں سے بھر گئیں۔ لارنس باغ کی کیاریوں میں گلابی اور سفید رنگوں کے بڑے بڑے گلاب کے پھول کھِل گئے۔ بسنتی گیندے سے ڈالیاں لد گئیں۔ سویٹ پیز کے رنگ برنگ شگوفوں نے فضا میں بھینی بھینی مہک اڑانا شروع کر دی۔ کیتلیوں میں چائے گرم اور خوش ذائقہ ہو گئی اور اُسے ہر جگہ بڑے شوق کے ساتھ پیا جانے لگا۔ سکوٹر پہ جب میں صبح دفتر جاتا تو سرد ہوا کے تھپیڑے میرا منہ لال کر دیتے۔ مال روڈ پر شام کو بڑی رونق ہوتی اور ہوٹل لوگوں سے صبح شام بھرے رہتے۔ شیریں جب

مجھے کالج سے نکل کر ملنے آتی تو اس کا رنگ نکھرا ہوتا اور رخساروں کے کنارے ہلکے ہلکے سرخ ہو رہے ہوتے۔ لارنس میں دھوپ کھلی ہوتی ہم سنہری دھوپ میں لہلہاتے ہوئے سبزے پر سے گذر کر اوپن ایر کیفے کے کیبن میں جا کر بیٹھ جاتے۔ فضا میں شیریں کے کپڑوں میں سے اُٹھتی ہوئی حِنا کے عطر کی خوشبو سنہری رنگ کی چائے کی خوشبو میں مخلوط ہو جاتی۔ میں شیریں کے لیے چائے بناتا۔ اُسے اپنے نازک اور مخروطی انگلیوں والے خوبصورت ہاتھ میں پیالی اُٹھائے دیکھتا رہتا۔ کبھی باتیں کرتا اور کبھی محض اس کی پُراسرار آنکھوں میں جھانک کر اپنی محبّت کے گم شدہ جذبوں کو تلاش کیا کرتا۔ ہم اب ایک دوسرے سے بے حد پیار کرنے لگے تھے۔ بے پناہ محبّت کرنے لگے تھے۔ دو روز نہ ملتے تو بے چین ہو جاتے۔ ہماری ملاقات ہفتے میں ایک بار ضرور ہوا کرتی۔ کبھی ہم لارنس باغ کے کیبن میں آکر بیٹھ جاتے۔ کبھی کینال بینک والی نہر کے کنارے سنہری دھوپ اور گھاس کی خوشبو والی ہواؤں میں دور تک سیر کرتے، باتیں کرتے نکل جاتے۔

شیریں میرے پیچھے سکوٹر پہ بیٹھی ہوتی۔ اُس کا صندلیں جسم میرے جسم سے مس ہو رہا ہوتا۔ میں بڑی ہلکی رفتار میں سکوٹر چلا رہا ہوتا۔ میں پیچھے مڑ مڑ کر شیریں سے باتیں بھی کیے جاتا۔

شیریں کسی وقت ڈر کر کہتی ۔

"خدا کے لیے آپ سامنے دیکھیں۔ کہیں ایکسی ڈنٹ نہ ہو جائے۔"

اور میں اُسے کہتا ۔

"جب میں تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو ساری دنیا کو دیکھ رہا ہوتا ہوں تم فکر نہ کرو ۔ تمہارے ہوتے ہوئے ایکسیڈنٹ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

پھر ہم نہر کنارے یوکلپٹس کے اونچے اونچے درختوں کے سائے میں گھاس پر بیٹھ جاتے۔ ہماری پیار بھری باتوں پر درختوں میں چھپے ہوئے پرندے بھی ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ سنہری دھوپ نہر کے پانی پر پڑ رہی ہوتی ۔ پانی پر جھکے ہوئے درختوں پر سے کسی وقت پیلے رنگ کا ایک آدھ پھول ٹوٹ کر گر پڑتا اور لہریں اُسے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ بہا لے جاتیں۔ سڑک پر سے کسی وقت کوئی تیز رفتار کار گذر جاتی ۔ لیکن ہم آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے ۔ ہمیں کسی کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہماری نگاہیں تو ایک دوسرے کے چہرے پر اور ہمارے کان ایک دوسرے کی آواز پر لگے ہوتے ۔ اس وقت مجھے اگر کچھ نظر آ رہا ہوتا تو صرف شیریں کی پُر اسرار آنکھیں، اس کے نازک ہاتھ ، خوبصورت رخسار اور سنہری بال — اگر کچھ سن رہا ہوتا تو صرف شیریں کی میٹھی آواز — اس کے سوا میرے لیے دنیا میں کچھ نہیں تھا۔

شیریں کا بھی یہی حال ہوتا۔ وہ اس طرح مجھے تک رہی ہوتی جس طرح کوئی پجارن اپنے دیوتا کی مورتی کو تک رہی ہوتی ہے۔ اسکی آنکھوں میں عقیدت، محبت اور پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا تھا۔ وہ میرے چہرے پر سے اپنی نگاہیں ہٹانا دنیا کا سب سے بڑا گناہ سمجھتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب یہ پُرجوش پجارن اپنے ہاتھوں اپنے دیوتا کی مورتی کو توڑ کر پاش پاش کر دے گی۔ اس کے ایک ایک ٹکڑے کو ہزار ہزار ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گی۔ اُس کے گلے میں عقیدت سے ڈالا ہوا پھولوں کا ہار نوچ کر پاؤں تلے مَسل دے گی اور اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی زندگی کا سب سے بڑا گناہ تصوّر کرنے لگے گی۔

کیا محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے؟ کیا پہاڑ کی چوٹی پر کھِلا ہوا پھول شہر کی گندی نالی میں بھی گر سکتا ہے؟ کیا پیار سے اُٹھی ہوئی نگاہ قہر و غضب میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے؟ کیا وفورِ محبّت سے سینے پر رکھا ہوا خوبصورت سر سانپ کے مہلک اور زہریلے پھن میں بھی بدل سکتا ہے؟ کیا جوشِ محبت میں اٹھی ہوئی بانہیں کسی کا گلا بھی گھونٹ سکتی ہیں؟ کیا کانپتے ہوئے ہونٹوں پر آیا ہوا پریم سندیسہ کسی کی موت کا پیام بھی بن سکتا ہے؟ کیا ممتا کی چھاتیوں میں اُترا ہوا دودھ زہر بن کر کسی بے زبان کی ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا ہے؟ کیا پھول سے ٹوٹ کر گری ہوئی نازک پنکھڑی کسی

کے سینے میں خنجر بن کر بھی اُتر سکتی ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو پھر بیٹے
کو ماں کی مامتا، بھائی کو بھائی کی شفقت، بہن کو بھائی کے پیار اور
خاوند کو بیوی کی وفا پر شک کرنا چاہیے۔ پھر کسی آنکھ کو اپنی ویران
محبت کے لیے آنسو بہانے کا کوئی حق نہیں۔ پھر کسی پردیس گئے ہوئے
خاوند کو اپنی بیوی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ کسی باپ کو اپنی اولاد
کے بارے میں یقین نہیں کرنا چاہیے۔ کہ وہ اس کی ہی اولاد ہے۔ دُنیا
امید پہ نہیں، اعتماد پر قائم ہے۔ اور جب اعتماد ہی اُٹھ جائے تو پھر
باقی کیا رہ جاتا ہے؟ یہ خاوند کا اعتماد ہے جو بیوی کی اس بات پر
یقین کرتا ہے کہ یہ تمھارا ہی بچہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دُنیا میں ایک بھی
باپ ایسا نہیں جو اپنے کسی بچے پر اُنگلی رکھ کر یہ ثابت کر سکے کہ وہ
اُسی کا خون ہے۔ اگر شیریں میری محبّت کی انتہائی بلندیوں پہ پہنچ کر
مجھے دھوکا دے سکتی ہے تو پھر چاند سُورج بن کر طلوع ہو سکتا ہے۔
روشنی دھواں بن کر پھیل سکتی ہے۔ پھول شعلہ بن کر اپنی ٹہنی سے بلند
ہو سکتا ہے۔ شبنم انگارہ بن کر پنکھڑیوں پہ گر سکتی ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی
پر لیٹا دودھ پیتے ہوئے اُس کا کلیجہ نکال کر چبا سکتا ہے۔ پہاڑ پانی
بن کر بہہ سکتے ہیں اور پانی پتھر بن کر جم سکتا ہے۔ پھر وہ سب کچھ
ہو سکتا ہے جو کبھی نہیں ہو سکتا۔ جسے کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ستارے

اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر سکتے ہیں جس طرح انجیریں اپنی ٹہنیوں سے جھڑا کرتی ہیں۔ پھر ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ جب کسان زمین پر ہل چلائیں تو زمین کے سینے سے خون کی دھاریں بلند ہوں۔ گوالنیں اپنے مٹکوں میں دودھ بلوئیں تو مکھن کی جگہ جمے ہوئے خون کے لوتھڑے اوپر آکر تیرنے لگیں۔ ماہی گیر دریا سے اپنا جال کھینچیں تو مچھلیوں کی بجائے وہ دہکتے ہوئے، کھولتے ہوئے، سسکارتے ہوئے گرم لاوے سے بھرا ہوا۔ بیویاں رات کو اپنے خاوندوں کے بازوؤں پر سر رکھ کر سوئیں اور صبح پھنکارتے ہوئے سرخ آنکھوں والے اژدہوں کے پہلو سے اٹھیں۔ فصل کاٹنے والے کی درانتی گندم کے پودوں پر چلے لیکن گیہوں کے خوشوں کی بجائے انسانوں کے سر کٹ کر گرتے چلے جائیں۔

پھر کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر تو ہمالیہ کی چوٹیوں پہ گرم پانی کے چشمے ابل سکتے ہیں اور عرب کے ریگستانوں میں برفباری ہو سکتی ہے پھر ہم شیر کو گدھوں کے ساتھ مل کر گھاس کھاتا اور گدھوں کو گوشت کی بھوک سے پاگل ہو کر ہرن کی پشت پہ اپنا پنجہ چلاتے دیکھ سکتے ہیں پھر بلبل گندگی کے ڈھیر پہ گر سکتی ہے اور مکھیاں پھولوں کے گرد نالیاں بجا بجا کر گا سکتی ہیں۔ پھر آم کا درخت بچھوؤں کی فصل دے سکتا ہے اور سورج کسی لالچی ساہوکار کی طرح اپنی ایک ایک کرن دینا سے

واپس لے جا سکتا ہے۔

لیکن مجھے تو ان انقلابات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ میں تو کبھی ایسی باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جو شیریں نے کر کے دکھا دیں۔ میں تو اُس زہر کو چھُو بھی نہیں سکتا تھا۔ جسے شیریں بڑے سکون سے ہضم کر گئی۔ اور پھر اُس نے اُسی زہر سے مجھے ہلاک کر کے میری بے یار و مددگار لاش شہر کے سب سے بڑے چوراہے میں لٹکا دی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ شیریں نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا۔ مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی۔

ابھی تو شیریں میری محبت میں چوُر تھی اور میرے پاس نہر کنارے یوکلپٹس کے لمبے لمبے درختوں کے نیچے گھاس پر برقعے میں لپٹی لپٹائی نقاب اُٹھائے بیٹھی تھی اور مجھے والہانہ نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اگرچہ ہماری محبّت اس نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں ہمارا ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہم نے ایک دوسرے سے شادی کے عہد و پیماں بالکل نہیں کیے تھے۔ شیریں نے بڑی صاف گوئی سے دوسری ہی ملاقات میں مجھے بتا دیا تھا۔

"شاہد! میں اپنے ماں باپ کی بڑی فرما بردار لڑکی ہوں۔ ویسے بھی میں ڈرپوک ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کی حکم عدولی کبھی نہیں کر سکتی۔

میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ ہاں میں دوستی کے پاکیزہ رشتے کو ساری عمر نبھاہ سکتی ہوں۔"

میں نے شیریں کو بڑی محبت سے کہا تھا۔

"میری جان! مجھے تمہارا قرب چاہیے اور کچھ نہیں۔ اگر مجھے عمر بھر کے لیے تمہاری دوستی مل جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔ یہ تو ایک ایسی نعمت ہے کہ میں اپنی قسمت پہ جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔"

شیریں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آزردہ لہجے میں کہا تھا۔

"شاہد! اگر میں اپنے ماں باپ اور حالات کی مجبوری کی وجہ سے تم سے شادی نہ کر سکی تو کہیں تم مجھے بے وفائی کا طعنہ تو نہ دو گے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شیریں! جب ہم نے آپس میں طے کر لیا ہے کہ ساری عمر ایک دوسرے کے دوست رہیں گے تو پھر شادی کرنے یا نہ کرنے کی شکایت یا گلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"سوچتی ہوں کہیں تم یہ نہ کہو کہ شیریں مجھے چھوڑ گئی۔ اُس نے بے وفائی کی۔ اُس کی محبت جھوٹی تھی۔"

"لیکن تمہاری دوستی تو قائم رہے گی ناں شیریں۔"

"وہ تو مرتے دم تک قائم رہے گی۔"

"تو پھر مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"سچ کہتے ہو شاہد؟"

"میں اس سے زیادہ سچ نہیں بول سکتا۔"

اور شیریں نے اپنا خوبصورت سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس وقت وہ میرے بالمقابل نہر کنارے گھاس پر بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنا سر کندھے پر ایک طرف کو جھکا رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں محبّت مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھ رکھے تھے۔ موسم سرما کی شگفتگی اور دلکشی اس کے نازک خدوخال سے نمایاں تھی۔ اگرچہ سرد ہوا چل رہی تھی۔ مگر چمکیلی دھوپ کی وجہ سے موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی تھیں۔

میرا دل بے اختیار شیریں کے ہونٹوں کو پیار کرنے کو چاہا جہاں سنہری رُواں ہلکی ہلکی سردی میں کانپ رہا تھا۔ مگر ہم نہر کنارے سڑک کے اس پار بیٹھے تھے اور یہاں بیٹھ کر میں نماز تو پڑھ سکتا تھا مگر اپنی محبوبہ کے ہونٹ نہیں چوم سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں خدا کی عبادت میں محو تھا۔ کیونکہ میرے نزدیک شیریں سے پیار کرنا اور اُس کی یاد میں مگن رہنا خدا کی بندگی سے کم نہیں تھا۔ یہی حال شیریں کا تھا جیسا کہ وہ خطوں میں لکھا کرتی کہ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مجھے یاد کرتی ہے۔ اپنے گرم سانسوں میں میرے سانسوں کی خوشبو محسوس

کرتی ہے۔ وہ خیال ہی خیال میں میرا چہرہ اپنے نازک ہاتھوں میں تھام کر اُسے دیوانوں کی طرح چوما کرتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شیریں میری محبت میں ڈوب چکی تھی اُسے سوائے میرے اور کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ کالج میں اس کا پڑھائی میں جی نہ لگتا تھا۔ گھر میں وہ میری باتوں اور میرے خیال میں مگن رہتی تھی۔ اور بہانے تلاش کرتی رہتی کہ وہ کسی طرح مجھ سے آکر مل جائے۔ میں بھی انتہائی خلوص اور دیانتداری سے شیریں سے پیار کر رہا تھا۔ دنیا بھر کی عورتوں کا حسن، نزاکت اور محبت شیریں کے وجود میں آکر سمٹ گئی تھی۔ اس ایک مرکز پہ ہزاروں مرکز اور اس ایک نقطے میں ہزاروں نقطے آن ملے تھے۔

اب ہم ہفتے میں دو دو تین تین بار ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ پروگرام کے مطابق شیریں کسی سہیلی کے ہاں جانے کا بہانہ بنا کر پورے پونے چار بجے گھر سے نکل آتی۔ وہ گارڈن ٹاؤن کے بس سٹاپ پہ آکر ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک پہ چلنا شروع کر دیتی۔ میں ادھر دفتر سے پورے چار بجے اُٹھتا۔ سکوٹر پر سوار ہوتا اور پوری رفتار سے گارڈن ٹاؤن کی طرف چل پڑتا۔ ابھی شیریں بمشکل ایک فرلانگ ہی پیدل چلی ہوتی کہ میں اُس سے آملتا۔

پھر وہ میرے سکوٹر کے پیچھے سوار ہو جاتی اور ہم دونوں کینال بنک والی خوبصورت سڑک پر سے ہوتے مال کے کسی کیفے میں یا لارنس باغ والے کیبن میں آکر بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھی شیریں وہیں بس سٹاپ پر ہی کھڑی میری راہ دیکھا کرتی۔ کئی بار تو اُسے پون پون گھنٹہ بھر کھڑے رہنا پڑا۔ کیونکہ میں کبھی کام کی وجہ سے دفتر سے ذرا دیر سے چلتا۔ وہ سٹاپ پر ہمیشہ کھڑی رہتی۔ کبھی نہ بیٹھتی۔ میں نے ایک روز انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"شیریں کم از کم تم کھڑی تو نہ رہا کرو۔ اس طرح سے مجھے اور بھی دُکھ ہوتا ہے۔"

شیریں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"شاہد! تم ہمیشہ مجھے بس سٹاپ پر کھڑی دیکھنے کے عادی ہو۔ یہ سوچ کر کھڑی رہتی ہوں کہ کہیں تم مجھے بیٹھی دیکھ کر غلطی کھا جاؤ اور آگے نکل جاؤ۔ پھر میں کیا کروں گی؟"

میرے پاس لندن کے درزیوں کے سلے ہوئے بڑے خوبصورت گرم سوٹ تھے۔ ان میں سے نیلے رنگ کا ایک تھری پیس سوٹ شیریں کو بے حد پسند تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتی۔

"شاہد! تم ہمیشہ یہی نیلا سوٹ پہن کر آیا کرو۔ یہ سوٹ

تمھیں اتنا پیارا لگتا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے تمھیں گھنٹوں بیٹھی دیکھتی رہوں۔ سچ میری آنکھیں کبھی نہیں تھکتیں۔"

گرمیوں میں وہ مجھے ہمیشہ بوسکی کی قمیص، سفید پتلون اور سفید جوتوں میں دیکھنا پسند کرتی اور سردیوں میں نیلے سوٹ میں۔ یہ میرا نیلا سوٹ شیریں کی محبّت کی یادگار ہے۔ یہ سوٹ اب بھی میرے پاس پڑا ہے۔ مگر میں نے اُسے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ دیا ہے اس لیے کہ اُسے دیکھنے والی آنکھیں اب مجھ سے دور ہو گئی ہیں۔

جب وہ آنکھیں میرے قریب تھیں تو یہ نیلا سوٹ میرے جسم کے ساتھ ہوتا تھا اور اس نیلے سوٹ کے ساتھ شیریں کا جسم لگا ہوتا تھا۔ اس سوٹ میں شیریں کے دل کی پُر محبت دھڑکنیں بند ہیں۔ اس کے گرم سانس کی خوشبو جذب ہے۔ اس کے فرطِ محبّت سے نکلے ہوئے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ اس کے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ پوشیدہ ہے۔ جب کبھی میں اس نیلے سوٹ کو نکال کر اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگاتا ہوں تو میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو جاتی ہیں اور وہ ساری ملاقاتیں، پرجوش ہم آغوشیاں، طویل میٹھے بوسے، شہد بھری سرگوشیاں، کانپتی ہوئی آہیں اور مچلتے ہوئے دلوں کی دھڑکنیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ پھر آسمان سے سرمدی نغمات کی بارش

ہونے لگتی ہے اور ایک پل کے لیے سوٹ مجھ میں اور میں سوٹ میں گم ہو جاتا ہوں۔ تحلیل ہو جاتا ہوں۔

ایک روز شیریں نے مجھے نائلن کی ایک بڑی خوبصورت انگلش کنگھی لا کر دی۔ کہنے لگی۔

"شاہد! جب تم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کرو گے تو تمھیں میرا خیال آ جائے گا۔ تمھیں گہرے رنگ پسند ہے نا؟ میں نے بڑی مشکل سے اس رنگ کی کنگھی تلاش کی ہے۔"

میں تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اپنی کنگھی سے بھی بال بناتا تھا تو مجھے شیریں کا خیال آ جاتا تھا۔ اور اب تو اُس نے کنگھی لا کر دی تھی۔ اب جب میں بال بنانے کے لیے آئینے کے سامنے آتا تو مجھے یوں لگتا جیسے شیریں میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی ہے

شیریں کو بھی یہ احساس ہمیشہ رہتا تھا۔ عجیب بات ہے۔ اُس نے کئی بار مجھے کہا تھا۔

"شاہد! میں جب کبھی آئینے کے سامنے سنگار کے لیے بیٹھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم میرے پیچھے کھڑے ہو۔ پہلے مجھے اپنے کندھوں پہ تمھارے سانس کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ پھر تمھاری مسکراتی ہوئی صورت دکھائی دیتی ہے اور پھر تم دونوں

بازو میرے گلے میں حمائل کر کے مجھے اپنے ساتھ لگا لیتے ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے شاہد! کہیں یہ انتہائی محبت کی نشانی تو نہیں؟ سچ میں تمھیں بالکل زندہ اپنے پیچھے دیکھتی ہوں اور اپنے کندھوں پر تمھاری انگلیوں کا لمس محسوس کرتی ہوں۔"

اب جبکہ وہ مجھ سے جدا ہو چکی ہے تو سوچتا ہوں کہ وہ سنگار میز کے سامنے بیٹھ کر آئینے میں اپنے پیچھے کس کا عکس دیکھتی ہو گی۔ کس کے بازوؤں کو اپنی گردن میں حمائل دیکھتی ہو گی؟ اپنی گردن پر کس کے گرم سانسوں میں کا لمس محسوس کرتی ہو گی؟ میں نے شیریں کی دی ہوئی کنگھی سنبھال کر رکھ لی ہے۔ اب میں اُسے بالوں میں نہیں پھیر سکتا۔ کیونکہ اُس کے دندانے میرے دماغ میں تلخ یادوں کی گھناؤنی اور خون آلود لکیریں کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ جنھیں میں برداشت نہیں کر سکتا۔

موسم سرما اپنے پورے جوبن پہ تھا۔

اور ہماری محبت بھی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہماری محبت کا آفتاب آسمان کے وسط میں آنے کو تھا۔ اُن ہی دنوں شیخوپورے میں میرا ایک بڑا قریبی دوست تبدیل ہو کر آ گیا۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھا اور کنوارا ہونے کے علاوہ وہاں بالکل اکیلا رہ رہا تھا۔ چار

کمروں والی ایک مختصر سی کوٹھی اُسے مل گئی تھی جہاں وہ ایک نوکر کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں افسر لگا تھا۔ جب مجھے اس کا خط ملا تو میں اُسے ملنے شیخوپورے گیا۔ وہاں جاکر میں نے اُسے اپنی محبّت کی ساری داستان سنائی اور کہا کہ ہم دونوں اُس کے ہاں آکر ملا کریں گے۔ اُس نے بڑی خوشی سے کہا۔

"مجھے اس سے بڑی مسرّت ہوگی۔ میرا گھر اور میرا نوکر تم لوگوں کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔ اجازت لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اب ہماری شیخوپورے کی ملاقاتوں کا جذبات انگیز سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ شبّیریں صبح صبح کالج کے ٹائم پر گھر سے نکل کر گارڈن ٹاؤن سے بس میں سوار ہوتی اور مزنگ چونگی پر آکر اُتر جاتی۔ میں وہاں سکوٹر لیے سخت سردی میں پہلے ہی سے موجود ہوتا۔ اُس نے سویٹر پہن رکھا ہوتا۔ کتابیں اٹھائی ہوتیں۔ ہم پیار بھری مسکراہٹوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے۔ وہ میرے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ جاتی اور میں سکوٹر سٹارٹ کرکے بہاولپور روڈ، چوبرجی، ضلع کچہری سے ہوتا ہوا شاہدرے کا موڑ گھوم کر شیخوپورے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس خیال سے میں سکوٹر تیز چلاتا تاکہ منزلِ مقصود پر جلدی پہنچ جائیں اور زیادہ سے زیادہ وقت

ایک دوسرے کی آغوش میں بسر ہو۔ لیکن یہ سوچ کر کہ شیریں کو تیز ہوا میں سردی لگ رہی ہو گی میں رفتار کم کر دیتا۔ میں نے دستانے، سویٹر اور کوٹ پی کیپ اور چشمہ لگا رکھا ہوتا۔ ہم تیز ہواؤں کے سینے چیرتے اُڑتے چلے جاتے۔

شیریں کے ہاتھ سردی سے ٹھٹھر جاتے تو وہ میرے اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑ دیتی۔ جب گرم ہو جاتے تو پھر باہر نکال لیتی۔ جب وہ تھک جاتی تو اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے نرگس کے پھولوں کا گلدستہ میرے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ مجھے ان پھولوں میں سے اٹھتی ہوئی شیریں کے بالوں میں سے آتی ہوئی خوشبو محسوس ہوتی۔ اُس کے نازک اور ابریشمی رخساروں کا لمس محسوس ہوتا اور اتنی شدید لذت میں ڈوب جاتا کہ میرے لیے سکوٹر سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ شیریں نے اپنا ریشمی رومال اور چھوٹا سا پرس مجھے جیب میں رکھنے کے لیے دے دیا ہوتا۔ جب اُس کے ہاتھ برف کی طرح سرد ہو جاتے تو وہ اپنے دونوں ہاتھ میرے اوور کوٹ کی گرم جیبوں میں ڈال دیتی اور مجھے لگتا گویا میری محبت نے انگور کی بیل بن کر میرے جسم کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ گویا خوش نصیبی اور خوش بختی نے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دی ہیں۔

میرے دامن کو اپنے زریں ہاتھوں سے تھام لیا ہے۔ میرا جی چاہتا کہ شیریں کے ہاتھ کبھی گرم نہ ہوں تاکہ وہ ہمیشہ اپنے ننھے منّے خوبصورت ہاتھ میری جیبوں میں ہی رکھے۔

کوئی ایک گھنٹے میں ہم شیخو پورے اپنے دوست کی کوٹھی میں پہنچ جاتے۔ وہ ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہا ہوتا۔ پہلے دن شیریں اُس سے ذرا شرمائی تھیں۔ لیکن اُس نے شیریں کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"بہن جی! یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ بے فکر ہو کر اطمینان سے آرام کریں"

شیریں نے میری طرف دیکھ کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ پھر ہم نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ میرا دوست اپنے دفتر چلا گیا۔ اُس نے نوکر کو ہدایت کر دی تھی کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مہیا کر دی جائے اب ہم دونوں وہاں تنہا رہ گئے۔ میں شیریں کو لے کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا تھا جس پر بڑا خوبصورت ریشمی لحاف پڑا تھا۔ راستے کی سردی سے شیریں کا جسم ٹھٹھر گیا تھا اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ اُس نے برقعہ اُتار دیا اور لحاف میں گھس کر بیٹھ گئی۔ نوکر نے ہیٹر لگا دیا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ میں نے اندر سے چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر شیریں کے پاس آکر بیٹھ گیا اور

اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم کرنے لگا۔ شیریں نے
پُرشوق نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"شاہد مجھے یقین نہیں آتا کہ ہم لاہور سے اتنی دور اس پیارے سے گھر میں دونوں تنہا بیٹھے ہیں"

میں نے شیریں کی ہتھیلیاں سہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری محبت کا معجزہ ہے شیریں۔ دنیا والے لاکھ ہماری راہ میں روڑے اٹکائیں مگر محبت کوئی نہ کوئی پوشیدہ گوشہ ضرور تلاش کر لیتی ہے"

پھر وہ کہتی۔

"شاہد! جب ریڈیو پر فرمائشی پروگرام کی ریکارڈنگ ہوتی ہے تو تم سنا کرتے ہو ناں۔ میں تو اُس وقت تمھیں یاد کر کے اداس ہو جایا کرتی ہوں"

"ہاں شیریں! میں ریکارڈنگ خاص طور پر سُنا کرتا ہوں۔ صرف اس خیال سے کہ اس وقت میری شیریں بھی ریڈیو کے پاس بیٹھی ریکارڈ سُن رہی ہو گی۔ اور گانے کی یہ لہریں جو میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ شیریں کے کان بھی چوم رہی ہوں گی"

"لیکن شاہد! میں ریکارڈ سن کر اُداس ہو جاتی ہوں۔ کیا تم بھی اُداس ہو جاتے ہو؟"

"ہاں شیریں! میں بھی اُس وقت تمہاری یاد میں سوگوار ہوتا ہوں۔"

"میں تو خوشی کے گانوں پر بھی مغموم ہو جاتی ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میرے شاہد؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"محبت ہمیشہ اداس رہتی ہے شیریں۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ جب محبوب پاس نہ ہو تو محبت کی آنکھوں میں خوشی کے گیت پر بھی آنسو آجاتے ہیں۔"

"لیکن اب تو تم میرے پاس ہو۔"

اسی لیے تو تمہارا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا ہے سنہری دھوپ کی طرح دمک رہا ہے۔"

اور میں نے شیریں کا منہ چوم لیا۔ شیریں نے اپنی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں اور اپنے ہونٹ اس طرح میرے ہونٹوں سے لگا دیئے جس طرح کوئی نیک دل چرواہا کسی پیاسے مسافر کو دودھ کا پیالہ پیش کرتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے نرگس کے پھولوں کے گلدستے پر اپنا منہ رکھ دیا ہے۔ خوشبو اور شبنم کی پاکیزہ نمی کی لہریں تھیں جو بار بار اُٹھ کر میرے ہونٹوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میرے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ نرگس کے پھول کونسے ہیں اور شیریں کے ہونٹ کونسے ہیں؟ پھول اور ہونٹ ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ ہمارے

سانس ایک دوسرے کے سانس میں مل گئے تھے۔ مجھے اپنے ہونٹوں پر شیریں کے ہونٹوں کا، اپنے سانس پہ شیریں کے سانس کا گمان ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ شیریں سانس لے رہی ہے یا میں سانس لے رہا ہوں۔ میں اپنا ہونٹ چوم رہا ہوں یا شیریں کا ہونٹ چُوم رہا ہوں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ہونٹ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ سانس کی لہریں کبھی ایک دوسری سے جدا نہیں ہوں گی۔ دل کی دھڑکنیں کبھی ایک تال پہ رقص کرنا بند نہیں کریں گی۔

ہم گھنٹوں ایک دوسرے کا منہ چومتے رہے۔ ہماری زبانیں تھک گئیں۔ ہونٹ سوج گئے۔ لیکن پیار میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ جذبات کے سمندر کا ایک قطرہ بھی خشک نہ ہوا۔ شوق کے پھول کی ایک پنکھڑی بھی نہ مرجھائی۔ شیریں نے محبت کے خمار اور پیار کی شدت سے نڈھال ہو کر اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ شیریں کے منہ سے ایک خاص قسم کی مہک آیا کرتی تھی۔ ایسی مہک میں نے کسی پھُول اور کسی عطر میں نہیں سونگھی۔ اس مہک میں باغ عدن کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ ایسے پھولوں کی خوشبو جو اس دنیا میں کبھی نہیں کھلے۔ میں شیریں سے کہا کرتا تھا۔

"شیریں اپنا چہرہ میرے قریب لا کر اپنا سانس میرے ہونٹوں پہ پھینکو"

اور وہ شرما جایا کرتی۔ پھر جب وہ اپنا چہرہ میرے ہونٹوں کے قریب لایا کرسانس لیتی تو میرا دل و دماغ اُس آسمانی خوشبو سے معطّر ہو جاتا۔ اُس روز بھی بند کمرے کی فضا شیریں کے سانس سے اُٹھنے والی خوشبو سے لبریز ہو گئی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شیریں نہیں سانس لے رہی بلکہ کنول کے بڑے بڑے پُورے کھلے ہوئے پھول سانس لے رہے ہیں۔

"شاہد! مجھے بھُلا تو نہیں دو گے؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو شیریں؟ میں اپنے آپ کو بھلا سکتا ہوں۔ ساری دنیا کو بھُلا سکتا ہوں۔ مگر تمھیں نہیں بھلا سکتا۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔"

"تمھیں شاید مجھے بھلا دینے کے بعد دکھ نہ ہو۔ لیکن میں تمھاری محبّت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی شاہد میں خودکشی کر لوں گی۔"

"ایسے الفاظ زبان پر مت لاؤ شیریں۔ میں نے تمھیں کہہ دیا ہے کہ تمھیں بھلانا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ تم میری زندگی میں اتنی قریب آ گئی ہو کہ میں اگر چاہوں بھی تو تمھیں بھلا نہیں سکتا۔ اگر میں تمھیں بھلا بھی دوں گا تو میرے جسم کا ذرّہ ذرہ تمھارا نام لے لے کر تمھیں یاد کر رہا ہو گا۔"

"سچ کہتے ہو شاہد؟"

"ہاں شیریں! تم کو یقین نہیں آتا کیا؟ کیا ابھی تک تمھیں میری محبت پر شک ہے۔"

"شک نہیں شاہد! میں زمانے کے انقلابات سے ڈرتی ہوں۔ کل کو جب تمھاری شادی ہو گئی۔ یا میں کسی کے ساتھ بیاہ دی گئی تو تم ہمیشہ کے لیے مجھے بھول جاؤ گے۔ پھر کبھی مجھے یاد نہیں کرو گے۔"

"دوستی کا رشتہ شادی بیاہ کے رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور پائیدار ہوتا ہے شیریں۔ شادی ٹوٹ جایا کرتی ہے مگر دوستی کبھی نہیں ٹوٹتی۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔"

"کیا تم شادی کے بعد بھی مجھے یاد کیا کرو گے شاہد؟"

"شیریں! یاد وہ کرتے ہیں جو بھول جایا کرتے ہیں۔ جب میں تمھیں بھلاؤں گا ہی نہیں تو پھر یاد نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم تو سوتے جاگتے میں میری یادداشت کے ساتھ ہوتی ہو۔ جو سانس تمھارا نام لے کر نہیں آتا وہ میرے سینے سے باہر نہیں آسکتا۔ شاید پھر وہ میرا آخری سانس ہوگا۔"

"یہ تو تم نے میری حالت بیان کر دی شاہد۔ تمھاری محبت نے تو مجھے دنیا اور گھر بار سب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ نہ مجھے گھر والوں کی خبر ہوتی ہے اور نہ اس بات کی پروا کہ دنیا کیا کہے گی۔ میں اگرچہ

ڈرپوک سی لڑکی ہوں۔ مگر شاہد تمھاری محبّت نے تو میرے سینے میں شیر کا دل رکھ دیا ہے۔ جب میں تمھارے ساتھ ہوتی ہوں تو اپنے اندر ایک زبردست قوت محسوس کرتی ہوں۔ ایسی قوت جو دنیا کا بڑے سے بڑا کام کر سکتی ہے۔"

"پھر بھی شیریں! میں تم سے زیادہ شدّت سے پیار کرتا ہوں۔ زیادہ محبت کرتا ہوں۔ زیادہ یاد کرتا ہوں۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"کیوں ؟"

"اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ میں تمھیں زیادہ چاہتی ہوں۔ میری محبّت تم سے زیادہ ہے۔ میں تمھیں زیادہ محبّت کرتی ہوں۔ تم سے بڑھ کر تمھیں یاد کرتی ہوں۔"

میں نے شیریں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اُس کے رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ شیریں مسکرا رہی تھی۔ اس کا دل کنول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ چہرہ مسرّت سے دمک رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"جانتے ہو شاہد مجھے تمھارے چہرے کی کونسی چیز سب سے زیادہ پسند ہے ؟"

"کونسی ؟"

"آنکھیں — تمہاری گیلی گیلی شرمیلی سی بے باک سی شربتی آنکھیں — جانے کیوں میں ان آنکھوں کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتی ہیں ان سے محبت بھی کرتی ہوں اور ان سے خوف بھی کھاتی ہوں"

میں نے شیریں کی آنکھیں چوم کر کہا۔

"خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے شیریں؟"

شیریں نے میری باریک موچھوں پر اپنی پتلی پتلی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بہرحال کبھی کبھی میں ان آنکھوں سے ڈر جاتی ہوں"

میں نے شیریں کو لپٹا لیا۔

"ان آنکھوں میں سوائے تمہاری محبت کے اور کچھ نہیں ہے شیریں۔ یہ آنکھیں تو دو کاسہ ہائے گدائی ہیں جو صرف تمہارے درشنوں کی بھیک مانگتی ہیں"

"شاہد! تم اتنی پیاری پیاری باتیں کرتے ہو کہ میں تمہارے سامنے بے بس ہو جاتی ہوں۔ پھر میرا اپنا آپ قابو میں ہی نہیں رہتا۔ میں چاہتی کچھ ہوں لیکن کرتی کچھ اور ہوں۔ تمہاری باتیں تو مجھ پہ جادو کر دیتی ہیں"

"اور تم نے جو مجھ پہ جادو کر رکھا ہے۔ کچھ اُس کی بھی خبر ہے یا نہیں؟"

شیریں ہنس پڑی اور اس کے رخسار میں داہنی جانب ایک بڑا خوبصورت گڑھا پڑ گیا۔ میں نے بے تاب ہو کر اُس گڑھے کو چوم لیا۔ شیریں نے بڑی دل آویزی سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تمھیں میرے گال کا یہ گڑھا بھی پسند ہے؟"

"شیریں! اگر مجھے علم ہو جائے کہ اس گڑھے میں گر کر میری ساری زندگی تباہ ہو جائے گی تو میں پھر بھی بڑی خوشی سے اس گڑھے میں چھلانگ لگا دوں۔ تم جسے گڑھا کہتی ہو یہ میرے لیے محبت کی ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔"

شیریں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے قہقہے میں مندروں کی مقدس گھنٹیوں کی آواز تھی۔ پاکیزہ مزاروں کے سفید گنبدوں پر سے اُڑنے والے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ ساون کی اندھیری راتوں میں بولنے والی کوئلوں کی گونج تھی۔ اور اپنے دیوتا کے سامنے رقص کرنے والی دیوداسی کی پائل کی جھنکار تھی۔ ابھی میں اس جھنکار میں ہی گم تھا کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"کھانا تیار ہو گیا صاحب۔"

ہمیں اس وقت معلوم ہوا کہ دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اگر کچھ وقت

اور ملازم دروازے پر دستک نہ دیتا تو شاید ہمیں ایک دوسرے
کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہزاروں برس گذر جاتے اور کسی کو کانوں کان
خبر بھی نہ ہوتی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس دوران میں شیریں نے
بال وغیرہ درست کر لیے تھے۔ نوکر میز پر کھانا لگا کر چلا گیا۔ ہم نے
مل کر کھانا کھایا۔ پھر چائے پی۔ اس کے بعد پھر پلنگ پر ایک دوسرے
کے ساتھ لگ کر، بلکہ ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھ گئے اور محبت بھری
باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

پورے تین بجے شیریں نے مجھے احساس دلایا کہ ہمیں واپس لاہور
بھی چلنا ہے۔ کیونکہ چار بجے شیریں کا کالج بند ہوتا تھا اور سوا چار بجے
تک اُسے اپنے گھر پہنچنا تھا اور شیخوپورے سے گارڈن ٹاؤن تک
ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد شیریں میرے سکوٹر کے
پیچھے بیٹھی تھی اور ہمارا اسکوٹر لاہور کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ دھوپ خوب
نکلی ہوئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ مگر ہوا سرد تھی
اور آسمان گہرا نیلا اور شفاف تھا۔ ارد گرد کھیتوں میں کسان ہل چلاتے
دکھائی دے جاتے۔ شیریں نے حسب عادت ایک جگہ اپنا سر میرے
کندھے سے لگا دیا۔ سرسوں کے کھیت میں کچھ سیاہ چشم، سانولے رنگ
کی دہقان زادیاں کام کر رہی تھیں۔ انھوں نے ایک برقعہ پوش خاتون

کو ایک نوجوان کے کندھے پر سر رکھے دیکھا تو گردنیں اُٹھا کر ہماری طرف تعجّب سے تکنے لگیں۔ ان کی چاندی کی بالیاں اور ملکھن لگے گندمی چہرے دھوپ میں چمک رہے تھے اور آنکھوں میں حیرت تھی۔ جیسے سوچ رہی ہوں کیا شہروں میں بھی عورتیں اپنے مردوں سے اتنی شدید اور پاکیزہ محبت کرتی ہیں؟ کیا بیک وقت تین تین عاشقوں کو محبت بھرے خط لکھنے والیاں بھی مخلصی سے کسی ایک کی ہو کر رہ سکتی ہیں؟ کیا پہلے عاشق کی قبر پر کھڑی ہو کر دوسرے عاشق سے عہد و پیمان کرنے والیاں بھی کسی ایک در پر اپنے سر کو جھکانا جانتی ہیں؟ کیا مال روڈ کی ایک دن کی شاپنگ کے بعد اپنا گوہرِ عصمت لُٹا دینے والیاں اپنی عزت کے لیے سر دھڑ کی بازی بھی لگا سکتی ہیں؟ کیا پتھروں میں بھی محبت بھرے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگی ہیں؟

جفاکش محنتی اور وفا پرست دہقان زادیوں کے دھوپ میں تانبے کی طرح دمکتے ہوئے حیران چہروں کو پیچھے چھوڑتے ہم آگے گذر گئے کیونکہ سکوٹر ہل سے بڑا تیز چلتا ہے۔ جتنی دیر میں۔ کسان اپنے کھیت میں ہل کی ایک لکیر ڈالتا ہے۔ اتنی دیر میں سکوٹر لاہور سے شیخوپورے کا فاصلہ طے کر لیتا ہے اور جتنی دیر میں دیہات کی ایک جاہل دہقان زادی اپنے گھر سے لسّی کا کٹورا اٹھا کر کھیتوں میں اپنے خاوند کے پاس پہنچتی ہے اتنی دیر میں شہر کی ماڈرن لڑکی دو عاشق

بدل چکی ہوتی ہے۔

ہمارا اسکوٹر پورے چار بجے لاہور پہنچ گیا۔ میں نے شیریں کو پلازا کے بس سٹاپ پر اُتار دیا۔ کیونکہ وہ وہاں سے باقاعدہ بس میں سوار ہو کر گھر جانا چاہتی تھی۔ میں نے شیریں کو بس میں سوار کروایا۔ تیسرے روز ملنے کا وعدہ لیا اور واپس چل پڑا۔

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

۷

اب ہفتے میں دو بار شیخوپورے کا چکّر ضرور لگتا۔

وہاں میرے دوست کا وہ چھوٹا سا اکیلا مکان جہاں ہم آٹھ بجے صبح سے لے کر تیسرے پہر تین بجے تک اپنے راز و نیاز میں دنیا مافیہا سے بے خبر مشغول رہتے گویا اس دُنیا میں جنّت کا ایک ٹکڑا تھا جہاں ہماری ہر خواہش کی اپنے آپ تکمیل ہو جاتی۔ جہاں آرزو ابھی دل میں پیدا ہی ہوتی کہ فوراً پوری ہو جاتی۔ ہم نے جو جو خواب دیکھے تھے وہاں اس کی تعبیر مل گئی۔ میں تو اُس خوش نصیب مکان کو طوفانی سمندر کے بیچ میں پھیلا ہُوا ایک پُرسکون جزیرہ کہوں گا جس کے سایہ دار گھنے جنگل میں پہنچ کر ہم سمندر کی بلاخیز لہروں سے محفوظ ہو جاتے اور جی بھر کر ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹ کر پیار کرتے۔ اس جزیرے نے ہماری محبت کے اَن گنت چھوٹے چھوٹے مزید جزیرے دریافت کرنے میں ہماری مدد کی۔

مثلاً وہاں اس جزیرے کا انکشاف بھی ہُوا کہ شیریں کو میرے سینے کے سیاہ بال بڑے پسند ہیں اور وہ میری چھاتی کے بالوں پر سر رکھ کر پڑی رہنے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتی ہے۔ وہاں یہ بات بھی دریافت ہُوئی، کہ شیریں کا جسم اس کی مخروطی انگلیوں سے بھی زیادہ نازک اور خوبصُورت ہے، اور وہ مجھ سے پاکیزہ خیالی اور عصمت کے تحفّظ کا مطالبہ کرتا ہے جو کہ بلاشُبہ جائز تھا اور جس کا میں نے ہر اعتبار سے احترام کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں ہم پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہُوا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اور ہمیں دوستی سے زیادہ کسی پائیدار اور دیرپا رشتے کی ضرورت ہے۔ یعنی ایسا رشتہ جو کسی طرح بھی مجھے کسی دوسری عورت کے اور شیریں کو کسی دوسرے مرد کے حوالے نہ کر سکے۔

شیخوپورے کی پُرجوش ملاقاتوں کے سلسلے نے ہمیں ایک دوسرے کے انتہائی قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ یہ گویا نہر سویز تھی جس نے خلیج فارس اور بحیرہ روم کے سمندروں کو آپس میں ملا دیا اور ایک سمندر کا پانی دوسرے سمندر میں گُم ہو گیا۔

شیریں کڑاکے کی سردی میں صبح سات بجے گارڈن ٹاؤن سے نکل کر بس میں سوار ہوتی اور مزنگ چونگی پر آکر اُتر جاتی جہاں میں دنسانے اور اوورکوٹ پہنے، سکوٹر ایک طرف کھڑا کئے پہلے ہی سے اُس کا انتظار کر رہا ہوتا۔

یہاں ہم ایک منٹ بھی ضائع کئے بغیر شیخو پورے کی جانب اپنا طویل سفر شروع کر دیتے۔ یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے بھی شیریں کے ارادے کو ایک دن کے لیے متزلزل نہ کر سکے۔ وہ چٹان کی طرح ان تھپیڑوں کے سامنے سینہ تانے میرے سکوٹر کے پیچھے مجھ سے لگی بیٹھی رہتی۔ جب اس کے ہاتھ سردی سے سُن ہو جاتے تو دونوں ہتھیلیاں میرے اوورکوٹ کی جیبوں میں ڈال دیتی۔ کسی وقت میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیتی یا میرے شانے کے ساتھ لگا دیتی۔

شیخو پورے والے مکان کی جنت میں آ کر ہم اپنے پیارے اور محسن دوست کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتے۔ وہ ڈیوٹی پر چلا جاتا اور ہم اُس کی خواب گاہ میں آگ جلا کر یا ہیٹر گرم کر کے پلنگ پر ریشمی لحاف میں دبک کر بیٹھ جاتے ہم ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوتے۔ میں شیریں کی ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کر انھیں گرم کرتا۔ اُس کے ٹھنڈے جسم کو اپنے ساتھ لگا کر گرم کرتا۔ اس کے سرد ہونٹوں کی ٹھنڈک اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیتا۔ اس کے پریشان بالوں کو ٹھیک کرتا۔ اس کے کپڑوں سے حنا کے عطر کی خوشبو اور بالوں سے ناریل کے تیل کی مہک اُٹھ رہی ہوتی۔ بہت جلد بند کمرے میں ان دونوں خوشبوؤں کے ساتھ ایک تیسری خوشبو بھی آن شامل ہوتی۔ یہ خوشبو شیریں کے سانس کی خوشبو ہوتی۔ اور جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس خوشبو کی مثال

دنیا کے کسی پھول اور کسی عطر میں نہیں تھی۔

کسی کسی دن شیریں میری خاطر بالوں کا جوڑا بنا کر آتی جو اُسے بڑا پیارا لگتا تھا۔ میں راستے سے نرگس کے پھولوں کا گچھا خرید لیتا۔ شیخوپورے آکر میں شیریں کے جوڑے میں نرگس کے زرد پھول سجا دیتا۔ ان کی مہک سے کمرے کی فضا لبریز ہو جاتی اور یہ تمیز کرنی مشکل ہو جاتی کہ نرگس کے پھولوں کی خوشبو کہاں ختم ہوتی ہے اور حنا کی خوشبو کہاں شروع ہوتی ہے اور حنا کی خوشبو کہاں ختم ہو کر شیریں کے سانس کی خوشبو کو جنم دیتی ہے۔

کسی روز سرد ہوا کے تھپیڑے کھانے کی وجہ سے شیریں کے سر میں درد شروع ہو جاتا۔ پھر میں گھنٹوں شیریں کا خوبصورت سر اپنی گود میں رکھ کر اُسے آہستہ آہستہ دباتا رہتا۔ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا۔ شیریں کو بھی میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے سے عشق تھا۔ وہ عام طور پہ میرے سر کے پچھلے حصے کے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈال کر آہستہ آہستہ سہلایا کرتی یا میرے چھاتی کے بالوں میں انگلیاں اُلجھا کر اُنھیں سلجھایا کرتی۔ پھر میری چھاتی کے بالوں پر گال رکھ دیتی اور گہرے گہرے سانس لینے لگتی۔ ایک بار ایسا بھی ہُوا کہ شیریں کا ایکدم دل گھٹنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا اور فکر مند چہرے کے ساتھ پہروں شیریں کا دِل ہاتھوں سے سہلاتا رہا۔

شیریں کی دلجوئی کرنا، اس کی صحت، خوشی اور پاک دامنی کا خیال رکھنا

میرا اور محبت کا اوّلین فرض تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ شیریں کو میری محبت کی ہی نہیں بلکہ میری ہمدردی کی بھی ضرورت ہے اور شیریں نے ایک بار مجھے کہا بھی تھا۔

"شاہد! میری زندگی پیار اور ہمدردی سے خالی زندگی ہے۔ مجھے میرے گھر والے بھی اپنا پیار نہیں دے سکے۔ میرے سر میں درد ہو تو کسی نے جھوٹے منہ آج تک میرا سر نہیں دبایا۔ مجھے بخار ہو جائے تو سوائے دوائی پلانے کے کسی نے مجھ سے ہمدردی کے دو بول نہیں کہے۔ کسی بھائی بہن کو مجھ سے پیار نہیں۔ میرے باپ کو میری خبر نہیں اور ماں اپنے گھر کے کام دھندوں میں لگی رہتی ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ شیریں کی زندگی میں پیار کی تشنگی کا احساس وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا اور اس کی زندگی ایک ایسا صحرا بن گئی جہاں بارش کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا ہو۔ لیکن مجھے شیریں سے صرف محبت ہی نہیں بلکہ اُس سے دلی ہمدردی بھی تھی۔ میں اس کا عاشق ہی نہیں غم خوار بھی تھا۔ اُس کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے والا بھی تھا۔ میں تو اُس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتا۔ کانٹا اس کے پاؤں میں لگتا تو خون میرے پاؤں سے بہنا شروع ہو جاتا۔ دل اُس کا گھٹتا اور اندھیرا میری آنکھوں تلے چھا جاتا۔ سر درد اُسے ہوتی اور ٹیسیں میرے سر میں اُٹھنے لگتیں۔

میں نے اپنے کردار سے شیریں کو بھرپور محبت دی تھی۔ ایسی عظیم اور ارفع محبت جس کے سامنے بہن بھائی اور ماں باپ کی محبت بھی ہیچ تھی۔ میں نے اُسے اپنا اس قدر پیار دے دیا تھا کہ وہ اگر دس بار بھی پلٹ کر اس دنیا میں آئے تو اُسے اتنا شدید پیار نہیں مل سکتا۔ اگر وہ ہزار بار بھی کسی سے محبت کرے تو میری ایک گھنٹہ بھر کی محبت کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ میرا پیار تو موسلادھار بارش بن کر شیریں کی زندگی کے صحراؤں پر برسا ہے اور اُس نے ریگستان کو گل زار میں تبدیل کیا ہے۔ دُنیا والوں کا پیار تو ایک پل کے چھینٹے کے لیے عورت کا سارا اثاثہ چھین کر لے جاتا ہے۔ ان لوگوں کا پیار تو گندی نالی میں اگا ہوا پودا ہے جو رات کے گناہ آلود اندھیروں میں آنکھ کھولتا ہے اور سُورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مرجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی محبتیں تو کاغذ کے جعلی محبت ناموں سے شروع ہوتی ہے اور ناجائز بچے کے اسقاط پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ تو تاش کے پتوں کی طرح ہر آدمی کے ہاتھ میں جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد پھر واپس آجاتی ہے۔ یہ محبت نہیں سودا بازی ہوتی ہے۔ اس میں محبوبہ کی آنکھیں نہیں بلکہ جسم دیکھا جاتا ہے۔ دل کی جگہ کولھوں پر نظر جمائی جاتی ہے۔ دل چاہے کتنا وسیع ہو لیکن اگر کولھے پچکے ہوئے ہیں تو محبت بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔

مجھے ٹھکرا کر شیریں کو شائد میرے ایسا پیار زندگی بھر کہیں بھی نہ مل

سکے گا۔ میری طرح لوگ سر درد میں اُس کا گھنٹوں سر نہیں دبائیں گے بلکہ اُسے ایک آنے کی اسپرو کھلائیں گے اور اگر پھر بھی درد میں افاقہ نہ ہوا تو دوسرے دن کی ملاقات کا وقت لے کر اُسے تانگے میں بٹھلا کر گھر کو روانہ کر دیں گے۔ لوگ اُس کے دل اور روح سے نہیں اس کے جسم سے پیار کرنے کی کوشش کریں گے۔ جنس کے کاؤنٹر پر اس کی محبت کا جسم کھوٹے سکّے کی طرح بار بار ٹھونک بجا کر دیکھا جائے گا اور مجھے شک ہے کہ شیریں اُس معیار پر پوری نہ اُتر سکے گی۔ کوئی عاشق بھی کڑکتے جاڑے میں گھنٹہ بھر موٹر سائیکل چلانے کے بعد جنسی طور پر ناکام گھر واپس نہیں لوٹے گا اور نہ شیریں کو ہی اپنی عصمت اور پاک دامنی صحیح و سالم گھر واپس لے جانے دے گا۔ کیونکہ اس دُنیا کے پیار کے اندھیرے میں سچّا پیار تو روشنی کا محض ایک قطرہ ہے جو کہیں کہیں ہی چمک رہا ہوتا ہے۔ آج کا ماڈرن عاشق دن میں تین تین لڑکیوں کو محبت بھرے خط لکھتا ہے اور ایک لڑکی سے لی ہوئی محبت کی نشانی دوسری لڑکی کو اپنی طرف سے پیش کرتا ہے۔ وہ محبت کے پہلے ہی روز محبوبہ کا جسم ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے۔ اُس قصاب کی طرح جو منڈی میں بکری کے گوشت کا اندازہ کرنے کے لیے اُس کی رانوں کو دبا دبا کر جانچنے لگتا ہے۔ شیریں کو مجھ ایسا عاشق جنم جنم میں بھی نہ مل سکے گا۔ جس نے شیریں کے نازک جسم کو اس احتیاط اور احترام سے ہاتھ لگایا جیسے وہ کوئی چینی کا انتہائی بیش قیمت مجسمہ ہو۔ جیسے

وہ کسی مقدس کتاب کا ورق ہو۔ جس نے سب کچھ لٹا کر بھی شیریں سے کسی شے کا مطالبہ نہ کیا۔ جس نے سب کچھ کھو کر کسی چیز کو پانے کی خواہش نہ کی۔ جس نے سب کچھ گنوا کر بھی کچھ حاصل نہ کیا۔ میرا پیار تو صبح کی ہوا کا نرم خیز اور پاکیزہ جھونکا تھا جو صرف شیریں کے کھلے ہوئے نازک پھول کا منہ چوم کر ہی گزر گیا اور اُس نے اسی کو ہی بہت کچھ جانا۔ بہت کچھ سمجھا۔ جب شیریں سو رہی ہوتی تھی تو میرے پیار نے تو کبھی زور سے سانس بھی نہیں لیا تھا۔ اس خیال سے کہیں میری شیریں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ جب وہ جاگ رہی ہوتی تھی تو میں نے کبھی سرد آہ بھی نہیں بھری تھی کہ کہیں شیریں کا دل آزردہ نہ ہو جائے۔ میری محبت تو بے ضرر سایہ بن کر اُس کے پہلو بہ پہلو چلتی رہی تھی اور اُس نے اندھیرے میں بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ شیریں جب اکیلی ہوتی تو شیریں کی میری محبت اُس کی حفاظت کیا کرتی اور جب وہ میرے پاس ہوتی تو بلبل بن کر اُسے محبت کے پُرکیف اور لافانی گیت سنایا کرتی۔ شیریں اگر سُورج تھی تو میری محبت اس کی کرنیں تھیں۔ وہ اگر چاند تھی تو میرا پیار اُس کی چاندنی تھا۔ وہ اگر پھول تھی تو میری محبت اُس کی پنکھڑیوں سے اُٹھنے والی خوشبو تھی۔ شیریں سُورج پیدا کر سکتی ہے مگر اُس کے ماتھے پر کرنوں کا سہرا وہ نہیں لگا سکے گی۔ وہ چاند بنا سکے گی لیکن چاندنی کو جنم نہ دے سکے گی۔ وہ سینکڑوں پھول اپنے اردگرد جمع کر لے گی مگر کسی ایک میں بھی خوشبو پیدا کرنا اُس کے بس کی بات نہیں

ہو گی۔ کیونکہ ہم ہرن کو چشمے کے کنارے پر لا سکتے ہیں لیکن اُسے پانی پینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔

سردیاں بیتنا شروع ہو گئیں۔

ہم ساری سردیاں ہفتے میں دو بار شیخو پورے جاتے رہے۔ اتنی طویل اتنی پُرجوش اور سرگرم ملاقاتوں نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب کر دیا کہ ہم زندگی میں ایک دوسرے سے بچھڑنے کو گناہِ عظیم تصوّر کرنے لگے ایک روز شیریں نے دوپہر کے کھانے کے بعد شیخو پورے والی کوٹھی کے پُرسکون کمرے میں جسے میں محبت گاہ کہوں تو زیادہ موزوں ہو گا، میرے سینے پر سر رکھے ہوئے کہا:

"شاہد! پہلے میں تمھیں کہا کرتی تھی کہ اگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے تمھیں چھوڑ بھی دوں تو کہیں تم بھی تو مجھے نہیں چھوڑ دو گے؟ لیکن اب مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میں اگر چاہوں بھی تو تمھیں نہیں چھوڑ سکتی میں اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہوں کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ اتنی محبت جتنی کہ میں آج تک کسی سے نہیں کر سکی اور نہ کر سکوں گی اور میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

میں جانتا تھا کہ شیریں کو مجھ سے بے اندازہ محبت ہو چکی ہے اور وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُس کی یہ حالت تھی کہ اگر مجھ سے ملے ایک دن اوپر ہو جاتا

تو پاگلوں کی طرح گھر سے نکل آتی اور میری راہوں میں کھڑی ہو کر میرا انتظار کیا
کرتی۔ وہ بس سٹاپ سے پیدل ہی میرے دفتر جانے والی سڑک پر چل پڑتی۔
اس خیال سے کہ شاید میں دفتر سے واپس آتا ہوا اُسے مل جاؤں۔ ایک
روز میں سکوٹر پر بیٹھا اپنے ایک دوست کے ساتھ لیک روڈ پہ جا رہا تھا
شیریں ان دنوں لیڈی میکلیگن سکول میں امتحان دے رہی تھی۔ وہ ہیلی کالج آف
کامرس کے سامنے سے بس میں سوار ہو گئی۔ جب میرا اسکوٹر اس کی بس کے قریب
سے گزرا تو اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ میری یہ عادت ہو گئی تھی کہ میں ہر گزرتی
بس پر ایک نظر ضرور ڈال لیا کرتا۔ اس خیال سے کہ شاید میری شیریں اس میں بیٹھی
ہو اور حسنِ اتفاق سے ملاقات ہو جائے۔ اُس روز میں چوک گیا۔ شیریں نے
یہ سمجھا کہ میں نے بھی اُسے دیکھ لیا ہے۔ چنانچہ وہ اگلے سٹاپ پر اتر پڑی اور
میری واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ میں چوک میں سے سکوٹر
موڑ کر واپس آجاؤں گا۔ لیکن میں نے تو اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میرے دوست
کی شادی ہونے والی تھی اور اُسے کچھ فرنیچر وغیرہ خریدنا تھا۔ ہم دونوں کوئی گھنٹہ بھر
انارکلی کی مختلف دکانوں میں چکر لگاتے رہے اور پھر میں اپنے دوست کو چھوڑنے
فیروز پور روڈ پہ آ گیا۔

اس دوران میں شیریں بے چاری لیک روڈ والے چوک کے سٹاپ پر
کوئی پون گھنٹہ کھڑی میری واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر سخت نا امید ہو کر وہ

دوسری بس میں سوار ہو گئی اور مزنگ چونگی کی طرف چل پڑی۔ کیونکہ مزنگ چونگی سے ہو کر اُس کی بس جاتی تھی۔ ٹھیک اُس وقت جب اُس کی بس مزنگ چونگی کے پاس سے گزری میں اور میرا دوست ایک پنواڑی کی دکان کے باہر کھڑے کوکا کولا پی رہے تھے۔ اچانک میری نظر بس پر گئی۔ میں نے شیریں کو دیکھا تو اپنے دوست سے کہا:

"لو بھئی! خدا حافظ میری ڈئیر جا رہی ہے۔"

"ارے کم بخت! کوکا کولا کے پیسے تو دیتے جاؤ۔"

میں نے جلدی سے ایک روپیہ اُس کی طرف اُچھال دیا اور سکوٹر سٹارٹ کر کے بس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ شیریں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اگلے سٹاپ پر اُتر پڑی۔ ہماری ملاقات ہو گئی۔ شیریں سے ملے مجھے تین چار روز ہو گئے تھے اور میں اُس کی یاد میں بے حد اداس ہو رہا تھا۔ میں اُس سے گلہ کرنے لگا کہ اگر وہ اپنی جدائی میں مجھے اسی طرح تڑپانا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ وہ مجھے تھوڑی سی زہر دے دے اور ایک ہی بار کام تمام ہو جائے۔

شیریں نے ذرا مسکرا کر کہا:

"اور جناب کو علم ہونا چاہیئے کہ میں ابھی ابھی لیک روڈ والے سٹاپ پر پون گھنٹہ آپ کا انتظار کر کے آ رہی ہوں۔"

پھر جب شیریں نے پوری روئداد سُنائی تو میں حیران رہ گیا اور بے حد

پشیمان ہوا۔ میں نے اُس سے معذرت چاہی اور بتایا کہ حقیقتاً میں نے اُسے بس میں نہیں دیکھا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اُس نہ ہونے والی ملاقات کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکا۔ اس طرح کئی بار ہُوا کہ وہ انتظار سے تھک کے جب سٹاپ سے واپس مُڑی تو میں آ گیا یا میں پہلے سڑک پر نکل گیا اور وہ ذرا دیر بعد گھر سے نکل کر سڑک پر آئی۔ ایسی ملاقاتیں جو ہوتے ہوتے رہ گئیں، مجھے زیادہ اداس کر دیا کرتی ہیں۔ کاش ہم اُس وقت بھی مل جاتے جب ہم نہیں مل سکے تھے۔ آخر وہ لمحات یُونہی کیوں بیت گئے؟

شیریں کے دل میں بھی محبّت کی آگ برابر لگی ہوئی تھی اور اب اُس نے پُوری نیک نیّتی اور خلوص سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ سوائے میرے اور کسی بھی مرد کے ساتھ شادی کر کے خوش نہیں رہ سکتی بلکہ زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ اُس نے مجھ سے شادی کی بات کرنی چاہی لیکن میں نے اُسے کہا:

"شیریں! شادی زندگی بھر کا بندھن ہوتا ہے۔ تمھیں اس کے بارے میں اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ تم اُس پر مزید غور و فکر کر لو۔ اپنے آپ کو، مجھے سمجھنے اور اچھی طرح پرکھنے کا مزید موقع دو۔"

شیریں خاموش ہو گئی۔

اس دوران میں میرے شیخوپورے والے پیارے دوست کا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ ہو گیا اور ہماری پُر محبت اور باغِ عدن کی ملاقاتوں کا

سلسلہ بند ہو گیا۔

لیکن اب ہم اتنی دُور آگے نکل چکے تھے کہ ہم کوشش کے باوجود بھی ہفتے میں تین چار بار ایک دوسرے سے مِلے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اب ہمیں ہر ملاقات اُس وقت تک پھیکی اور بے رس معلوم ہوتی، جب تک کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر نہ بیٹھے ہوں۔ ہم سمندروں میں کشتی رانی کرتے آئے تھے ہمیں چھوٹی چھوٹی نہریں بھلا کیا تسکین دے سکتی تھیں۔

میں نے شیریں کی شالامار باغ میں بھی بہت سی تصویریں کھینچی تھیں اور مجھے یاد ہے شیخوپورے سے واپسی پر ایک روز میں نے اس کی ایک بڑی خوبصورت تصویر اتاری۔ شیخوپورہ اور لاہور کے درمیان ایک بڑی کشادہ اور پُر فضا نہر آتی ہے۔ اس نہر کے پاس میں نے سڑک کے کنارے سکوٹر کھڑا کر دیا۔ شیریں سکوٹر کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے کالا بُرقعہ پہن رکھا تھا اور چہرے پر سے نقاب اُٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے ہاتھ پہلوؤں میں دے رکھے تھے اور گردن میں تھوڑا سا خم دے کر خفیف سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے تصویر اُتار لی۔ یہ تصویر آج بھی میرے پاس ہے۔ جب کبھی میں اس تصویر کو نکال کر دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شیریں ابھی بازو کھول کر کہے گی:

"اُتر گئی تصویر ـــــ لو اب واپس چلو ناں۔ چار بجنے کو ہیں۔"

اور میں اُسے سکوٹر پہ بٹھلا کر لاہور کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اِس تصویر میں میرے سکوٹر کا عکس بھی آگیا ہے۔ میں تصویر والے سکوٹر کو دیکھتا ہوں اور پھر اپنے سکوٹر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہو کر سوچتا ہوں کہ کیا یہ وہی سکوٹر ہے جس کے ساتھ ٹیک لگا کر شیریں نے تصویر اُتروائی تھی؟ جس کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر شیریں میرے ساتھ لاہور سے شیخوپورے اور وہاں سے واپس لاہور آیا کرتی تھی؟ آج میرا سکوٹر مجھ سے بڑھ کر اُداس ہے۔ اس لیے کہ وہ ہماری خفیہ ملاقاتوں کا راز دار رہا ہے۔ اُس نے اس رومان میں وہی کردار ادا کیا ہے جو ایک ہمدرد اور بہترین غمگسار دوست ادا کر سکتا تھا۔ اُس پر بھی اُداسی کی گرد جمی ہوئی ہے اور وہ گیراج میں بند پڑا ہے۔ اگر میرے ہونٹوں پر سے شیریں کے بوسوں کے نشان خزاں نصیب پیلے پتے بن کر جھڑ نا شروع ہو گئے ہیں تو میرے سکوٹر کی نشست پر سے بھی شیریں کے گداز لمس کی حدّت دھواں بن کر اڑنے لگی ہے۔ وہ بھی میری محبت میں برابر کا شریک رہا ہے۔ اگر شیریں اپنا نازک سر میرے کندھے پر رکھ دیا کرتی تھی تو میرا سکوٹر بھی اُسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر اُڑ ائے لیے پھرا کرتا تھا۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ میں اُسے گیراج سے نکال کر صاف کروں۔ اُسے پالش مار کر چمکاؤں۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس کا بھی دل بجھ گیا ہے۔ اُس نے

بھی کبھی آنکھ اُٹھا کر مجھے نہیں دیکھا اور مجھ سے کبھی بن سنور کر تیار رہنے کی فرمائش نہیں کی۔ کسی یتیم بچے کی طرح جو عید پر بھی صاف ستھرے کپڑے پہننے کی حسرت دل میں دبائے بیٹھا رہے۔

میں اور میرا بے زبان سکوٹر!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شیخوپورے کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ہماری نئی قسم کی ملاقاتوں کا دروازہ کھل گیا۔ اب ہم ریلوے سٹیشن کے پاس ایک بڑے ماڈرن ہوٹل اور یا ایک انگریزی سینما کے باکس میں جا کر ملتے۔ کبھی کبھی ہم لارنس باغ کے کیبن میں جا کر بیٹھ جاتے۔ لیکن اب ہماری باتوں میں وہ شروع کی ملاقاتوں والی جھجک اور نا فہمی نہیں تھی۔ اب ہم ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے اور ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے۔ اب ہمیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہمارا ملاپ ناگزیر تھا اور یہ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر اکیلے رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ سٹیشن والے ہوٹل میں ہم اس طرح جاتے جیسے ابھی ابھی کسی دوسرے شہر سے لاہور میں آئے ہوں اور ہمیں اپنے رشتہ داروں کا گھر نہیں مل رہا اور محض کچھ وقت گزارنے کے لیے ہوٹل میں آ گئے ہیں۔

اس طرح ہم دونوں ایک کمرے میں آ کر براجمان ہو جاتے اور وہاں صبح سات بجے سے تین بجے تک اپنے راز و نیاز میں محو رہتے۔

ہمارے رومان کو آگے بڑھانے اور تقویت دینے میں اگر میرے سکوٹر اور اُن تانگوں کا بھی ہاتھ ہے جو ہم دونوں کو شملہ پہاڑی سے ہوٹل میں لاتے تھے تو ہوٹل کے اس نیک دل منیجر کا بھی حصّہ ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ میں ہمیشہ ایک ہی لڑکی کے ساتھ وہاں آتا ہوں اور اُس لڑکی سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ آج وہ اپنے کاؤنٹر پہ بیٹھا یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوگا کہ ہماری شادی ہوگئی ہوگی اور شیریں کی گود میں میرا بچّہ کھیل رہا ہوگا۔ اگر اُسے میرے انجام کی خبر ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ اُسے بے حد افسوس ہوگا۔

جس روز شیریں صبح کو نہ آسکتی ہم دوپہر کے شو فلم دیکھنے انگریزی سینما میں آجاتے۔ ہم باکس کے ٹکٹ لے کر اوپر دو نشستوں والے باکس میں جا بیٹھتے۔ اُدھر فلم شروع ہوتی اور ادھر ہم اپنی محبت بھری باتوں اور لذت آمیز ہم آغوشیوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ شیریں مجھ میں جذب ہو جاتی۔ اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ سینما کے باکس میں شیریں سارا وقت میری آغوش میں رہتی اور ہم ایک دوسرے کو دیوانوں کی طرح تکتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی پیار بھری باتیں کرتے رہتے اور جب باتیں ختم ہو جاتیں تو ایک دوسرے کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا کر پہروں پیار کرتے رہتے۔ جب ہمارے ہونٹ پیار کرتے کرتے شل ہو جاتے تو پھر باتیں کرنی شروع کر دیتے۔ لیکن ہم نے کبھی شرافت اور پاکیزگی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ میرے ہاتھ نے

کبھی ایسی جرأت نہیں کی تھی کہ وہ شیریں کے جسم کے نشیب و فراز میں بے لگام جانور کی طرح گھومتا پھرے۔ کیونکہ میں شیریں سے سچی محبت کرتا تھا اور سچی محبت میں انسان دوسرے کی عزت بھی کرتا ہے۔ احترام بھی کرتا ہے۔

ایک روز سینما کے باکس میں بیٹھے بیٹھے شیریں کو اتنا پیار کیا کہ وہ بے سُدھ سی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم لذّت و سرور کے نشے میں ڈوب گیا۔ جب ہم باکس سے باہر نکلے تو برآمدے میں سے گزرتے ہوئے شیریں نے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں نشے میں بھیگی ہوئی تھیں اور گہری ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رات بھر جاگ کر کوئی انتہائی پُر لطف داستان سنتی رہی ہے۔ وہ ذرا ذرا مسکرا بھی رہی تھی۔ یہ نظریں اتنی دلکش پیار بھری اور پُر سوز تھیں کہ میں وہیں برآمدے میں رُک گیا اور میں نے شیریں سے کہا:

"شیریں! ایک بار پھر میری طرف دیکھو۔"

شیریں نے ذرا شرما کر، ذرا مسکرا کر، نقاب اٹھایا اور اسی انداز سے اُن ہی نظروں اور اُن ہی آنکھوں سے پھر مجھے دیکھا۔ میں دل تھام کر رہ گیا میرا قلم یہاں ان نگاہوں کی چاشنی، لذّت اور محبت کے بھرپور جذبے کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں سُرخ، اورنج اور وائلٹ رنگوں سے اس کاغذ پر اُن آنکھوں کی تصویر بنا دوں لیکن

اُن آنکھوں میں جو آسمانی رنگ جھلک رہے تھے وہ میں کہاں سے لاؤں؟
وہ شیریں کی آنکھیں نہیں تھیں بلکہ گھنے جنگل کے درختوں میں چھپے ہوئے
دو چشمے تھے۔ دو جھیلیں تھیں جن کی سطح پر اُس روز سُرخ پنکھڑیوں والے
کنول تیر رہے تھے۔ شراب میں ڈوبے ہوئے گلاب کے دو پھول تھے،
جنھیں کسی ستم ظریف نے اٹھا کر مسجد کے منبر پر رکھ دیا تھا کیونکہ اُن آنکھوں
میں گندمی، گرم اور دہکتے ہوئے جسم کا پُراسرار بلاوا بھی تھا اور حیا کا تقدّس
بھی، آگ کے شعلے بھی تھے اور بہار کی پہلی بارش کی پھوار بھی تھی۔ میں ان
آنکھوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ شیریں نے مسکرا کر نقاب گرا لیا اور بولی:

"ہائے! کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا؟"

ہم سینما کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔

ریلوے سٹیشن والے ہوٹل میں ہم نے کم و بیش شیخوپورے والی محبت گاہ
کا نقشہ قائم کر لیا تھا۔ اگرچہ ہمیں یہاں ویسی بے فکری، فراغت اور تحفّظ
نصیب نہیں تھا۔ پھر بھی ہم نے وہ بات پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی تھی
ہوٹل کا یہ کمرہ دُوسری منزل پر تھا۔ ایک طرف بازار تھا اور عقبی جانب گیلری
تھی جو ہوٹل کے صحن کی طرف کھلتی تھی۔ یہاں بھی پلنگ میز کرسی وغیرہ موجود
تھے۔ میں سُوٹ کیس میں اپنا سلیپنگ سُوٹ ساتھ لاتا۔ یہاں آ کر میں سلیپنگ
سوٹ پہن لیتا۔ ہم ناشتہ منگوا کر کرتے۔ پھر فل سپیڈ پر پنکھا چھوڑ کر پلنگ پر

دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور باتیں شروع کر دیتے۔ دوپہر کو کھانا منگوا کر کھاتے اور کبھی شیریں لیٹ جاتی اور میں اس کے ہاتھوں کو سہلانے لگتا اور کبھی میں لیٹ جاتا اور شیریں میرے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی اور یا میری چھاتی پر سر رکھ کر مجھ سے محبت کی شیریں زبان میں پیاری پیاری باتیں کیا کرتی۔

ہم نے ۲۲ اگست کو اپنی محبت کی پہلی ملاقات کی سالگرہ منائی۔ ہم نے ایک دوسرے کو تحفے دیئے۔ شیریں نے مجھے ایک بڑی خوبصورت نیلی ٹائی دی۔ میں نے اُسے ایک بڑی خوبصورت نیلے رنگ کی لیٹر فائل دی۔ یہ میں لندن سے خرید کر لایا تھا۔ اس پر واٹرلو برج کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے اندر لیٹر پیڈ اور لفافے رکھے ہوئے تھے۔ یہ اگرچہ معمولی سی چیز تھی لیکن میں نے بڑی محبت سے شیریں کو دی اور کہا:

"شیریں! اگر کبھی تم مجھ سے جُدا ہو جاؤ اور کبھی تمھیں بھُولے سے میرا خیال آجائے تو مجھے اس پیڈ پر خط لکھ دیا کرنا۔"

شیریں نے میرے ہونٹوں پہ اپنی انگلی رکھ دی۔

"کیسی باتیں کرتے ہو شاہد! اگر یہ بات ہے تو میں یہ تحفہ کبھی قبول نہیں کروں گی۔ تم تو مجھے اپنے ساتھ محبت کی اُس منزل پر لے آئے ہو کہ یہاں مجھے تم ہی چھوڑ سکتے ہو میں کوشش بھی کروں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ اب تو

ہر بات میرے اختیار سے باہر ہو چکی ہے۔"

شیریں کا اس قدر شدید جذبہ دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ کیونکہ میں خود شیریں سے جدا ہونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ شیریں میری زندگی کا جزوِ اعظم بن کر رہ گئی تھی۔ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جب شیریں مجھ سے جدا ہو گی تو میری زندگی کس طرح گزرے گی اور میرے شب و روز کیسے بسر ہوں گے۔ میں اُن راہوں پر سے اکیلا کیسے گذروں گا جہاں سے کبھی ہم دونوں مل کر ہنستے مسکراتے گزرا کرتے تھے۔ میں آرٹسٹ ہوں اور آرٹسٹ ہمیشہ اپنے آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ مجھے تو شیریں کی صورت میں میرا آئیڈیل مل گیا تھا۔ اور مجھ سے میرا آئیڈیل جُدا کرنا تو میرے جسم سے میری روح کو الگ کرنے کے برابر تھا۔ میرا سانس تو اب شیریں کے سانس کے ساتھ چلتا تھا اور دل شیریں کے دل کے ساتھ ہی دھڑکتا تھا۔ میں تو اُس کی ایک پل کی جُدائی بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

ہماری محبّت کی عمر دو سال کی ہو گئی۔

ان دو سالوں میں ہم نے محبت کے تمام ابتدائی اور درمیانی مراحل طے کر لیے۔ اب ہم اس مقام پر تھے کہ یا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں اور یا ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں۔ شیریں محبت میں مجھ سے دو قدم آگے تھی۔ جیسا کہ اُس کے سلوک، اُس کی حالت، اُس کی باتوں اور اُس کے

جرأت مندانہ اقدام اور محبت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے خطوط سے ظاہر ہوتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی اُس نے شادی کا ذکر چھیڑا تھا۔ اب پھر اُس نے مجھ سے شادی کی بات شروع کر دی۔ ہم نے دو سال کا عرصہ بڑے جوش و خروش، بڑی تیزی اور بھرپور جذبات کے والہانہ پن میں گذارا تھا۔ اس اثنا میں گرمیاں بھی آئیں۔ سردیاں بھی آئیں۔ ساون کی برساتیں بھی آئیں۔ ہم شہر میں جگہ جگہ ملے۔ ہر اچھے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ باتیں کیں۔ محبت کی قسمیں کھائیں۔ ہمارا پیار کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اس مدت میں کسی لغزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہماری محبت تو دو بچوں کی معصوم اور پاکیزہ دوستی تھی جو ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے وادیوں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہوں۔

شیریں کی محبت، اُس کا پیار، اُس کا قُرب، اس کی رفاقت میرا سرمایۂ حیات تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک غریب فن کار ہوں اور اگرچہ میں شیریں کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی میں شیریں کو اپنے پیار اور خلوص کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہوں؟ میری زندگی کی یہ تنہا تمنّا تھی کہ وہ میری زندگی کی ساتھی بنے۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ میری زندگی میں داخل ہو کر شیریں کو میری بدنصیبیاں بھی اپنے دامن میں لے لیں۔ دو سال کی رفاقت میں میں نے شیریں پر ثابت کر دیا کہ ایک فنکار کی

محبت کیا ہوتی ہے۔ اُس کا پیار کس شدّت کا ہوتا ہے اور عام لوگوں سے کس حد تک مختلف ہوتا ہے۔ فن کار اپنے آئیڈیل کو کبھی فریب نہیں دیتا۔ کبھی اُسے اندھیرے میں نہیں رکھتا۔ میں نے جس آئیڈیل کا اتنے برس انتظار کیا جس کی تلاش میں میں نے یورپ اور ایشیا کا چپّہ چپّہ چھان مارا اور ناکام و نامراد واپس لوٹا۔ تو میں اُس کے مل جانے پر اُسے کیونکر دھوکا دے سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے محبت کے اس طویل عرصے میں شیریں پر اپنی ہر کمزوری، ہر اچھائی بُرائی، اپنی زندگی کا ہر نمایاں اور پوشیدہ پہلو عیاں کر دیا۔ اُسے پوری طرح روشنی میں لاکر کھڑا کر دیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود شیریں نے سٹیشن والے ہوٹل کے کمرے میں میرے سامنے بیٹھے کہا:

"میں صرف اتنا جانتی ہوں شاہد کہ اگر میں تمھاری نہ ہو سکی تو چھ ماہ کے اندر اندر کسی سینی ٹوریم میں چلی جاؤں گی۔ پھر میں دُنیا میں کسی کی بھی نہ بن سکوں گی۔ پھر میں زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں گی۔"

میں اتنی خوبصورت اور نازک اندام لڑکی کو سینی ٹوریم میں نہیں دیکھ سکتا تھا میں اپنے بیش قیمت اور انمول آئیڈیل کو زہر کھا کر موت کی آغوش میں جاتے کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے اُسے قدم قدم پر روکا اور ازدواجی زندگی کے حقائق اور تلخیوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُسے بتایا:

"شیریں! ازدواجی زندگی کے رشتے میں منسلک ہونے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ سمجھ لو۔ شاید میں تمھارے لائق ثابت نہ ہوسکوں شیریں ___ میں کچھ عجیب نصیب لے کر اس دنیا میں آیا ہوں۔ مجھے تم سے پہلے کبھی دائمی محبت اور سکون میسّر نہیں آیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد تم کسی وجہ سے مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔ اور میری زندگی ایک بار پھر اندھیری رات بن کر رہ جائے۔ ابھی تو مجھے تمھارا قرب اور تمھاری محبّت دونوں نعمتیں میّسر ہیں۔ پھر کہیں میں ان سے بھی محروم نہ ہو جاؤں۔ تم خوبصورت ہو۔ کنواری ہو۔ پڑھی لکھی ہو۔ اچھے ماں باپ کی بیٹی ہو۔ تمھیں اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔"

اس پر شیریں نے طنزیہ انداز میں کہا:

"تم ایک دفتر کیوں نہیں کھول لیتے جہاں بیٹھ کر شادی کے خواہش مند جوڑوں کو نصیحتیں کیا کرو۔ تم اس دفتر کا نام "ادارۂ نصیحتِ شادی" رکھ لینا۔

میں خاموش ہو گیا اور پائپ کا تمبا کو انگوٹھے سے دبانے لگا۔ میں نے ایک بار پھر شیریں سے کہا:

"شادی محبت سے ذرا مختلف شے ہوتی ہے شیریں۔ شادی کی پہلی ہی رات میں دلہن کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور وہ صبح کو ایک بالکل نئے روپ میں اجاگر ہوتی ہے۔ تم اب اگر چاہو تو مجھ سے الگ ہو سکتی ہو لیکن شادی کے بعد میں کسی قیمت پر بھی تمھیں چھوڑنا گوارا نہیں کروں گا۔"

شیریں نے سر اٹھا کر کہا :

"میرا دماغ خراب ہے جو میں شادی کے بعد میں تمھیں چھوڑ دوں گی،
کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ آدمی جان جوکھوں میں ڈال کر ایک شے کی جد وجہد
کرے اور جب وہ شے حاصل ہو جائے تو اُسے چھوڑ دے ؟ بھلا یہ کیسے
ممکن ہے شاہد کہ میں تمھیں پانے کے بعد چھوڑ دوں ؟"

میں نے کہا :

"شیریں ! دیکھو شادی سے پہلے لڑکی والوں کی بہت سی شرائط ہوتی
ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں تمھاری شرطیں کہاں تک پوری ۔ ۔ ۔ ۔"

شیریں نے بات کاٹ کر کہا :

"میری صرف دو شرطیں ہیں۔"

میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"کونسی ؟"

شیریں نے انگلی اٹھا کر کہا :

"پہلی یہ کہ تم شادی کے بعد مجھے اس سے بھی بڑھ کر پیار کرو گے۔"

"اور دوسری ؟"

شیریں دوسری اُنگلی اُٹھاتے ہوئے بولی :

"دوسری یہ کہ تم کبھی مجھے نہیں چھوڑو گے چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔

چاہیے ہماری زندگیوں میں کیسا ہی طوفان کیوں نہ آجائے۔ کیا تمھیں یہ شرطیں منظور ہیں شاہد؟"

میں نے شیریں کو اپنے گلے سے لگا لیا:

"تم انھیں شرطیں کہتی ہو۔ یہ تو میری زندگی کے مقاصد ہیں۔ یہ تو میری بہترین خواہشات ہیں۔ میں جو تم سے ایک پل کی جدائی گوارا نہیں کر سکتا۔ تمھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں، میں تو ایسا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔"

شیریں نے اپنا سر پلنگ کی پشت سے لگا دیا اور کہنے لگی:

"میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے اس قدر پسند کرتے ہو۔ مجھے اس قدر چاہتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اب اگر میں تمھیں چھوڑنا بھی چاہوں تو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ کیوں؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ کچھ عجیب سے احساسات ہیں۔ کچھ عجیب سے خیالات ہیں جو مجھے گھیر لیتے ہیں۔ میں اُن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ میں انھیں دُور ہٹانا چاہتی ہوں لیکن نہیں ہٹا سکتی۔ سب کچھ جانتے ہوئے، سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی میں جذبات میں بہہ جاتی ہوں۔ نہیں نہیں انھیں جذبات مت کہو۔ خدا جانے یہ کیا ہے جو مجھے سماج اور ماحول سے خوف نہیں کھانے دیتا۔ تمام باتیں ایک طرف ہیں اور میرا دل ایک طرف ہے۔ دل کچھ سمجھاتا ہے، دماغ کچھ اور سمجھاتا ہے مگر جیت دل ہی کی ہوتی ہے۔ پھر میں ایک فیصلہ کر لیتی ہوں کہ میں اگر تمھاری نہ ہو سکی تو کسی کی بھی نہ ہو سکوں گی۔

چاہے مجھے خودکشی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ حرام موت ہی کیوں نہ مرنا پڑے مگر میں ایسی زندگی قبول نہیں کر سکتی جو مجھے فریب سکھائے۔ دل کسی اور کو چاہے مگر کسی دوسرے کے آگے فریب اور دکھاوے سے کام لینا پڑے میں اپنے احساسات کو تباہ نہیں کروں گی اور نہ ہی اُس تخلیقی دُنیا کو جو میرے ذہن میں مدت سے آباد ہے۔ ایک خوبصورت وادی میں چھوٹا سا گھر۔ صاف ستھرا سبزہ۔ سفید پھول۔ چشمہ اور پھر بانسری کی میٹھی تان جو اس وقت بھی مجھے صاف سُنائی دیتی ہے اور پھر جب تم ملے تو اس دُنیا میں بہار آگئی۔ پہلے میں اکیلی تھی۔ اب تم بھی میری دنیا میں آگئے تھے۔ میں تو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی ہوں شاہد — پھر میں تمھیں چھوڑ کر بدنصیبی کے گہرے کھڈ میں کیوں گروں ؟ جبکہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں دُنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں ایک لڑکی کی یہی خوش قسمتی ہُوا کرتی ہے کہ کوئی اُسے بے حد پیار کرے۔ بس اُسی کا ہو رہے۔ اُسے کبھی دھوکا نہ دے۔ کبھی فریب نہ کھیلے۔ اُس کی عزت کرے۔ اُس کا احترام کرے۔ مجھے یہ سب کچھ میسّر ہے۔ خدا جانے وہ گھڑی کب آئے گی۔ جب میں ہمیشہ کے لیے تمھاری ہو جاؤں گی۔ جب میرا پیار اپنی منزل کو پالے گا۔ جانے یہ تڑپتا ہُوا دل کب سکون پائے گا۔ جب اس کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہو گی۔ مجھے یہ سکون صرف تمھاری باہوں میں آنے سے ہی ملتا ہے۔ تمھارے سینے سے لگ کر مجھے گویا جنّت مل جاتی ہے۔ میں اس کا

شکر کیوں نہ ادا کروں۔ میں اُس پیار کی کیوں نہ قدر کروں جو مجھے بے بہا نعمتوں سے نوازتا ہے۔ ورنہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو تمہاری ایک ادنی اپجارن ہوں اور اگر دیوتا اُسے اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ تو یہ دیوتا کی کرم نوازی ہے۔ اُس کی بخشش ہے۔ مجھے تو تم آکاش پر جگمگانے والا چاند دکھائی دیتے ہو۔ جسے دھرتی حسرت سے تکتی ہے اور پیار بھری نظروں سے بھی۔ کیونکہ وہ اُس کو اپنی نور بھری کرنوں سے جگمگاتا ہے اور دھرتی کی ہر چیز اُسے عقیدت بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

بالکل یہی حالت میری ہے شاہد۔ میں زمین کی طرح پستی سے آکاش پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھتی ہوں اور خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اپنی باہیں پھیلا کر تمھیں اپنی آغوش میں لے لوں۔ مگر دل ضرور چاہتا ہے کہ وہ تم کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر پاس رکھ لے۔ شاہد! تم نے مجھے پستی سے بلندی کی طرف لا کھڑا کیا ہے۔ تم نے مجھے خوبصورت اور پُر نزاکت بنا دیا۔ تم نے میرے ذہن کو سرور، آنکھوں کو خمار اور روح کو روشنی عطا کی ہے۔ تم نے اتنا کچھ مجھے دے دیا ہے کہ اگر میں اپنی ساری زندگی بھی تمھیں دے دوں تو تمہارے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ اگر ساری عمر تمہارے پاؤں دھوتی رہوں تب بھی میں تمہاری محبت کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ کاش میری روح تمھیں سُکھ دے سکے۔ مگر تم مجھ سے

اتنی دُور رہو کہ اپنے دل کی حسرتیں پوری نہیں کر سکتی۔ جب پاس ہوتے ہو تب بھی یہ دُوری درمیان میں حائل رہتی ہے۔ یہ احساس میرے ذہن کو اس قدر ماؤف کر دیتا ہے کہ مجھے خیال بھی نہیں رہتا کہ مجھے کب گھر واپس جانا ہے۔ جانا بھی ہے یا نہیں؟"

شیریں خاموش ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے گویا اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اُس نے اپنے دل کی پوشیدہ وادی پر سے بادل ہٹا کر ایک ایک کلی، ایک ایک پھُول اور ایک ایک پنکھڑی کا نظارہ کروا دیا تھا۔ میں اُٹھ کر شیریں کے پاس پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے شیریں کا خوبصورت خیالات سے بھرا ہُوا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"شیریں! اگر تم محبت میں اتنی شدّت سے ثابت قدم ہو اور تمہاری زندگی واقعی میرے بغیر ایک ویران رہگذر کی طرح ہو گی تو میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ بلکہ میری تو خود زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ۔ میں صرف اس خیال سے ڈرتا تھا کہ کہیں حالات سے مجبور ہو کر تم شادی کے بعد مجھ سے کشیدہ نہ ہو جاؤ۔ پھر میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ پھر میں تمہیں دوبارہ کبھی نہ پا سکوں گا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا میری جان! میرے شاہد۔"

اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور ہمارے ہونٹ ایک دوسرے کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے۔ جسم مل گئے۔ دل مل گئے۔ گویا کھوئے ہوئے خزانے مل گئے۔ ڈوبے ہوئے ستارے مل گئے۔ بھولے ہوئے دوست مل گئے۔ آسمان و زمین مل گئے۔ ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

۸

طے یہ پایا کہ پہلے نکاح کر لیا جائے۔

اور رخصتی اُس وقت ہو جب شیریں کے گھر والے اُسے کہیں شادی کرنے پر مجبور کریں۔ پھر وہ انھیں جب یہ بتا دے گی کہ اُس کی تو پہلے ہی سے شادی ہو چکی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کے گھر بھر میں ہنگامہ ضرور اُٹھے گا لیکن وہ اُس کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے اور نکاح نامے کی موجودگی میں اُس کی کسی دوسری جگہ شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا اور انھیں ہر حالت میں شیریں کو میرے ساتھ رخصت کرنا پڑے گا۔ شیریں کے والدین کا خیال تھا کہ ایف اے کے بعد اس کی شادی کریں گے اس مقصد کے لیے اُنھوں نے اپنے ہی رشتہ داروں میں ایک جگہ منہ زبانی بات کر رکھی تھی۔

ادھر میرے ماں باپ نے بھی میری شادی کے لیے رشتہ داروں میں ایک لڑکی کو دیکھ رکھا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ بڑی بوڑھیوں نے آپس میں بات طے کر لی ہے اور جب ان لوگوں کو معلوم ہُوا کہ میں وہاں شادی نہیں کرنا چاہتا تو یہاں بھی ایک طوفان اُٹھے گا۔ چنانچہ ان حالات کی روشنی میں ہم نے پروگرام یہ بنایا کہ چپکے سے نکاح کر کے نکاح نامے اپنے اپنے پاس رکھ لیے جائیں اور جب موزوں وقت آئے تو شادی کا اعلان کر دیا جائے اور پھر جائز اور باعزت طریقے سے رخصتی ہو۔ کیونکہ نہ میں یہ چاہتا تھا کہ شیریں کو بھگا کر لے جاؤں اور نہ شیریں ہی یہ چاہتی تھی کہ وہ ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا کر میرے پاس بھاگ کر چلی آئے اور دنیا بھر میں بدنامی کا ڈھنڈورا پیٹے۔

میں نے ان تمام حالات کا اپنے دوست سے ذکر کر دیا اور اپنی محبت اور اپنے عزائم سے اُسے باخبر کر دیا۔ میری محبت کا تو اُسے علم ہی تھا۔ جب اُسے معلوم ہُوا کہ ہم دونوں بہ رضا و رغبت نکاح کر لینا چاہتے ہیں تو اُس نے کہا کہ وہ میری ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہے۔ میرے اس دوست کا نام سرفراز تھا۔ اُس کی بھی حال ہی میں محبت کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیوی عشرت، اپنی والدہ، اپنے چھوٹے بھائی اور ایک نوکر کے ساتھ مزنگ کے مغربی علاقے میں اپنے ذاتی مکان میں رہ رہا تھا۔ سرفراز میرا

بڑی دیر کا دوست تھا اور میں ہر اتوار کو اُس سے ملنے اُن کے گھر جایا کرتا۔ اُس کی بیوی یعنی میری بھابی میرا بڑا احترام کرتی تھی اور اُن کے گھر والے مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ سرفراز کے ساتھ میرے بڑے دیرینہ تعلقات تھے۔ ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں اور اچھائیوں سے اچھی طرح باخبر تھے اور ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ یُوں سمجھ لیجئے کہ اُس سے بڑھ کر اس شہر میں میرا اور کوئی دوست نہیں تھا۔ میں نے اپنی محبت کا سارا حال بھابی کے سامنے بھی کھول دیا۔ بھابی عشرت بڑی کھلے دل کی خوش اخلاق عورت تھی اور چونکہ وہ خود محبت کے درد سہہ چکی تھی اور محض سرفراز سے محبت ہونے کی وجہ سے اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُس کے پاس آ گئی تھی اس لیے اُسے مجھ سے اور شیریں سے بڑی ہمدردی ہو گئی۔

اس دوران میں میں ایک روز شیریں کو اُن کے ہاں لے گیا۔ میں سکوٹر پر پہلے پہنچ گیا۔ شیریں کو میں نے گھر سے کوئی نصف فرلانگ کے فاصلے پر چوک میں ایک طرف کھڑا کیا۔ گھر جا کر میں نے سرفراز کے چھوٹے بھائی پرویز سے کہا کہ وہ چوک میں کھڑی شیریں کو اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ پرویز نے سر ہلا کر کہا۔

”بہت اچھا بھاجی۔“

اور شیریں کو لینے باہر نکل گیا۔ میں سرفراز اور بھابی کے ساتھ کمرے میں

بیٹھ گیا۔ پرویز اگرچہ سرفراز کا چھوٹا بھائی تھا لیکن وہ سرفراز کی طرح صاف ستھرا، صحت مند اور اَپ ٹو ڈیٹ نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس کچھ غلیظ، دُبلا پتلا اور آلکسی سا تھا۔ اُسے دیکھ کر آدمی کو خواہ مخواہ یہ خیال ہوتا کہ زندگی میں سوائے نااُمیدیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگرچہ سرفراز بھی غیر آرٹسٹ مزاج کا مالک تھا لیکن محض کاروباری ذہن ہی نہیں رکھتا تھا، اُسے کپڑے پہننے کا اور دوستی نبھانے کا سلیقہ بھی تھا۔ لیکن پرویز کے کپڑے تقریباً گندے ہوتے۔ وہ لسّی پی کر سب کے سامنے زور سے ڈکار مارتا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ مجھے یقین ہے اگر سرفراز کی جگہ وہ میرا دوست ہوتا تو آج میں انگلش فرم میں آرٹسٹ نہ ہوتا بلکہ بھاٹی دروازے کے باہر میری حلوائی کی دکان ہوتی اور شیریں سے محبت کرنے کی بجائے میں نے ایک دُنبہ اور درجن بھر بٹیرے پال رکھے ہوتے۔ پھر بھی پرویز میری عزّت کرتا تھا اور میری آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ مصیبت صرف اتنی تھی کہ وہ سُست بہت تھا اور بات سُن کر یُوں چپکا ہو کر بیٹھ رہتا جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں یا ابھی تک الفاظ ہوا کی لہروں پر سے ہو کر اُس کے کانوں تک نہیں پہنچے۔ پھر جب دُوسری بار بات دُہرائی جاتی تو وہ چونک کر کہتا:

"جی بھا جی ــ"

پرویز محکمہ نہر میں کہیں ملازم تھا اور اس کا کام نہروں کی پیمائش اور

دیکھ بھال کرتا تھا۔ لیکن وہ ہفتے میں صرف ایک روز دو تین گھنٹوں کے لیے کام پر جاتا اور باقی سارا دن وہ گھر پہ بیٹھا یا تو نوکر سے تاش کھیلتا رہتا۔ یا سویا رہتا اور ریالسّی کے کٹورے پی پی کر کمروں میں ڈکاریں مارتا پھرتا۔

پرویز چوک میں گیا۔ اُس نے کالے بُرقعے میں لپٹی لپٹائی ایک پتلی دُبلی نازک سی لڑکی کو دیکھا۔ سمجھ گیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جسے لینے اسے بھیجا گیا ہے۔ چُنانچہ قریب جا کر بولا:

"میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں باجی۔"

شیریں سمجھ گئی کہ اُسے میں نے ہی بھیجا ہے۔ میں نے شیریں کا تعارف سرفراز کی والدہ جو کہ انتہائی نیک دل اور مشفق خاتون تھیں سے کرایا۔ اُسے بھابی عشرت سے ملوایا۔ سرفراز کا اُسے نام بتایا۔ شیریں سے عشرت بھابی نے باتیں شروع کر دیں۔ شیریں شرما رہی تھی۔ کیونکہ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ اس گھر میں سب لوگوں کو علم ہے کہ وہ شاہد کی محبوبہ ہے اور اُنھوں نے خفیہ طریقے سے نکاح کرا لینے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ عشرت بھابی نے چائے تیار کروائی۔ ہم نے چائے اکٹھے بیٹھ کر پی۔ اُس روز میں بڑا خوش تھا کیونکہ میں نے شیریں کو اُن لوگوں سے ملوایا تھا جن کی میں بے حد عزت کرتا تھا اور جن کو میں بے حد پسند کرتا تھا۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ مارچ کا مہینہ ہو گا۔ اُس مکان کے پچھواڑے قبرستان

لگتا تھا۔ وہاں کیکر کے بینگے ٹیڑھے درختوں کے درمیان اونچی نیچی قبریں تھیں۔ ان کیکر کے درختوں پر بسنتی بسنتی پھول آئے ہوئے تھے اور ان کی گہری گہری خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوشبو میں کچھ اداسی اور کچھ ویرانی کا احساس تھا۔ میرا خیال ہے۔ شاید اسی لیے کیکر کا درخت ہمیشہ ویرانوں میں اُگتا ہے لیکن بھابی عشرت کے کمرے میں زندگی کی بھرپور رونق تھی۔ اور وہاں کسی قسم کی اداسی کا خیال گذر بھی نہیں سکتا تھا۔

چائے پینے اور کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہنے کے بعد میں اور شیریں وہاں سے واپس آ گئے۔ میں شیریں کو بس سٹاپ تک چھوڑنے گیا۔ ہم حسبِ عادت یہاں بھی کھڑے ہو کر اپنی پیاری پیاری باتیں کرتے رہے اور کتنی ہی بسیں گزر گئیں۔ آخر شیریں ایک بس میں سوار ہو گئی۔ اس نے حسبِ معمول کھڑکی میں سے تھوڑا سا نقاب اُٹھا کر مجھے مسکرا کر الوداعی سلام کیا اور اس کی بس میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

جس روز ہمیں چھپ چھپا کر نکاح کرنا تھا۔ اس سے ایک روز پہلے میں شیریں سے ملا۔ ہم دونوں کیسینو ہوٹل کے کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے شیریں کا ہاتھ تھام لیا۔

"شیریں! کیا تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھا رہی ہو نا ں؟ کہیں بعد میں پچھتانے تو نہیں لگو گی؟"

شیریں نے میری طرف پُر اعتماد نظروں سے دیکھ کر کہا :
"کیسی باتیں کرتے ہو شاہد؟ میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اتنا بڑا اقدام اُٹھانے سے پہلے اُس کے تمام پہلوؤں پر غور نہ کر لوں۔ میں نے پوری طرح سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور میں مرتے دم تک اپنے فیصلے پر قائم رہوں گی اور کبھی نہیں پچھتاؤں گی۔"

مجھے شیریں کے عزم کی اس پائداری اور پختگی سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ شیریں کبھی اپنے فیصلے پر پشیمان نہ ہو اور اُسے زندگی میں کبھی یہ احساس نہ ہو کہ اُس نے شاہد سے شادی کر کے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ شیریں کو اپنے تمام حالات سے باخبر کر دوں اور میں نے اُسے آگاہ کر دیا تھا۔

"شیریں! میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ ایک سفید پوش آرٹسٹ ہوں تمھیں محل، کوٹھیاں اور کاریں نہ دے سکوں گا۔ تمھیں ہوائی جہاز میں بٹھا کر یورپ کی سیریں نہ کروا سکوں گا۔ لیکن رات رات بھر جاگ کر تمھارے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہو سکتا ہوں۔ اتنا تم سے ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں سوائے تمھارے اور کسی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہِ عظیم سمجھوں گا۔ ویسے بھی میں ایسی باتیں سوچ ہی نہیں سکتا شیریں۔ تم تو میرے ماضی، حال، مستقبل اور ہوش و حواس پر چھا گئی ہو۔ میں تمھیں ہر دور

میں اپنے ساتھ دیکھتا ہوں۔"

شیریں کہنے لگی :

"میں کتنی خوش قسمت ہوں شاہد کہ مجھے تمہارا سارے کا سارا پیار مل گیا ہے۔ تم اپنی کمزوریوں کا ذکر مت کیا کرو۔ میں تو تمہاری خوبیوں سے زیادہ تمہاری کمزوریوں سے پیار کرتی ہوں۔ تم اگر مجھے صرف اپنا خلوص اور پیار ہی دے سکو گے تو مجھے تمہارے خلوص اور پیار کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے ایسا خاوند نہیں چاہیے جو مجھے اطلس و کمخواب کے بستر پر سُلا کر میرے ارد گرد تین تین خادمائیں کھڑی کر دے اور خود کسی شراب خانے میں جا سوئے۔ میں تو صرف محبت اور پیار چاہتی ہوں چاہے اس کے لیے مجھے اپنی زندگی کی ساری آسائشیں کیوں نہ قربان کرنی پڑیں۔"

حقیقت یہ تھی کہ ہم دونوں خوش قسمت تھے جنھیں ایک دوسرے کا اتنا شدید اور ناقابلِ شکست پیار مل گیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پانے کے لیے دُنیا کی ہر قیمتی سے قیمتی شے کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شیریں نے مجھے ایک روز بتایا تھا کہ اُن کے کوئی رشتہ دار ملک صاحب ہیں جو شیریں سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر امّی کو یہ رشتہ منظور نہیں کیونکہ ملک صاحب کی عمر چالیس کے قریب ہے۔ اگرچہ وہ بہت بڑے ٹھیکیدار

ہیں اور اُن کے پاس کوٹھی کے علاوہ کار بھی ہے۔

"وہ تو مجھ سے محبت کر رہے ہیں۔ ایک روز کیا ہُوا کہ وہ ہمیں کار میں بٹھلا کر اپنی والدہ سے ملوانے لے گئے۔ وہ خود کار چلا رہے تھے۔ میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی کہ ملک صاحب نے اپنا ایک پاؤں میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار لگی۔ میں نے فوراً پاؤں جھٹک دیا۔"

اگرچہ شیریں کو یقین تھا کہ اس کی امّی یہ رشتہ منظور نہیں کرے گی۔ پھر بھی وہ ڈرتی تھی کہ کہیں امّی ابّا کے سامنے بے بس نہ ہو جائے۔ کیونکہ شیریں کے والد کا کچھ کچھ خیال وہاں شادی کرنے کا ہو رہا تھا۔ اس خیال سے شیریں نے مجھ سے نکاح کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے شیریں کو اُس روز یہ بھی بتایا کہ میں ایک غریب فنکار ہوں اور میں شیریں کو رخصتی کے بعد بھی ابھی اپنے گھر نہ لے جا سکوں گا کیونکہ میرے حالات ایسے نہیں ہیں۔ میں اُسے الگ مکان میں رکھنے پر مجبور رہوں گا۔

"اب بھی سوچ لو شیریں۔ کہیں بعد میں مجھے یہ نہ کہنا کہ شاہد مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

"مجھے تم ہر حالت میں قبول ہو شاہد۔ اگر تم مجھے الگ بھی رکھو گے تو میں اس پر تیار ہوں۔ میں تمھارے پاس رہوں گی ناں۔ تم میرے تو ہو گے ناں۔"

"میں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھارا ہوں شیریں۔ میں تو تمھارے بغیر زندہ رہنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن ہو سکتا ہے میں اچھا دوست ہونے کے علاوہ اچھّا خاوند ثابت نہ ہو سکوں۔"

"پھر بھی میں صرف تم سے اور صرف تم سے شادی کروں گی۔ خواہ ساری دُنیا میرے خلاف کیوں نہ ہو جائے۔ میں عہد کر چکی ہوں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

اب مزید گفتگو اور بحث و دلائل کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے سرفراز کے ساتھ مل کر ایک مولوی کا بندوبست کیا جو اپنی مسجد میں ہمارا نکاح پڑھانے پر تیار ہو گیا۔

یہ مسجد میانی صاحب کے قبرستان کے جنوب مشرقی حصے میں ایک جگہ چھوٹی سی سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک اُونچے سے ٹیلے پر واقع تھی۔ جو راستہ اس مسجد کی سیڑھیوں تک جاتا تھا وہ پختہ اینٹوں کا تھا۔ اُس کی دونوں جانب نیم اور شیشم کے درخت تھے اور مختلف احاطے تھے جن میں مختلف خاندانوں کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ مولوی صاحب بڑے شریف آدمی تھے۔ اُنھوں نے کہا:

"لڑکی کو مجھے تحریر لکھ کر دینی ہو گی کہ وہ اپنی خوشی سے بہ قائمیِ ہوش و حواس یہ شادی کر رہی ہے اور اُس کے نتائج و عواقب کی ساری ذمہ داری

اُس پر ہو گی ۔"

شیریں ایسی دس ہزار تحریریں لکھنے پر تیار تھی۔

نکاح کا دن ۱۳ مارچ طے ہوا۔ پروگرام کے مطابق شیریں کو پورے تین بجے بعد از دوپہر مزنگ چونگی والے بس سٹاپ پر آجانا تھا جہاں سے میرے ساتھ اُسے مسجد میں آکر نکاح پڑھوانا تھا۔ میرا دوست سمرفراز، اس کا چھوٹا بھائی، میرا ایک اور دوست ایاز اور میں پورے دو بجے مسجد میں نکاح نامے کی دو کاپیاں لے کر مولوی صاحب کے حجرے میں پہنچ گئے۔ مولوی صاحب نے نکاح نامے اپنے پاس رکھ لئے۔ ہم چھوہارے اور مٹھائی وغیرہ بھی لے گئے تھے۔

میں نے اپنے دوستوں کو وہیں چھوڑا اور خود پورے پونے تین بجے سکوٹر پر بیٹھ کر مزنگ چونگی کے بس سٹاپ پر آگیا۔ تین بج گئے۔ کئی بسیں آکر گزر گئیں مگر شیریں کہیں دکھائی نہ دی۔ گرمی کی وجہ سے مجھے پسینہ آیا ہوا تھا اور میں پریشان بھی ہونے لگا تھا کہیں شیریں نے ارادہ بدل تو نہیں لیا؟ اگر ایسا ہوا تو بڑی بدنامی اور بے عزتی کی بات ہو گی۔ میں نے تو سارا انتظام کر رکھا ہے۔ خدا کرے کہ اگلی بس میں شیریں آجائے۔

دوسری بس آئی تو اُس میں سے شیریں اُتری۔ اُسے دیکھتے ہی میری جان میں جان آگئی اور میرے سارے تفکرات خوشی اور فخر میں تبدیل ہو گئے۔

شیریں واقعی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور وہ اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھی۔ شیریں نے بُرقع اوڑھ رکھا تھا مگر وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ گھر میں مہمان آگئے تھے اور وہ بڑی مشکل سے اُٹھ کر آئی ہے۔ میں نے شیریں کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے اتنی گرمی میں اس قدر کوفت برداشت کی۔

"نہیں شاہد! یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں تو گھر میں رُک ہی نہیں سکتی تھی۔"

میں اُسے سکوٹر کے پیچھے بٹھلا کر مسجد میں لے آیا۔ ہم نے مسجد کی سیڑھیاں طے کیں اور مولوی صاحب کے حجرے میں آگئے۔ میرے دوست اور مولوی صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شیریں ماں باپ کی محبت اور فرمانبرداری کو تیاگ کر میرے ساتھ نکاح کرنے آئی تھی۔ اُس نے میری محبّت کی خاطر محض اپنی ذمّہ داری پر میرے ساتھ شادی کا فیصلہ کیا تھا اور وہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اکیلی اُس کڑی دھوپ میں گھر سے چل کر وہاں آئی تھی۔ میں شیریں کے اِس ایثار اور قربانی سے بڑا متاثر ہوا۔

مولوی صاحب نے جھک کر پوچھا:

"بیٹی! خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کرو کہ میں جو پوچھوں گا۔ تم سچ بتاؤ گی۔"

شیریں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا:
"بیٹی! کیا تمھیں مجبور کر کے یا تم پر دباؤ ڈال کر تو نکاح نہیں کیا جا رہا ہے؟"

شیریں نے پُرعزم لہجے میں کہا:
"جی نہیں۔ میں اپنے ہوش و حواس اور عقل کے ساتھ اپنی مرضی اور رضا و رغبت سے یہ نکاح کر رہی ہوں۔ میں اپنی وکیل خود ہوں۔ میں اپنے اس فعل کی خود ذمّہ دار ہوں۔ میں بالغ ہوں اور میرے اس فعل کی کسی دوسرے پر ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی۔ میں اپنی مرضی سے یہ نکاح کر رہی ہوں۔"

"تو بیٹی اس سفید کاغذ پر مجھے یہی بات تحریری طور پر لکھ کر دے دو۔"

مولوی صاحب نے شیریں کو کاغذ دیا۔ شیریں نے اپنا پن نکال کر اُس کاغذ پر مندرجہ بالا باتیں لکھ کر نیچے اپنے دستخط کر دیئے۔ اس تحریر کو بڑے غور سے پڑھنے کے بعد مولوی صاحب نے تہہ کر کے اپنی صندوقچی میں رکھ لیا اور نکاح نامے کی خانہ پُری شروع کر دی۔

"حق مہر کتنا لکھوانا چاہتی ہو بیٹی؟"

"میں صرف دودھ کے پیالے پر نکاح کر سکتی ہوں۔"

"تو بیٹی میں حق مہر کی شرعی رقم لکھ دیتا ہوں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"نہیں بیٹی۔ مرضی تمہاری ہوگی۔"

"جی ہاں! میں راضی ہوں۔"

اِس کے بعد مولوی صاحب نے آیاتِ قرآنی پڑھنا شروع کر دیں۔ چاروں کلمات کا ورد کیا اور ہمارا نکاح کر دیا گیا۔ ہم نے نکاح نامے پر باری باری دستخط کر دیئے۔ نکاح ہو گیا۔ گواہوں کی جگہ میرے دوستوں نے دستخط کیے۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ شیریں نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور شرما کر نظریں جھکا لیں۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں اُس وقت اپنے آپ کو دُنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اُس وقت میری خوش بختی کا ستارہ اوج پر تھا۔ اپنی انتہائی بلندی پر تھا میرا ستارہ تو سُورج بن کر آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا اور اُس کی چمک دمک میں کوئی ستارہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مہمانوں میں چھوہارے اور مٹھائی تقسیم کی گئی۔ مسجد کے ساتھ ہی چند ایک کچے مکانوں میں کچھ غریب خاندان آباد تھے۔ میں نے وہاں بھی مٹھائی اور چھوہارے بھجوائے۔ کچھ اُن کے بچوّں میں تقسیم کر دیئے۔ ہم لوگ شادمان و کامران اُس چھوٹی سی پیاری پیاری مسجد سے باہر نکلے۔ میرے دوستوں نے باہر نکل کر ہم دونوں کو پھر ایک بار مبارک باد دی اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

میں نے شیریں کو سکوٹر پر بٹھلایا اور اُسے مزنگ چونگی والے بس سٹاپ پر

چھوڑنے آگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ہم کہیں بیٹھ کر اپنی شادی کی خوشی میں کچھ جشن منائیں گے۔ لیکن شیریں نے کہا:

"کل سہی۔ آج میں بڑی مشکل سے نکل کر آئی ہوں۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور میں چھوٹے بھائی کو ایک سہیلی کے گھر بٹھلا کر آئی ہوں۔"

میں نے شیریں کی آنکھوں میں جھانک کر کہا:

"شادی مبارک ہو۔"

شیریں کچھ مسکرائی اور شرما گئی۔ اتنے میں بس آگئی اور وہ اُس میں سوار ہو کر روز کی طرح مجھ سے جدا ہو گئی مگر آج اُس کی جدائی کا مجھے اتنا غم نہیں تھا۔ آج وہ ہمیشہ کے لیے میری بیوی بن چکی تھی اور مجھے احساس تھا کہ وہ جہاں بھی رہے گی میری شرعی اور جائز بیوی بن کر ہی رہے گی اور دُنیا کی کوئی طاقت اب اُسے مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ مجھ سے الگ ہو کر اُس کا بس میں سوار ہو کر جانا بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ایک دن کے لیے مجھ سے سنگر کی مشین یا بجلی کا پنکھا عاریتاً مانگ لے اور مجھے یقین ہو کہ رات کو یا کل میری چیز واپس میرے پاس آجائے گی۔

دوسرے روز ہم نے لارنس کے کیبن میں بیٹھ کر اپنی شادی کا جشن منایا۔ وہاں خوب چائے کیک اڑائے اور کھانا کیسنو میں بیٹھ کر کھایا۔ میں نے شرارت سے کہا:

"حقیقت میں ہمارا آج ولیمہ ہونا چاہیئے تھا۔"

شیریں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

"کبھی وہ دن بھی تو آ ہی جائے گا شیریں۔"

شیریں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہم نے اُس روز وہاں بیٹھ کر اپنی محبت کی داستان کو ایک بار پھر شروع سے دُہرایا۔ ہم نے پھر اُس منزل کو دیکھا جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ پھر جن جن راستوں پر سے ہو کر یہاں تک پہنچے تھے۔ ہم نے اُن تمام گھاٹیوں اور نشیب و فراز کو دیکھا جن کو ہم نے اکٹھے عبور کیا تھا۔ ہم نے شگفتہ کا ذکر کیا۔ ہم نے ارجن ڈینا کی پہلی ملاقات کو یاد کیا۔ ہم نے اُن تمام خوشگوار لمحات کو آواز دی جو ہم نے کینال بنک والی نہر کے کنارے گزارے تھے۔ ہم نے شیخوپورے والی اپنی محبت گاہ کو یاد کیا۔ اپنے مخلص دوست کو یاد کیا۔ جس نے ہمارے لیے اپنی کوٹھی کھول دی تھی اور پہلے ہی روز شیریں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دیا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ تم میری بہن اور بیٹی کی جگہ ہو۔ اسے اپنا گھر سمجھو۔ تمھیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔"

ہم نے اُن دہقان زادیوں کے دھوپ میں چمکتے ہوئے چہرے یاد کیے جو ہمیں سکوٹر پر بیٹھے شیخوپورے کی جانب جاتے دیکھا کرتی تھیں اور سوچا کرتی تھیں کہ کیا شہروں میں بھی سچا پیار ہوتا ہے۔ اب انھیں یقین کر لینا چاہیئے کہ

شہروں میں بھی ہیر اور سوہنی پیدا ہو سکتی ہے۔ جس طرح سوہنی آدھی رات کو طوفانی دریا گھڑے پر پار کر کے آتی تھی۔ اُسی طرح شیریں بھی اپنے گھر سے اُس کڑکتی دوپہر کو اپنے ماں باپ کی عزت اور محبت اور ذمہ داریوں کا طوفانی سمندر پار کر کے مجھ سے بیاہ کرنے آئی تھی۔ اُس نے سوہنی سے کم قربانی نہیں دی تھی۔ اُس نے سوہنی سے کم خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اُس سے کم ایثار اور محبّت اور ارادے کی پختگی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ میں اُس روز شیریں کی عظمت اور وفا کا قائل ہو گیا تھا اور میرے دل میں اُس کی محبّت اور قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔

ہم نے اپنی ساری پُرانی یادوں کو ایک بار پھر سے تازہ کیا۔ میں نے شیریں سے پُوچھا:

"اب تم خوش ہو ناں شیریں؟ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہو ناں؟"

شیریں نے مسکرا کر کہا:

"بلکہ اُس سے بھی زیادہ شاہد! اب تم میرے دوست ہی نہیں۔ میری زندگی کے مالک بھی ہو۔ اب مجھ پر صرف تمھاری محبت ہی نہیں بلکہ خدمت بھی فرض ہے۔"

میں نے کہا:

"فرض کی بات نہیں شیریں ــــ میں تمھارے دل کی بات تم سے پُوچھ رہا ہوں۔"

"دل تو پہلے دن سے تمہارا تھا شاہد اور آخری دن تک تمہارا ہی رہے گا۔"

چار بجے شیریں — یعنی میری بیوی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔

میں اُسے چھوڑنے بس سٹاپ تک گیا۔

ہم نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک رخصتی نہیں ہوتی ایک دوسرے کے دوست ہی رہیں گے اور ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم نہیں ہوگا اور ہم اس عہد پہ قائم تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ ایف اے کا امتحان دے رہی تھی اور دوسرے ابھی شیریں کے گھر میں ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے کہ وہ اپنی شادی کا راز اُن پر کھول دے۔

اس دوران میں ہم آپس میں ملتے رہے۔ شیریں اب میری دوست ہی نہیں میری بیوی بھی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں دوستی کا رشتہ زیادہ پسند تھا اور ہم نے اس رشتے کو عمر بھر نبھانے کا عہد کر رکھا تھا۔

مجھے سردیوں کی ایک ملاقات یاد آ رہی ہے جب شیریں نے مجھے بڑی محبت اور پورے اعتماد سے کہا تھا:

"شاہد! شادیاں تو سبھی کرتے ہیں لیکن دوستی کہیں کہیں ہوتی ہے۔ شادیاں اکثر طلاق پر ختم ہو جاتی ہیں لیکن اگر دوستی ہو تو پھر طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یہ خوشگوار ملاقات میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ابھی ہم نے شیخوپورے والی

محبت گاہ دریافت نہیں کی تھی اور ہم سٹیشن والے ہوٹل میں مسافر بن کر ملا کرتے تھے۔ اُس روز سخت سردی پڑ رہی تھی۔ شاید دو ایک روز پہلے بڑی بارش ہوئی تھی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ میرے پاؤں گرم جرابوں میں بند ہونے کے باوجود جوتے میں ٹھٹھر رہے تھے۔ میں حسبِ معمول سوٹ کیس اور بسنتی تھیلا لے کر شیریں کو تانگے میں بٹھلائے سٹیشن والے ہوٹل میں آیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی کمرہ خالی نہیں۔ ہم دوسرے ہوٹل میں گئے۔ وہاں بھی یہی جواب سننا پڑا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ اُس وقت واقعی ہمیں اپنے آپ پر مسافروں کا گمان ہو رہا تھا جن کا اتنے بڑے لاہور شہر میں کوئی بھی نہیں تھا اور جن کی خاطر کسی گھر کا بھی دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔

آخر ایک ہوٹل میں کمرہ مل گیا۔ میں نے نوکر سے کہا:

"تانگے میں سے سامان اوپر پہنچا دو۔"

یہ یقین دلانے کے لیے کہ ہم مسافر ہیں اور ہمارے پاس تانگے میں سامان بھی ہے۔ اُس ہوٹل میں ہمیں جو کمرہ ملا۔ وہ سب کمروں سے الگ تھلگ تھا، اور اُس کے باہر ایک چھوٹا سا دالان بھی تھا جہاں سُنہری دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ میں گرے سوٹ میں تھا اور گرے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پہ گرم کیپ تھی اور گلے میں مفلر تھا۔ شیریں کی قمیص اور دوپٹہ بھی گرے رنگ کا تھا۔ شلوار سفید تھی اور اُس نے بسنتی رنگ کا پُوری آستینوں والا سویٹر

پہن رکھا تھا۔ جس کی ایک جانب دِل کے قریب نیلے رنگ کا پیارا سا پھول کڑھا ہُوا تھا۔ باہر دھوپ اتنی پیاری تھی اور ہم نے تانگے میں بیٹھ کر اتنی سردی کھائی ہوئی تھی کہ ہم کرسیاں والان میں نکلوا کر سُنہری اور گرم دُھوپ میں بیٹھ گئے وہیں ہم نے ناشتہ کیا۔ اتفاق سے ایک سنگترے بیچنے والا آ گیا۔ میں نے اُس سے کوئی درجن بھر سنگترے لیے اور اُنھیں پلیٹ میں ڈال کر چھیل چھیل کر شیریں کو دینے لگا۔

سردی کے بعد دھوپ میں آجانے سے شیریں کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سُرخی جھلکنے لگی تھی اور وہ بے حد خوبصورت اور نکھری ہُوئی دکھائی دے رہی تھی۔ موسم اس قدر خوبصورت اور دل کو گرما دینے والا ہو گیا تھا کہ طبیعت خود بخود کھُلے آسمان کی نیلی فضاؤں میں پرواز کرنے پر مائل ہو رہی تھی۔ اُس روز کی ملاقات میں ہم نے ایک دوسرے کا مُنہ تک نہ چُوما۔ ایک دوسرے کو گلے تک نہ لگایا۔ پھر بھی ہم محبّت کے خمار سے چُور چُور تھے اور ملاپ کی خوشی سے ہمارا خُون گرم ہو رہا تھا اور چہرے سُرخ ہو گئے تھے۔ یہ احساس کہ میری شیریں میرے سامنے دھوپ میں میرے پاس بیٹھی ہے میرے لیے خُدا کے قُرب کے احساس سے کم نہ تھا۔ ہم دونوں کے چہرے خوشی اور محبّت کی گرمی سے سنگترے کی طرح سُرخ، چمکیلے اور دلکش ہو رہے تھے۔ یہاں میں نے شیریں سے پُوچھا تھا:

"شیریں! اگر ہماری شادی ہو گئی تو کہیں۔ ہماری دوستی تو ختم نہیں ہو جائے گی؟"

اور شیریں نے چہرہ اُٹھا کر کہا تھا:

"دوستی کا رشتہ شادی کے بندھن میں آکر زیادہ مضبوط اور پائدار ہو جاتا ہے شاہد۔ شادی اگر دوستی کے بغیر ہو تو اُس کے ٹوٹنے کا ہر لحظہ احتمال رہتا ہے۔ لیکن اگر اس لوہے کو دوستی کی آبداری مل جائے تو پھر یہ کبھی بھی کسی حالت میں نہیں ٹوٹتا۔"

اُس روز میں شیریں کی نزاکت، وفا شعاری، محبت کیشی، جسم کی خوبصورتی اور آنکھوں کی دلکشی کے ساتھ ساتھ اُس کی ذہنی بیداری اور فراست کا بھی قائل ہو گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا تھا:

"شادی کے لوہے کو تم دوستی کی آبداری دو یا نہ دو مگر میں تمھاری عقل مندی کا لوہا ضرور مان گیا ہوں۔"

اور ہم دونوں ہنس پڑے تھے۔

۹

نکاح کے رشتے میں منسلک ہونے کے بعد بھی ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم حسبِ دستور ہفتے میں تین چار مرتبہ ضرور ملتے۔ پہلے کی طرح کیسینو ہوٹل یا لارنس کے کیبن یا سینما کے باکس میں جا کر بیٹھ جاتے۔ چار پانچ گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ بسر کرتے اور دوسرے دن کی ملاقات کا وعدہ کر کے جُدا ہو جاتے۔ لیکن اب ہمیں اپنی ملاقاتیں کچھ نامکمّل اور تشنہ تشنہ محسوس ہوتیں۔ ہماری آپس کی محبت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی۔ ہمارے پیار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہمارے جذبات کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے ایک ساتھ اُٹھتے ہوئے قدم ایک پل کے لیے نہیں رُکے تھے۔ ہمارے جذبۂ عشق کی پُرجوش ہم آغوشیاں مدھم نہیں پڑتی تھیں۔ ہم پہلے ایسی بے تابی سے ایک دوسرے کا انتظار کرتے۔ ہم پہلے ایسی مسرّت کے ساتھ

ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے۔ ایک دوسرے سے لپٹ کر پیار کرتے۔ گھُل مل کر وقت گزُرنے سے بے نیاز ہو کر آپس میں باتیں کرتے اور دھڑکتے دل اور پُر اُمید، پُر نم آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے۔ اس کے باوجود ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے ہم ایک دُوسرے سے دُور دُور ہیں۔ مجھے خاص طور پر اس دُوری اور تشنگی کا احساس زیادہ تھا۔ شرعی اعتبار سے شیریں میری بیوی بن چُکی تھی۔ اب صرف دنیاداری کی ایک رسم ہی باقی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا گویا میرے سامنے تصویر کا خاکہ بالکل تیار ہو گیا ہے رنگ سے بھرا ہوا بُرش میرے ہاتھ میں ہے اور میں یُونہی بیٹھا اُس گھڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب میں اُس تصویر میں اپنی مرضی کے مطابق رنگ بھر سکوں گا۔ اس سے پہلے میں سینکڑوں مرتبہ شیریں سے ملا تھا اور کبھی اتنی دُوری اور تشنگی کا احساس نہ ہُوا تھا۔ یہ تو بالکل ایسی بات تھی کہ میں دشوار گزار رستوں میں سے گزرنا پڑتا گزرتا جب چشمۂ حیواں پر پہنچ گیا تو مجھے چلّو بھر پانی پینے سے بھی منع کر دیا گیا تھا۔ جب میں نے اپنی اس نفسیاتی کیفیت کا شیریں سے ذکر کیا۔

تو وہ مجھ سے زیادہ بے قرار نکلی۔ اُس نے کہا:

"شاہد! اب یہ دُوری مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہی۔"

میں نے کہا:

"تو پھر کیوں نہ اپنی شادی کا اعلان کر دیا جائے اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

ایک ہو جائیں؟"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ اس راز کے کھول دینے کا وقت آ گیا ہے تو میں تیار ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمارا سڑکوں اور ہوٹلوں میں یوں پھرتے رہنا جائز بھی نہیں اور مناسب بھی نہیں۔ یہ صرف دُنیا ہی کو نہیں خدا کو بھی دھوکا دینے والی بات ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم گھر والوں کو بتا دو کہ تم نے مجھ سے نکاح کر لیا ہے اور اب وہ رخصتی کا بندوبست کر دیں۔"

شیریں نے گہرا سانس لے کر کہا:

"بڑا کٹھن مرحلہ ہے مگر میں اس پر سے گزر جاؤں گی۔ تم بے فکر رہو۔ مجھ سے بھی اب یہ جُدائی برداشت نہیں ہوتی اور مجھے بھی نکاح کے بعد اس طرح چُھپ چُھپ کر ملنا بُرا لگتا ہے۔"

شیریں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دوسرے روز اپنی ماں کے سامنے نکاح کا راز فاش کر دے گی۔ اُس روز جُون کی چوتھی تاریخ تھی۔ گویا اس اعتبار سے پانچ جُون کو شیریں نے گھر والوں سے بات کرنی تھی۔ اُس نے مجھے کہا:

"میں کل یعنی پانچ کو بات کروں گی اور چھ کی صبح کو تمھیں فون پر اطلاع دے دوں گی۔ تم صبح میرے فون کا انتظار کرنا۔"

شیریں نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا۔

اُس نے دوسرے دن کا بھی انتظار نہ کیا اور اُسی روز شام کو اپنی ماں کو بتا دیا کہ اُس نے مجھ سے نکاح کر لیا ہے اور اب اُسے جتنی جلدی ہو سکے رخصت کر دیا جائے۔ اُس نے نکاح نامہ نکال کر ماں کے سامنے رکھ دیا۔ اُس کی امّی تو دم بخود ہو کر رہ گئیں۔ اُس نے پہلے تو کوئی بات نہ کی اور پھر ایک دم غصّے میں آگ بگولا ہو کر شیریں پر سوار ہو گئیں۔ پھر جب دیکھا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے تو صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ اُنھوں نے شیریں کے والد کو بتایا۔ اُس کے والد کا بھی پارہ ایک دم چڑھ گیا مگر شیریں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"آپ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں شاہد کی منکوحہ ہوں۔ میں نے اپنی مرضی سے یہ بیاہ کیا ہے۔ میں نے آپ کی عزت کا احساس کیا ہے۔ وگرنہ میں گھر سے بھاگ کر بھی یہ کام کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں آپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ آپ کو بھی میری مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے مجھے جلد از جلد رخصت کر دینا چاہیے۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی، میں اپنی زندگی الگ شروع کرنی چاہتی ہوں۔ جہاں میں شادی کرنا چاہتی تھی، میں نے وہاں شادی کر لی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے ہاتھوں مجھے دنیا والوں کی طرح عزت اور آبرو سے رخصت کر دیں۔ اس فعل کی اچھائی یا بُرائی کی میں خود ذمہ دار ہوں اور میں آپ کے سامنے کبھی کسی کی شکایت

لے کر نہیں آؤں گی۔"

شیریں کے ماں باپ شیریں کی ان باتوں اور حقائق کے سامنے بے بس ہو گئے۔ باپ نے کہا:

"اگر تم نے اپنی شاخ اپنے ہاتھوں کاٹ لی ہے تو پھر اپنے خاوند سے کہو کہ پرسوں چند شریف آدمیوں کو ساتھ لے کر آ جائے۔ میں تمھیں اب اپنے گھر میں نہیں دیکھنا چاہتا۔"

شیریں کو اگرچہ باپ نے کبھی پیار نہیں دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اُس کا باپ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر رو دی۔ کیا اب وہ کبھی اپنے باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں سے نہیں ملے گی؟ اس خیال سے اُس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

میں ۶ جون کو شیریں کے فون کا منتظر تھا۔ اس کے برعکس شیریں کا پانچ جون یعنی دوسرے ہی روز فون آ گیا۔ اُس نے مجھے کہا:

"سب بات ٹھیک ہو گئی ہے شاہد پیارے۔ اگرچہ مجھے ایک روح فرسا صدمے سے گزرنا پڑا ہے مگر راستہ صاف ہو گیا ہے۔ گھر والے مان گئے ہیں تم سات جون کی شام کو سات بجے بارات لے کر آ جانا۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"لیکن شیریں سنو تو — کیا تمھیں یقین ہے کہ اگر ہم پرسوں برات لے کر آئے تو ہمیں واپس نہیں کیا جائے گا؟"

شیریں ہنس پڑی۔

"اس کا ذمّہ میں لیتی ہوں۔ اچھا پیارے رخصت! پرسوں ملیں گے۔"

"جب تم دُلہن بنی ہوگی۔"

"اور تم دُولھا — خدا حافظ!"

"خدا حافظ۔"

شیریں نے بڑی جرأت، عہد آفرینی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا تھا۔ اُس نے یہاں تک اپنے والدین کو کہہ دیا تھا کہ اگر اُنھوں نے اسے باعزت طور پر اپنے ہاتھوں رخصت نہ کیا تو وہ خود شاہد کے پاس چلی جانے پر مجبور ہو جائے گی۔ شیریں کے باپ نے کہا:

"اگر ایسی بات ہے تو ہم تیار ہیں لیکن اس کے بعد تمھارا اس گھر کے رہنے والوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

"مجھے منظور ہے۔"

شیریں کا خیال تھا کہ کچھ وقت گزرنے پر اولاد کی محبت جوش کھائے گی اور وہ اپنے ماں باپ سے دوبارہ گھُل مل جائے گی۔ کیونکہ وہ گھر سے بھاگ کر تو جا نہیں رہی۔ صرف اپنی مرضی سے شادی کر رہی ہے اور وہ بھی اپنے ماں باپ کی موجودگی میں اور جس کا رشتہ داروں میں کسی کو علم ہی نہیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں اسی طرح سوچتی ہیں۔

سات جون کی وہ خوبصورت شام بھی آ گئی۔

اُس روز مجھے دُولھا بن کر شیریں کے گھر جانا تھا اور شیریں کو دُلہن بن کر میرے گھر آنا تھا۔ میں اگر اُس دن کے اپنے بے پایاں خوشبوں بھرے احساسات کو الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کروں تو یہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کے مترادف ہو گا۔ چھ جون کو میں نے اپنے دفتر سے کچھ روپے نکلوائے اور میں اپنے دوست سرفراز اور بھابی عشرت کے ساتھ انارکلی میں دُلہن کے کپڑے اور دُوسرا ضروری سامان وغیرہ خریدنے گیا۔ ہم صبح دس بجے انارکلی میں داخل ہوئے اور شام چار بجے باہر نکلے۔ اس دوران میں ہم نے مختلف دوکانوں میں گھوم کر شیریں کے لیے ریشمی جوڑوں کا کپڑا، سنگار کیس، ریشمی دوپٹے، ساڑھیاں، مختلف رنگوں کے جُوتے، زرتار پراندے، میکس فیکٹر کا سامان خریدا اور تانگے میں لدے پھندے اپنے دوست سرفراز کے گھر آ گئے۔ بھابی عشرت اپنی ساس کے ساتھ مل کر رات گئے تک جوڑے ٹانکتی رہی اور دوسرے سامان کو سُوٹ کیس میں سجاتی رہی۔

سات جون کی صبح طلوع ہوئی۔

اُس روز موسم گرما کا سُورج کچھ نرالی ہی آب و تاب سے بلند ہوا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی روشنی میں لاکھوں کروڑوں کرنوں نے اضافہ

کر دیا ہے اور اُس کی کرن جس چیز کو چھوئے گی اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سُنہری کر دے گی۔ میرا ایمان ہے کہ سات جُون کو لاہور شہر کے باغوں میں جو پھُول کھلے تھے وہ کبھی نہیں مرجھائے ہوں گے۔ اُس روز ایک بھی جنازہ قبرستان کو نہیں گیا ہو گا۔ ایک بھی نومولود بچّہ روتے ہوئے پیدا نہیں ہُوا ہو گا۔ کسی گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں ہُوا ہو گا۔ کوئی خاوند بیوی سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نہیں نکلا ہو گا۔ ایک بھی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا ہو گا۔ ایک بھی کان نے بُری خبر نہیں سُنی ہو گی۔ اُس روز قاتل کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا ہو گا۔ شیر نے اپنے شکار کو چھوڑ دیا ہو گا۔ سانپ کے دانتوں میں اُس کا زہر زائل ہو گیا ہو گا۔ چوروں نے لُوٹا ہُوا مال واپس کر دیا ہو گا۔ جیب کتروں نے دوسروں کی جیبوں میں ڈالے ہوئے ہاتھ باہر نکال لیے ہوں گے۔ بھونروں نے چُوسا ہُوا رس کلیوں کو واپس کر دیا ہو گا۔ بلبل نے گُل کی یاد میں مرثیہ خوانی چھوڑ دی ہو گی۔ اُس روز ایک بھی سُوکھا پتا اپنی شاخ سے ٹوٹ کر نہیں گرا ہو گا۔ ایک بھی کلی کسی گلچیں نے نہیں توڑی ہو گی۔ ایک بھی شمع اپنے شبستان میں نہیں بجھی ہو گی۔

کیونکہ اُس روز ہمارا بیاہ ہو رہا تھا۔ دو محبت کرنے والوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملاپ ہو رہا تھا۔ شیریں اپنی زندگی کی تمام دلکشی خوش نصیبی

اور رعنائی لے کر میری زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ روز میرے خوابوں کی تعبیر کا دن تھا۔ میری آرزوؤں کی تکمیل کا دن تھا۔ میں اُس دن پر اپنی زندگی کی ہزاروں راتیں قربان کر سکتا تھا۔ اُس روز طلوع ہونے والے سُورج کے قدموں پر لاکھوں راتوں کے سینے سے چاند نوچ کر ڈھیر کر سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اُس دن کی رات کبھی نہیں آئے گی اور اگر رات آئی تو وہ دن سے زیادہ روشن، زیادہ چمکیلی اور زیادہ سنہری ہو گی۔ اُس رات آسمان پر ہزاروں چاند چمکیں گے۔ لاکھوں ستاروں کے فانوس روشن ہوں گے اور جب ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سُورج ہو تو پھر چاہیے صبح کبھی نہ ہو۔ جب شیریں بالوں میں افشاں چھڑکے، ہاتھوں میں مہندی لگائے دُلہن بنی میری آغوش میں ہو تو پھر چاہے رات کبھی ختم نہ ہو۔ سُورج کبھی مشرقی اُفق پر نمودار نہ ہو۔ پھر کیسا دن اور کیسی رات؟ پھر وقت روشنی اور اندھیرے کا نام نہیں۔ پھر گزرتے لمحات کو پیمانوں سے نہیں دریا کے قطروں، ریت کے ذرّوں اور سمندر کی موجوں سے ماپا جاتا ہے۔ پھر وقت خوشبو اور نیلی روشنی کی ایک لہر کا نام ہے جو ابد سے ازل تک اور مشرق سے مغرب تک پھیلی ہو گی۔

سات جُون کو یعنی اپنی شادی کے دن میں حسبِ معمول اُٹھا۔ غسل کرنے کے بعد ناشتہ کیا اور سکوٹر پر بیٹھ کر سیدھا اپنے دوست سرفراز کے گھر

آگیا۔ بھابی عشرت نے مجھے ٹانکے ہوئے جوڑے اور دوسری برات کے ساتھ لے جانے والی چیزیں دکھائیں۔ ہر شے بالکل نیا رکھی۔ میں خوشی سے لبریز دل لے کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں، میں نے دُور سے شیریں کا گھر دیکھا۔ اس خیال سے میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میں آج شام کو وہاں شیریں کو بیاہنے آؤں گا۔ میں آج بڑی احتیاط سے سکوٹر چلا رہا تھا۔ کسی بس یا ٹرک سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ مجھے زندگی بے حد قیمتی محسوس ہو رہی تھی۔ کم از کم میں شام تک ضرور زندہ رہنا چاہتا تھا۔

چار بجے میں دفتر سے سیدھا گھر آگیا۔

روز کی طرح آکر غسل کیا۔ بوسکی کی قمیص، سفید پتلون اور سفید بوٹ پہنے۔ کیونکہ شیریں کو میرا یہ لباس بڑا پسند تھا۔ سکوٹر پر بیٹھ کر اپنے دوست کے گھر آگیا۔ میں نے بھابی سے کہا:

"میرا خیال ہے بھابی! تھوڑی سی مٹھائی ساتھ لے لیں۔"

"کوئی حرج نہیں۔"

میں نے اُسی وقت سات سیر مٹھائی منگوالی۔ تین ٹیکسیاں پہلے ہی سے باہر کھڑی تھیں۔ کپڑوں، اور دوسرے لوازمات والا سوٹ کیس بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے دو تین دوسرے خاص دوستوں کو بُلا لیا تھا۔ اُن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میری شادی کے بارے میں کسی سے

کوئی بات نہیں کریں گے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ میں بعض وجوہ کی بنا پر اپنے گھر والوں سے کچھ دیر کے لیے اپنی شادی کی خبر پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ انھیں اس کا علم ہو۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے بارات شیریں کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں اس سڑک پر سے پہلے ہزاروں مرتبہ گزرا تھا۔ مگر جتنی خوبصورت اور پیاری یہ سڑک اس روز معلوم ہو رہی تھی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ درخت اپنی شاخیں لہرا لہرا کر، جھکا جھکا کر مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ مزنگ چونگی والے بس سٹاپ نے دور سے ہاتھ لہرا کر مجھے سلام کیا۔ اس نے سردی کی ٹھٹھرتی صبحوں کو مجھے سکوٹر کھڑا کیے شیریں کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔ جب بارات کینال بینک والی نہر کے پل سے گزری تو نہر کی شوخ موجوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور سرگوشیاں کرنے لگیں۔ جب ہم گارڈن ٹاؤن والے بس سٹاپ کے پاس سے گزرے تو سٹاپ والے شیشم کے پیڑ کے پتوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اس بس سٹاپ پر کھڑی ہو کر شیریں میری راہ دیکھا کرتی تھی۔ آج یہ بس سٹاپ ہم دونوں کو دولھا دلہن بنے وہاں سے گزرتے دیکھنے والا تھا۔

گاڑیاں شیریں کی کوٹھی کے باہر کھڑی ہوگئیں۔ کوٹھی کے باہر روشنیاں نہیں کی گئی تھیں۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ بہر حال شیریں اپنے

ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کر رہی تھی بلکہ مجھے تو اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں ہمیں واپس ہی نہ کر دیا جائے۔ یا وہاں جائیں، تو لڑکی والوں کی بجائے پولیس والے ہمارا خیر مقدّم کریں۔

سرفراز نے مجھے آہستہ سے کہا:

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں لوہے کے ٹوپ پہن کر آنا چاہیے تھا۔"

"فکر نہ کرو۔"

"بھائی کیا خبر ہماری تواضع کھانے کی بجائے ڈانگوں سے کی جائے۔۔۔ لو بسم اللہ کرو۔"

میں آگے بڑھا۔ برآمدے میں شیریں کے بھائی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے ہمارا استقبال کیا اور بارات کو اندر لے جانے میں ہماری رہنمائی کی۔ مہمانوں کو ڈرائینگ روم میں بٹھلایا گیا۔ ہماری ٹھنڈے مشروبات اور پھر چائے اور مٹھائی سے تواضع کی گئی۔ سرفراز نے میری طرف تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ یار ہمارا خیال غلط نکلا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ شیریں کے گھر والوں نے شیریں کی رخصتی کے لیے اگر پُرجوش نہیں تو بڑا شریفانہ اہتمام کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے یہ بات محسوس کی کہ ہماری آؤ بھگت میں زیادہ سے زیادہ شیریں کا بھائی اور

اُس کی دیرینہ سہیلی مسرت ہی حصّہ لے رہی تھی۔

شیریں کا والد اور والدہ کچھ کشیدہ خاطر سے تھے۔ جس جگہ میں بیٹھا تھا وہاں میرے بالکل سامنے دوسرے کمرے کا دروازہ تھا جو نصف کھلا تھا اور اس میں سے میں شیریں کی جھلک دیکھ لیتا تھا۔ شیریں بے حد خوش تھی۔ اُس نے ابھی تک دلہنوں کے کپڑے نہیں پہنے تھے اور عام کپڑوں میں ادھر سے اُدھر خوش نوا بلبل کی طرح چہک رہی تھی۔ وہ خود ہی دلہن تھی اور خود ہی میزبان بنی پھر رہی تھی۔

آخر جب وقت زیادہ ہونے لگا تو عشرت بھابی نے اندر جا کر اُسے دُلہن بنایا۔ نہ جانے کیوں جب شیریں کی والدہ اُس کے ماتھے پر سونے کا جھومر لگانے لگی تو شیریں نے اُسے پسند نہ کیا۔ والدہ نے عشرت سے کہا:

"دیکھئے! شیریں جھومر نہیں لگواتی۔ اسے کہئے ناں کہ دُلہن تو پوری طرح بنے۔"

عشرت بھابی کے کہنے پر شیریں نے جھومر لگا لیا۔ شیریں نے سفید ساٹن کا غرارہ، سفید سینڈل، فیروزی ریشمی قمیض کے اوپر فیروزی دوپٹہ لے رکھا تھا۔ جیسے سفید کرن لگی ہوئی تھی۔ وہ دلہن بنی اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اُس روز میں بھی اپنے حُسنِ انتخاب پر دنگ رہ گیا اور اپنے

آپ کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ رخصت ہونے لگی تو اپنی چھوٹی بہن کے گلے لگ کر بہت روئی۔ اس کی ماں نے عشرت بھابی سے کہا:

"میں نے اپنی بچّی کو پھولوں کی طرح پالا ہے۔ خیال رکھیے گا اس کا۔ شیریں میری بڑی لاڈلی بیٹی ہے۔"

شیریں ماں سے مل کر سسکیاں بھرتی رہی۔

اُس کے رخساروں پر چھڑکی ہوئی افشاں آنسوؤں کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ پھر جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے ذرا سی جھکی تو اس کا سفید کرن والا فیروزی دوپٹہ پھسل کر اُس کی باہوں میں آ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے نیلے نیلے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی اپنے پھل کے بوجھ سے نیچے جھک گئی ہو۔ اُس کے خوبصورت پاؤں سفید سینڈل میں دُودھ کی طرح چمک رہے تھے۔ اُس کے ماتھے پر سونے کا جھومر طلوع ہوتا ہوا آفتاب معلوم ہو رہا تھا اور چہرے پر بکھری ہوئی سنہری افشاں ستاروں کی مانند چمک رہی تھی۔

شیریں نیلے پھولوں کی ڈالی بنی، سفید افشاں کی کہکشاں کھینچے، سنہری جھومر کا سُورج ماتھے پر لیے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی شبنم کے موتی گراتی میرے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور

گھر بار کو چھوڑ کر میری بیوی بن کر اپنی محبت پر فتح حاصل کرتی ہوئی میرے پہلو میں آکر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور بارات واپس روانہ ہو گئی۔

میں شیریں کو اپنے دوست سرفراز کے گھر لے آیا۔

کیونکہ میں نے پہلے ہی یہ طے کر رکھا تھا کہ سرفراز اپنے وسیع مکان کے چھ کمروں میں سے ایک کمرہ ہمیں دے دیں گے اور جب تک میرے حالات سازگار نہیں ہو جاتے اور میں شیریں کو اپنے گھر نہیں لے جاتا اُسے وہیں رکھوں گا۔ اس بات سے میں نے شیریں کو بھی آگاہ کر دیا تھا اور وہ اس سے مطمئن تھی۔

گھر آکر ہم نے کھانا کھایا۔ چائے پی۔ شیریں دُلہن بنی بھابی عشرت کے ساتھ کمرے میں پلنگ پر بیٹھی رہی۔ میں اپنے دوستوں میں بیٹھا خوشی خوشی باتیں کرتا رہا۔ اُس روز میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ خوشی اور مسرّت میرے جسم کے ذرّے ذرّے سے اس طرح پھُوٹ پھُوٹ کر باہر نکل رہی تھی جس طرح رات کی رانی کی جھاڑیوں میں سے خوشبو کے جھونکے اٹھا کرتے ہیں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میری آرزوؤں کی تکمیل ہو گئی تھی۔ مجھے میری منزل مل گئی تھی۔ میں تو اُس شُبھ گھڑی کا جتنا بھی جشن مناتا کم تھا۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب جب کہ گھر کے دوسرے لوگ اپنے

اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں شیریں کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا فرشی بڑا پنکھا چل رہا تھا۔ شیریں دُلہن بنی، پلنگ پر سر نہوڑائے بیٹھی تھی۔

"شیریں! —— میری جان شیریں!"

میں نے شیریں کے پاس بیٹھ کر، اس کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ شیریں نے سر جھکا لیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اُوپر اٹھایا۔ میرے اللہ! مجھے یوں لگا جیسے میں نے چاند کو ہتھیلی میں اُٹھا لیا ہو۔ جیسے کہکشاں کے زرتار آنچل کو اٹھا کر میں نے کائنات کے حسین ترین راز کو بے نقاب کر دیا ہو۔ شیریں کا چہرہ اُس موتی کی طرح دمک رہا تھا جیسے سمندر کی گہرائیوں سے نکال کر پھولوں کی سیج پر سورج کی کرنوں میں رکھ دیا ہو۔

ماتھے پر سونے کا جھومر، چہرے پر افشاں، یاقوتی ہونٹوں پر لپ سٹک کی تہہ، پُراسرار آنکھوں میں بہن بھائیوں کو چھوڑنے کا غم اور محبوب سے ملنے کی خوشی، بہے ہوئے آنسوؤں کے نشان، ہاتھوں میں مہندی، ریشمی فیروزی قمیض میں سے اُٹھتی ہوئی حنا کے عطر کی گرم خوشبو، چہرے کے گرد سفید کرن والے دوپٹے کا ہالہ، جیسے پورے چاند کے گرد نور کا دائرہ کھنچا ہوتا ہے میں نے کہا۔

"شیریں! مجھ سے ہمیشہ اسی طرح محبت کرو گی نا؟ مجھے بھلا تو نہیں

دو گی ؟"

شیریں نے آنکھیں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور آہستہ سے کہا :

"کیسی باتیں کرتے ہو شاہد ! میں اگر چاہوں بھی تو تمھیں نہیں بھلا سکتی ۔ تمھیں بھلانا میرے بس میں نہیں ہے ۔"

شیریں کی آنکھوں میں محبّت اور جذبات کی شدت اپنے نقطۂ عروج پر تھی ۔ اُس کی نظریں مجھے یُوں تک رہی تھیں جس طرح سمندر کی لہریں پورے چاند کے مکھڑے کو دیکھتی ہیں ۔ جس طرح خوشبو اپنے پھُول سے الگ ہو کر دوبارہ پھُول کے سینے سے لگ کر اُس کی پنکھڑیوں کو دیکھتی ہے ۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ شیریں کو آغوش میں لے لیا اور ہونٹ شیریں کے ہونٹوں پر رکھ دیئے ۔ اُس روز مجھے یقین آیا کہ میں اگر چاہوں تو خوشبو کے ہونٹ بھی چُوم سکتا ہوں اور خوشبو اگر چاہے تو شیریں کے جسم کی شکل میں بھی ڈھل سکتی ہے ۔ میری آغوش میں شیریں کا جسم نہیں تھا ۔ پھُولوں کا ڈھیر تھا ۔ حِنا کے عطر میں ڈوبا ہُوا اطلس و کمخواب کا ہیولا تھا ۔ سنگِ مرمر کا مقدّس مجسّمہ تھا جو میری محبت کی گرمی سے پگھل کر دودھ اور مکھّن بن گیا تھا ۔ شیریں کے ہونٹوں سے خوشبو اُٹھ رہی تھی ۔ اُس کے رخساروں سے خوشبو اُٹھ رہی تھی ۔ اُس کی آنکھوں سے خوشبو اُٹھ رہی تھی ۔ وہ ایک ہمہ گیر خوشبو کی لہر تھی جو کبھی رخسار بن جاتی ۔ کبھی ٹھوڑی ، کبھی ہونٹ

اور کبھی رس بھرے دُودھیا گالوں کا روپ دھار لیتی - میری حالت اُس بھونرے کی تھی جو بہار کے نشے میں چُور ہو کر، اندھا ہو کر پھُول پر بار بار گر رہا ہو اور کبھی اُس کی پتّیوں، کبھی ڈالی اور کبھی پنکھڑیوں کو چُوم رہا ہو۔ میں شیریں کے ہونٹ گال سمجھ کر اور گال آنکھیں سمجھ کر چُوم رہا تھا۔ اُس رات شیریں ایک کُل تھی جس میں ہر جُزو گھُل مل گیا تھا۔ میرے لیے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ شیریں کہاں سے شروع ہو کر کہاں جا کر ختم ہو جاتی ہے کبھی وہ صرف ہونٹ تھی۔ دو رس بھرے خوشبو اڑاتے گرم گرم، ذرا ذرا کانپتے سُرخ ہونٹ ـــ اور کبھی آنکھیں تھی۔ دو پُراسرار گہری گہری، اپنی طرف بُلاتی آنکھیں ـــ!

اُس رات کے لیے سُورج نے کئی ہزار سال تک مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کا سفر اختیار کیا تھا۔ اُس رات کی خاطر زمین نے سُورج کے گرد کروڑوں بار چکّر لگایا تھا۔ ہزاروں ستاروں نے ٹوٹ ٹوٹ کر اپنا آپ جلا کر راکھ کر لیا تھا۔ ہزاروں پھُولوں نے مُرجھا کر اپنے آپ کو خزاں کی بے رحم ہواؤں کے حوالے کیا تھا۔ اَن گنت چمکیلے روشن دن چمک چمک کر شام کی آغوش میں غروب ہو گئے تھے۔ لاکھوں چاند خلاؤں میں ٹکٹکی باندھ کر انتظار کر کے تھک گئے تھے۔

یہ رات کروڑوں سال کے بعد طلوع ہوئی تھی۔ یہ رات گویا چاندنی

کی نیلی اور نورانی نہر تھی جیسے میری محبت کے تیشے نے شیریں کی خاطر چاند کی مرمریں چٹانوں کو کاٹ کر جاری کیا تھا۔ اُس رات کی سُندرتا اور حُسن شیریں کی کاجل لگی آنکھوں میں سمٹ کر آگیا تھا۔

میں نے شام ہی سے شیریں کے لیے موتئے کے گجرے منگوا کر رکھ لیے تھے۔ جب میں نے شیریں کی کلائیوں اور جُوڑے میں سفید سفید موتئے کے گجرے لگائے تو شیریں کا چہرہ اُن کی وجہ سے اور بھی حسین ہو گیا۔ مہندی لگے ہاتھوں کی نرم و نازک کلائیوں میں سفید پھُولوں کے گجرے ڈال کر شیریں نے دونوں ہتھیلیوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور میری طرف محبت اور پیار کی بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ میں ان نگاہوں کا خلوص، محبت اور پیار کی شدت برداشت نہ کر سکا۔ مجھے یُوں لگا جیسے میں نے پُورے چمکتے ہوئے سُورج کے سامنے آنکھیں کر دی ہوں جیسے میں نے طُور کے پہاڑ کی چوٹی پر کسی کے جلووں کو بے نقاب دیکھ لیا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بے اختیار شیریں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پھر رنگ و نور کا ایک سمندر تھا۔ خوشبو کے خواب کا ایک سیلاب تھا۔ آگ اور شبنم کا ایک طوفان تھا اور ہم دونوں تھے، اور چاندنی رات تھی اور حنا کے عطر کی چیختی چلاتی عریاں مہک تھی اور سنہری افشاں کا برق رفتار، اُڑتا، چکراتا، گھُومتا، شور مچاتا غبار تھا اور کچھ نہیں تھا۔ کچھ نہیں تھا۔ . .

اندر کمرے میں شیریں کے مشکبار سنہری گیسو پنکھے کی تیز ہوا میں میرے شانوں پر اور میری باہوں میں لہرا رہے تھے اور باہر جون کی گرم، پسینے میں تر بتر، برہنہ رات آگ اُگلتے چاند کا دہکتا ہوا سُرخ تھال ہتھیلیوں پہ رکھے بھاگی جا رہی تھی، اُڑی جا رہی تھی۔ بال کھلے تھے، ہونٹ کھلے تھے، باہیں پھیلی تھیں، آنکھیں بند تھیں، عریاں جسم لرز رہا تھا اور شفاف پسینے کے قطرے ستارے بن کر جسم سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ سیپ کا منہ کھل گیا تھا اور وہ اپنے تقدّس کا موتی ہونٹوں پہ رکھے سمندر کی گہرائیوں سے اوپر سطح پر آ گیا تھا۔ گرم رات کی ہوا میں ناریل کے بند شگوفے نے کھل کر اپنی پنکھڑیاں کھول دی تھی اور اُس کے ریشمی ہونٹوں پہ شبنم کا رس ٹپکنے لگا تھا۔ یہ رانوں کی مہارانی رات تھی۔ جس نے اپنا سر شیریں کے قدموں پہ اُسکے بال میرے سینے پر اور شیریں کی عُریاں باہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے گلے میں ڈال دی تھیں۔

اُس رات ہم میں سے کوئی بھی نہ سویا۔ وہ رات اس طرح گزر گئی جس طرح کوئی خوبصورت نازک اندام لڑکی بالوں میں موتیے کے پھول لگائے ایک نظر دیکھنی قریب سے گزر جاتی ہے۔ ہم ایک بار منہ چومتے اور رات کا ایک پہر گزر جاتا۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر آنکھیں بند کرتے اور رات کا دوسرا پہر نکل جاتا۔ یہ رات تو ہرن کے بچے کی طرح چوکڑیاں بھرتی

بھاگی جا رہی تھی اور ہم میں سے کوئی بھی اُسے نہیں تھام سکتا تھا۔ ایسی راتوں کو تو کبھی نہیں ڈھلنا چاہیئے۔ ایسی راتوں کو تو کم از کم ایک ہزار سال کا ضرور ہونا چاہیئے۔ ایسی راتیں بار بار کہاں آتی ہیں؟ ہم رات بھر پیار کرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے رہے اور پیار کرتے رہے اور ہم میں سے کوئی بھی نہ سویا۔ نہ میں، نہ شیریں اور نہ رات ۔۔۔ ! شیریں نے میرے سینے پر سر رکھ کر دوستی اور ازدواج ۔۔۔ دونوں رشتوں کی پاسبانی کی قسمیں کھائیں۔ ہم نے ہاتھ اٹھا کر اپنے عہدِ وفا کی درازیِ عمر کی دُعائیں مانگیں۔ اپنی محبت کے راستے پر گامزن رہنے کے نئے سرے سے عہد و پیمان کیئے اور ہم ایک دوسرے کی باہوں میں اُلجھ کر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے اور رات ہمیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی اور ہم پر ستاروں کے پھول نچھاور کرتی رہی۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

03142893816

۱۰

صُبح ہوگئی۔ دن نکل آیا۔

سُورج کی ایک شوخ کرن روشن دان کی درز میں سے حجلۂ عروسی میں داخل ہُوئی اور اُس نے ہمارے لذّت سے چُور، بے سُدھ، برہنہ جسموں کو چُوم لیا اور اُس کا مُنہ لال ہوگیا اور اُس نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ سُورج طلوع ہو چکا ہے اور تمھاری نئی زندگی کے روزِ اوّل کا آغاز ہوگیا ہے۔ اُٹھو کہ یہ شگفتنِ گل ہائے ناز کا وقت ہے اور رات صبح کی آنکھ کا کاجل بن گئی ہے۔ ہم نے آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ رات کی ساری لذت، سارا سرور اور نشہ ہماری آنکھوں میں سمٹ کر آگیا تھا۔ ہم نے اٹھ کر غسل کیا۔ شیریں نے اٹیچی کیس میں سے تولیہ اور صابن نکال کر میرے لیے غسل خانے میں رکھی۔ جب میں نہا چکا تو اُس نے میری کمر پہ پاؤڈر

چھڑکا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ شیریں نے میرے لیے چائے بنائی اور مسکرا کر میرے ہاتھ میں پیالی دی۔ آج وہ مجھ سے آنکھیں چار نہیں کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس بچے کی یاد دلا رہی تھیں جس نے کم عمری میں ہی بہت کچھ دیکھ لیا ہو۔

اس کے بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر شیریں کے والدین سے ملنے اُس کے گھر گئے۔ لیکن اُن لوگوں نے کچھ سرد مہری سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ سوائے شیریں کے بھائی اور چھوٹی بہنوں کے اور کسی نے بھی ہم سے بات نہ کی۔ شیریں کی والدہ نے میرے سلام کا بھی جواب نہ دیا۔ اُس نے شیریں کو اندر بلا کر صاف صاف کہہ دیا کہ وہ آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھے۔ یہی سمجھ لے کہ اُس کے ماں باپ مر گئے ہیں۔ شیریں رونے لگی۔ مگر اُس نے اپنی والدہ کو کچھ نہ کہا اور چپکے سے میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چل دی۔ ہم فیروز پور روڈ سے ہوتے ہوئے انارکلی آ گئے۔ یہاں ہم نے کچھ شاپنگ کی۔ میں نے اپنے لیے چپل اور سلیپنگ گاؤن خریدا۔ شیریں نے پھول دار وائیل اور کریپ قمیضوں کے لیے خریدی۔ بلاوز اور شلواروں کے لیے ساٹن خریدی میں نے اُسے اپنی پسند کی ایک سفید ساڑی لے کر دی۔ جو میں چاہتا کہ شیریں پہن کر میرے سامنے بیٹھی رہا کرے۔ ہم وہاں سے نکل کر درزی کے ہاں چلے گئے۔ یہ درزی شیریں کا گھریلو درزی تھا۔ شیریں نے اُسے کپڑا دیا اور کہا :

"ماسٹر جی! ہمیں جلدی کپڑے چاہئیں۔ دیر نہ کیجئے گا۔"

ہم نے دوپہر کا کھانا مال کے بہترین ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا۔ شیریں بے حد مسرور تھی۔ وہ ایک نوالہ منہ میں لیتی اور میری طرف دیکھ کر مسکرا لیتی۔ ہم نے گاڑی میں بیٹھ کر اُن تمام مقامات کی سیر کی جہاں ہم شادی سے پہلے ملا کرتے تھے۔ اُن تمام بس سٹاپوں کو دیکھا۔ جہاں ہم ایک دوسرے کا انتظار کیا کرتے۔ اُن تمام سڑکوں پر سے گزرے جہاں سے میرا اسکوٹر شیریں کو کالج سے پیچھے بٹھلا کر گزرا کرتا تھا۔

شام کو تھوڑی دیر کے لیے میں گھر گیا اور پھر واپس شیریں کے پاس آگیا۔ رات کا کھانا ہم نے اور عشرت بھابی، سرفراز اور سرفراز کے چھوٹے بھائی پرویز وغیرہ نے مل کر کھایا۔ شیریں یہاں بھی ہر نوالے پر میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتی رہی۔

شیریں کی بیاہتا زندگی کا آغاز ہو گیا۔

یہ ایک بڑا ہی رومانٹک اور خواب انگیز آغاز تھا۔ شیریں کا چہرہ خوشی سے ہر وقت مسکراتا رہتا۔ چونکہ وہ بڑی نازک اندام لڑکی تھی۔ اس لیے اُس نے میرے کہنے پر صبح و شام دودھ پینا شروع کر دیا۔ میں نے دفتر سے چار دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔ ہم دن بھر باتیں کرتے، پیار کرتے، ہنستے کھیلتے اور سیریں کیا کرتے۔ میں نے ان چار دنوں میں ایک بار بھی شیریں کو اُداس یا پریشان نہیں

دیکھا۔ جس روز میں دفتر جانے لگا۔ شیریں نے میرے لیے ناشتہ تیار کیا۔ اُسے پیک کر کے میرے سکوٹر کے بوکس میں رکھا۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میں نے سکوٹر سٹارٹ کیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔ جب تک سکوٹر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ شیریں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی۔

وہ میری واپسی کے انتظار میں گھڑیاں گنتی رہی۔ میں بھی دفتر میں اُس حسین ترین لمحے کا منتظر رہا۔ جب میں گھر میں داخل ہو کر شیریں کو دیکھوں گا یہ اُس کا روز کا معمول تھا کہ میرے پسندیدہ کپڑے پہن کر وہ روزانہ شام کو کھڑکی میں کھڑی میری راہ دیکھا کرتی اور میں بھی اُس کے پسندیدہ لباس یعنی بوسکی کی قمیض اور سفید پتلون پہنے ٹھیک ساڑھے چار بجے اُس کے پاس آجاتا۔ میں سڑک کا موڑ گھومتے ہی کھڑکی میں شیریں کو دیکھ لیتا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی شیریں کا چہرہ خوشی سے کِھل جاتا۔ وہ بھاگ کر دروازے میں آتی، اور خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کرتی۔ پھر ہم سب لوگ اکٹھے مل کر چائے وغیرہ پیتے۔ شام کو سینما وغیرہ چلے جاتے یا سیر کو نکل جاتے۔

میں چونکہ ابھی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ دن کو دفتر جانے سے پہلے ایک گھنٹہ گزارتا۔ شام کو دفتر سے واپسی پر اُس کے پاس آتا اور رات کے آٹھ نو بجے

تک وہاں رہتا اور پھر واپس گھر آجاتا۔ شیریں نے میرے اس معمول پر کسی قسم کا بھی اعتراض نہ کیا تھا۔ شام کو شیریں کے پاس جانے سے پہلے میں مال روڈ پر آتا۔ شبزان کے باہر جو گجرے بیچنے والے کھڑے ہوتے ہیں۔ اُن سے شیریں کے لیے گجروں کی جوڑی اور موتیے کے ہار خریدتا اور پھر اُسے جا کر اپنے ہاتھوں سے پہناتا۔

اُن ہی دنوں میرے دوست سرفراز اور اُن کی بیوی بھابی عشرت کا کوہ مری جانے کا پروگرام بن گیا۔ ہماری شادی کے پانچ چھ روز بعد ہی اُنھوں نے کوہ مری کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ بھابی عشرت کا اصرار تھا کہ ہم بھی اُن کے ساتھ ہی چلیں۔ لیکن میں اپنی دفتری مجبوریوں کی وجہ سے بے بس تھا۔ دفتر سے مزید چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ سوچتا ہوں۔ اگر میں اُس وقت کسی نہ کسی طرح چھٹی لے کر مری اُن کے ساتھ ہی شیریں کو لے کر چلا جاتا تو آج حالات مختلف ہوتے اور شیریں مجھ سے ہمیشہ کے لیے جُدا نہ ہو جاتی۔ یا اگر مجھے علم ہوتا کہ شیریں کے صرف اُس گھر میں پیچھے رہ جانے سے میرے سر پر یہ قیامت ٹوٹ پڑے گی تو میں نوکری سے استعفیٰ دے دیتا لیکن شیریں کو مری ضرور لے جاتا۔

میرے دوست اور اُس کی بیوی کے چلے جانے کے بعد گھر میں صرف میرے دوست کی والدہ، اُس کا چھوٹا بھائی پرویز، شیریں اور ایک ملازم

ہی رہ گئے۔ پرویز اگرچہ دفتر میں ملازم تھا مگر جانے یہ کس قسم کی ملازمت تھی کہ وہ اکثر گھر پر ہی ہوتا تھا۔ والدہ رسوئی میں اپنے کام دھندوں میں لگی رہتیں۔ نوکر دوسرے کاموں میں مصروف رہتا۔ اُدھر میں نے مکان کی تلاش شروع کر دی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں گھر میں بات شروع کر دوں گا اور والدہ کو منالوں گا کہ اپنے رشتہ داروں میں جو انھوں نے میری منگنی کی بات طے کر رکھی ہے وہ توڑ دیں کیونکہ میں نے شادی کر لی ہے اور اس طرح ظاہر ہے کہ میرے بڑے بھائی کبھی مجھ سے کلام نہیں کریں گے اور مجھے معاف نہیں کریں گے۔ لیکن والدہ چونکہ مجھ سے بے حد پیار کرتی ہیں وہ مجھے معاف کر دیں گی اور میری خواہش پر الگ مکان میں میری بیوی شیریں کے ساتھ رہنے پر تیار ہو جائیں گی۔ کیونکہ بہرحال میں زیادہ دیر تک شیریں کو اپنے دوست کے مکان پر رکھنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اگرچہ وہ لوگ شیریں کو بے حد پیار کرتے تھے۔ اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے اور اس کی ہر بات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ میری بیوی تھی۔ دوسرے اس خیال سے بھی کہ شیریں اپنے ماں باپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اُن کی محبتوں کی قربانی دے کر اِس گھر میں آئی تھی۔ اُس گھر میں چھوٹا بڑا شیریں کی عزت کرتا اور اُسے احترام بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ پرویز بھی اُسے باجی کہتا اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے پر تیار ہو جاتا۔

اس دوران میں میرے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔

میں ہر روز دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے واپس آنے کے بعد شیریں کے پاس تین چار گھنٹے بسر کرتا اُس کے ساتھ کھانا کھاتا۔شبزاِن والے چوک سے اُسے گجرے لاکر دیتا۔ اُس سے محبت بھری باتیں کرتا۔ اُس کے ہاتھوں کو چُوم چُوم کر اپنے ہونٹ تھکا دیتا۔ اپنے ہاتھوں سے شیریں کے جوڑے میں موتئے کے پھُول سجاتا۔ کمرہ اندر سے بند کرکے اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر اُسے گھنٹوں پیار کرتا۔ اُس کے خوبصورت جسم کے ایک ایک ذرّے کو محبّت اور عقیدت سے بوسہ دیتا اور اگلے روز کی ملاقات کے خیال سے لبریز دل لے کر شیریں سے رخصت ہوکر واپس اپنے ماں باپ کے ہاں آجاتا۔

میرے دوست کی فیملی کومری گئے شاید ہفتہ بھر ہی ہُوا تھا کہ میں نے شیریں کے روّیے میں ہلکی سی تبدیلی محسوس کی۔ میں نے اُسے بالکل اہمیّت نہ دی۔ اگرچہ جس آدمی کو صبح سے شام تک ایک عورت کا بھرپور پیار ملتا رہا ہو وہ ہلکی سی تبدیلی کو بھی پوری شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن میں نے کوئی خیال نہ کیا مگر شیریں کے رویے میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی۔ وہ کچھ چُپ چُپ سی رہنے لگی۔ میں پریشان ہوگیا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو مُنہ دوسری طرف پھیر کر بولی :

"یونہی ذرا طبیعت خراب ہے۔"

"کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟"

"جی نہیں —— ایسی کوئی بات نہیں۔"

لیکن اُس خاموشی کی تہہ میں ایک بھیانک بات کے جراثیم پرورش پا رہے تھے۔ اندر ہی اندر لاوے نے پکنا اور کھولنا اور سسکارنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے صرف اُس وقت علم ہُوا جب آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑا۔ اور دہکتے ہوئے لاوے نے میرے گھر میں چاروں طرف آگ لگا کر اُسے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

دو تین دن کے بعد شیریں نے مجھ سے گفتگو کرنا کم کر دیا۔ میری دس باتوں کا جواب وہ صرف ایک بات میں دینے لگی۔ اگر میں پریشان ہو کر اس کی وجہ پُوچھتا تو یُونہی سر درد کا بہانہ بنا کر چُپ ہو جاتی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔ میں نے اس دوران میں شیریں کو کبھی کسی بات پر نہیں ٹوکا تھا۔ اُس سے کبھی اُونچی آواز میں بھی بات نہیں کی تھی۔ دل دُکھانا تو بڑی دُور کی بات ہے۔ میں نے تو کبھی کوئی ایسی بات بھی نہیں کی تھی جو اُس کی نازک طبع پر گراں گزرتی۔ میں تو اُس سے محبت کرتا تھا اور مرتے دم تک صرف محبت کرنا، اُس کی پُوجا کرنا اور اُس کے نام کی مالا جپنا چاہتا تھا۔ شادی کے بعد میری اس

محبت، عقیدت اور پرستش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ تو ایسی بات تھی کہ مُورتی خود مندر سے چل کر پجاری کے گھر آجائے اور وہ صبح شام اُس کی پُوجا کر کے نہال ہو رہا ہو۔ میں اُس کے لیے گجرے لاتا۔ دوسرے تیسرے کچھ نہ کچھ خرید کر لے آتا۔ کبھی کوئی جُوتا، کبھی قمیض یا شلوار کا کپڑا، کبھی میکس فیکٹر کا باکس اور کبھی ٹاپس یا کانٹوں کی جوڑی ——

میں تو شیریں کو زیادہ سے زیادہ خوش و خرم دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا میں جانتا تھا کہ وہ بڑی قربانی کر کے میرے پاس آئی ہے اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے محبّت کرتے آ رہے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر زندہ تھے۔ میرے لیے تو شیریں کی خاموشی اور مجھ سے بے رخی موت کے برابر تھی۔ میں شیریں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتا اور اُس سے پُوچھتا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ مجھ سے گریز کیوں کرنے لگی ہے؟ وہ خاموش کیوں رہتی ہے؟ کیا ماں باپ کی جُدائی کا خیال ستانے لگا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ ان سب باتوں کا جواب شیریں صرف ایک جملے سے دیتی

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ میں زیادہ پریشان ہو رہی ہوں۔"

میں اپنا سر پکڑ کر رہ جاتا۔

اب اُس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرنا اور دروازے میں آ کر میرا خیر مقدم کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں دفتر جانے سے پہلے گھر

میں آتا تو وہ کمرے میں پلنگ پر لیٹی ہوتی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر مسرت کا ہلکا سا نشان بھی نمودار نہ ہوتا۔ خوشی کی ایک لہر بھی نمودار نہ ہوتی۔ وہ میرے لیے ناشتہ بھی تیار نہ کرتی۔ شام کو دفتر سے واپس ہو کر آتا تو اُسے دیکھتا کہ وہ میرے دوست سرفراز کی والدہ کے پاس رسوئی میں بیٹھی اُن سے باتیں کر رہی ہے۔

جُونہی وہ میری شکل دیکھتی چُپ ہو کر آنکھیں جُھکا لیتی۔ میں اُسے اندر کمرے میں بُلاتا تو بجُھے بجھے دل کے ساتھ اندر آجاتی۔ پیار کرتا تو دونوں بازو نیچے گرا کر اپنا مُنہ میرے آگے کر دیتی۔ میرا تو سر چکّر کھا گیا۔ میں نے ایک روز شیریں کے پاؤں تھام لیے۔

”خُدا کے لیے شیریں کچُھ تو کہو کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم مجھ سے کس بات پر ناراض ہو۔ تم مجھ سے گریز کیوں کرنے لگی ہو۔ کیا تمھارا دل مجھ سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ میرے پیار سے بھر گیا ہے؟ کیا تم واپس اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتی ہو۔ آخر تم مجھے میرے کس گناہ کی سزا دے رہی ہو۔ میں نے تم سے کیا زیادتی کی ہے۔ جس کا تم مجھ سے بدلہ لے رہی ہو؟ کم از کم مجھے میرا قصور تو بتا دو۔ تم ایک بار تو کہو کہ شاید تم نے جو فلاں بات کی تھی، وہ مجھے ناگوار گزری ہے۔ تم ایک بار تو میری کسی گستاخی پر انگلی رکھ دو۔“

شیریں نے ہر بات پر یہی کہا :

"کسی کا کوئی قصور نہیں۔ بس میری طبیعت ٹھیک نہیں کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"لیکن تم ماں جی سے تو بڑی گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ آخر مجھے دیکھتے ہی تمھیں کیا ہو جاتا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔"

اتنا کہہ کر وہ پلنگ پر سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا پریشان سر تھام لیا۔ شیریں کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی تو اس کی مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہیں ہوا کہ اُس نے مجھ سے نفرت شروع کر دی ہے۔ ابھی تو اس کے رخساروں پر شادی کی افشاں بھی میلی نہیں ہوئی۔ ابھی تو اس کے جسم سے شادی کی رات کے عطر کی خوشبو بھی ضائع نہیں ہوئی کہ اُس نے مجھ سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ شیریں کو کیا ہو گیا ہے میرے خدا —؟ کیا اُس کے دل سے میری محبت کم ہونا شروع ہو گئی ہے؟ پاک پروردگار! اس سے پیشتر کہ شیریں کے دل سے میری محبت ختم ہو اور وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے مجھے اس دنیا سے اٹھا لینا۔ میں شیریں کے ہاتھوں ہلاک ہو جانا اپنی سعادت سمجھوں گا مگر اُس کی نفرت برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میں نے جس پودے کو اپنے خون سے سینچا ہے اُسے خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے تہس نہس ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے جس مکان کی کھڑکیاں

سے ہمیشہ پھولوں کی بارش ہوتے دیکھی ہے وہاں سے اپنے اوپر پتھر برستے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ میں نے جن آنکھوں میں سوائے اپنے پیار کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ اُن آنکھوں کو میں بے رخی سے پھرتے کیسے دیکھ سکتا ہوں نہیں نہیں۔ ایسا منحوس دن دکھانے سے پہلے ہی تو مجھے اس دنیا سے اُٹھا لینا۔ اس سے پیشتر کہ شیریں نفرت سے میری طرف منہ پھیرے میری آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینا۔ اس سے پہلے کہ شیریں کے منہ سے نفرت کے بول نکلیں میرے کانوں میں کھولتا ہوا زہر بھر کر میری سماعت مجھ سے چھین لینا۔ میں شیریں کی بے رُخی کو موت پر ترجیح دوں گا۔ میں شیریں کی نفرت سے خودکشی زیادہ آسان اور بہتر سمجھوں گا۔ میں چپکے سے اپنا سر ریلوے لائن پر رکھ دوں گا مگر یہ برداشت نہیں کروں گا کہ شیریں اپنے پاؤں میں ٹھکراتی پھرے۔ میں دریا میں چھلانگ لگا دوں گا۔ لیکن اپنے دامن میں شیریں کی نفرت کے دہکتے ہوئے انگارے نہیں اٹھاؤں گا۔ میں شیریں کی محبت میں مر جاؤں گا مگر اُس کی نفرت میں زندہ نہیں رہوں گا۔

لیکن میری ایک بھی دعا قبول نہ ہوئی۔ شیریں بدستور مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ اب اگر وہ ماں جی کے پاس بیٹھی ہوتی تو میرے دو تین بار بلانے پر اندر آتی اور جب میں اُسے پیار کرنے لگتا تو اپنا جسم چُرا کر پرے ہٹ جاتی۔
”نہیں نہیں شاہد! میں پریشان ہوں۔ اگر مجھ سے محبت کرتے ہو

تو مجھ سے صرف باتیں کرو۔ پیار مت کرو۔ مجھے صرف دُور سے دیکھو۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سر جھکانے لگا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شیریں؟ میں تمھیں پیار کیے بغیر کیونکہ زندہ رہ سکتا ہوں؟"

"میں نہیں جانتی۔"

میں نے شیریں کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے پیر پیچھے کھینچ لیے۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔"

"پھر مجھے اپنے ہاتھوں زہر دے دو شیریں! اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹ دو۔ خنجر میرے سینے میں اتار دو۔ مگر خدا کے لیے مجھ سے کنارہ کشی نہ کرو۔ کم از کم مجھے میرا قصور تو بتا دو۔ تمھیں آخر ہو کیا گیا ہے۔ تم پریشان کس لیے ہو؟ کیا تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟ اگر ایسی بات ہے تو آؤ میں تمھیں خود وہاں چھوڑ آتا ہوں۔ تم چاہے مہینہ وہاں جا کر رہ لو۔ میں روز وہاں آکر تمھیں دیکھ جایا کروں گا۔ میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں شیریں! مجھے صرف تمھاری خوشی منظور ہے۔ چاہے اس کی خاطر مجھے اپنی زندگی کو ہی کیوں نہ ختم کر دینا پڑے۔ تم کوئی بات تو کرو۔ یہ انقلاب کیسا آگیا ہے۔ یہ طوفان کہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا ہے؟"

مگر شیریں نے مجھے کچھ بتانے کی شاید قسم کھا رکھی تھی۔ میرا چہرہ غم سے اُتر گیا تھا۔ چہرے پر پریشانی کے آثار رہنے لگے تھے۔ دماغ ہر وقت تفکّرات میں اُلجھا اُلجھا رہنے لگا تھا۔ دفتر میں ذرا جی نہ لگتا تھا۔ کام کچھ کرتا تھا۔ دماغ کچھ سوچتا تھا۔ بات کسی سے کرتا تھا اور مُنہ کسی کا تکتا تھا۔ میری حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔

کوہ مری سے سرفراز کا خط آیا کہ وہ اتوار کی رات کو واپس لاہور آ رہے ہیں۔ میں ہفتے کی صبح کو دفتر جانے سے پہلے حسبِ معمول شیریں سے ملنے، اُس کی بے رُخی اور نفرت کے تیر اپنے سینے پر لینے کے لیے آیا۔ اُس روز بڑے زور کی آندھی آئی ہوئی تھی۔ جب میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو ڈرائینگ روم کے دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کُھلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شیریں کرسی پر بیٹھی ہے اور اُس نے دونوں ٹانگیں پلنگ پر رکھی ہوئی ہیں اور پلنگ پر سرفراز کا چھوٹا بھائی پرویز بیٹھا ہے اور دونوں خوب گُھل مل کر باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر شیریں نے پاؤں اُٹھا لیے اور پرویز اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔ اگرچہ مجھے پرویز پر اور سب سے بڑھ کر شیریں پر اس قسم کا شک زندگی کے کسی بھی مرحلے پر کبھی نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی مجھے شیریں کا پرویز کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بیٹھ کر اس طرح باتیں کرنا ناگوار گزرا۔ جبکہ وہ مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ لیکن میں نے

شیریں سے کوئی گلہ نہ کیا۔ بلکہ اُس کی دلجوئی ہی کی اور اُس سے محبت بھری باتیں کرنے لگا۔ شیریں نے کچھ لمحوں کے لیے میری باتیں سُنیں اور پھر اُٹھ کر کسی کام کا بہانہ بنا کر باہر نکل گئی۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اُس بے عزّت مہمان کی طرح جسے میزبان یہ کہہ کر اُٹھ جائے کہ اس گھر سے ابھی نکل جاؤ۔

مگر میں اُس گھر سے نکل کر کہاں جاتا؟ شیریں کے در سے اُٹھ کر کس کے سنگِ آستاں کو اپنی سجدہ گاہ بناتا؟ میں اس ہزیمت اور احساسِ شکست خوردگی کی اذیّت کو چُپ چاپ سہہ گیا۔ آنکھیں بند کر کے نفرت کے اُس زہر بھرے گھونٹ کو پی گیا۔ یہ شیریں کی نفرت کا پانچواں روز تھا۔

چھٹے روز سرفراز اور عشرت بھابی مری سے واپس آگئیں۔ جب شیریں کی بے اعتنائیوں کا علم ہُوا تو انھیں بھی بہت افسوس ہُوا۔ بھابی عشرت نے شیریں کو سمجھانے کی اور اس سے نفرت کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ اس کے بعد میں نے اس بات کو خاص طور پر محسوس کیا کہ شیریں اُن لوگوں سے میری عدم موجودگی میں بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی اور اُن سے خوب گھُل مل کر باتیں کرتی تھی اور اُن کے ساتھ خوش بھی رہتی تھی لیکن میری صورت دیکھتے ہی اُس کا چہرہ اُداس ہو جاتا اور وہ مُنہ لٹکا لیتی۔

ایک دن بھابی عشرت نے مجھے کہا:

"بھائی جان! اگر وہ آپ کو پسند نہیں کرتی تو آپ کیوں اُس کی خوشامدیں کرتے پھرتے ہیں؟ آپ اگر چاہیں تو اس سے بہتر لڑکیاں آپ کو مل سکتی ہیں۔"

میں نے جواب دیا:

"بھابی یہ بات نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں صرف ایک لڑکی سے محبّت کی ہے اور اس لڑکی کا نام شیریں ہے۔ اگر شیریں دس ہزار مردوں کی ٹھوکریں کھا کر بھی میرے پاس آجائے اور یہ کہے کہ شاہار مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ میں اپنے اعمال پر شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ تو میں اس کو معاف کر دوں گا اور سب کچھ بھلا کر اُسے پھر سے اپنے سینے سے لگا لوں گا۔ ٹھیک ہے آپ نے بھی سرفراز بھائی سے محبت کی ہے۔ آپ نے بھی محبت میں ایک سے ایک بڑھ کر قربانی کی ہے اور میں ان قربانیوں کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ لیکن میں شیریں سے دُنیا والوں ایسی محبت نہیں کرتا۔ ایسی محبت جس کی ایک آنکھ اپنی محبوبہ پر اور دوسری آنکھ اپنی عزّت اور دُنیاوی حیثیّت پر ہوتی ہے میں اُس کی محبت کا دیوانہ ہوں۔ میں شیریں کی محبت اور اس کا پیار چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔ اگر اس کی محبّت مجھے دُنیا کی نظر میں دو کوڑی کا بھی بنا دے تو

بھی میں کائنات کا شہنشاہ ہوں گا۔ بشرطیکہ شیریں میرے پاس ہو اور شیریں کی محبت صرف میرے لیے ہو۔"

بھابی عشرت نے اس کے بعد کچھ نہ کہا۔

شیریں کو میں اُس گھر میں لایا تھا۔ اُس کو وہاں جو عزّت ملی تھی جو سماجی حیثیّت حاصل ہوئی تھی وہ صرف میری وجہ سے ہی تھی۔ لیکن شیریں نے مجھے بھلا کر، مجھے پسِ پُشت ڈال کر اُن لوگوں سے اپنے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ جس طرح کوئی پیاسا مسافر دریا پر پہنچ کر اُس چھوٹے سے چشمے کو بھلا دے جس نے تپتے ہوئے ریگستان کی کڑکتی دھوپ میں اپنے شفاف پانی سے اُس کی پیاس بجھائی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوتا تو دیکھتا کہ شیریں صحن میں یا ڈرائینگ رُوم میں ان لوگوں کے درمیان بڑی خُوش خوش بیٹھی ہے۔ میں بھابی عشرت کو سلام کرتا اور اُن کی باتوں میں شریک ہو جاتا۔ میں دیکھتا کہ شیریں مجھ سے آنکھ ملاتے ہوئے کتراتی۔ میں بات کرتا تو صرف ہوں یا ہاں میں جواب دیتی۔

ایک دن میں اُس کے اس رویّے سے بے حد پریشان ہو گیا۔ میں دفتر سے واپس آیا تو دیکھا کہ شیریں، بھابی عشرت، ان کی ساس اور پرویز کے ساتھ باہر دالان میں بیٹھی اُن سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر کی چند ایک باتوں کے بعد شیریں سے کہا:

"شیریں! ذرا اندر تو آنا۔"

"کیا بات ہے؟"

شیریں نے سب کے سامنے مجھ سے یُوں پوچھا جیسے ہم دونوں کے درمیان میاں بیوی والی کوئی رازداری نہیں تھی۔ حالانکہ اُسے یہ احساس ہونا چاہیے تھا کہ ایک خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تخلیے میں لے جاکر اُس سے بات کرے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شیریں کے دل میں اُس وقت کیا تھا اور وہ کس شخص کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ مجھے خاوند تسلیم نہیں کرتی یا یہ کہ اُس کے میرے ساتھ بیویوں والے تعلقات نہیں ہیں۔ مجھے شیریں کی یہ بات ناگوار لگی۔ لیکن میں تو چھ روز سے یہ زخم برداشت کرتا چلا آرہا تھا۔ میں نے شیریں کا یہ تیر بھی برداشت کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا:

"شیریں! صرف ایک منٹ۔"

شیریں با دلِ نخواستہ اُٹھی اور میرے ساتھ کمرے میں آگئی۔ اندر آتے ہی اُس نے مُنہ پُھلا کر بڑی نفرت سے کہا:

"کیا آپ ایک منٹ ایک منٹ کرتے رہتے ہیں۔ آخر کیا کہنا ہے آپ کو؟"

میرا دماغ سُن ہو گیا۔ مجھے گویا کسی نے زندہ زمین میں دفن کردیا۔ میرا

جسم آگ کا شعلہ بن کر بھڑکنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ یا تو میں اپنے سینے میں خنجر اتار لوں اور یا شیریں کو کسی اُونچی پہاڑی کی چوٹی سے وادی میں دھکا دے کر خود بھی اُس کے ساتھ ہی چھلانگ لگا دوں۔ میں نے زندگی میں اتنی ذلّت اور ہزیمت کبھی نہیں اُٹھائی تھی مگر مجھے شیریں سے محبت تھی۔ میں اُس سے پیار کرتا تھا اور پیار نے مجھے تشدّد نہیں بلکہ ہمدردی، ایثار اور قربانی کا درس دیا تھا۔ میں خود ذلیل ہو سکتا تھا لیکن شیریں کی عزّت پر حرف آجائے۔ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے شیریں کا ہاتھ تھام لیا۔ شیریں نے ہاتھ چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ میں نے کہا:

"شیریں! تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ تم وہی شیریں ہو جو بس سٹاپ پر گھنٹوں کھڑی ہو کر میری راہ دیکھا کرتی تھی؟ تم وہی شیریں ہو ناں جو میری ذرا سی تکلیف پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو جاتی تھی؟ تم وہی شیریں ہو ناں جو چلچلاتی دھوپ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر مجھ سے نکاح کرنے اکیلی گھر سے چل پڑی تھی؟ اگر تم وہی شیریں ہو تو آج تمھاری محبت نفرت میں کیوں بدل گئی ہے؟ اور اگر تم وہ شیریں نہیں ہو تو مجھے بتاؤ تم نے اُس پہلے والی شیریں کو کہاں دفن کر دیا ہے؟"

شیریں خاموش بیٹھی میری باتیں سنتی رہی۔ پھر سر جھکا کر بولی:

"میں نہیں جانتی۔ مجھے کیا ہو گیا ہے شاہد۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں تم سے نفرت نہیں کرتی۔"

"نفرت نہیں کرتیں شیریں تو پھر مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتیں۔ پھر تمھارا یہ بے رُخی کا رویّہ یہ ذلیل سلوک کس لیے ہے؟ کیوں ہے؟ جواب دو شیریں! جواب دو، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ میں خود نہیں جانتی۔"

اور اتنا کہہ کر وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔ میں پھر کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اُس کمرے میں جہاں شادی کی پہلی رات کو میرے پہلو میں لیٹ کر شیریں نے کبھی نہ مٹنے والی محبت کی قسمیں کھائی تھیں۔ عہدِ وفا کی درازیٔ عمر کی دُعائیں مانگی تھیں۔ میرا دل خُون کے آنسو رونے لگا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں وہ رات وہیں بسر کروں گا۔ میں نے سکوٹر اندر رکھوا دیا اور خود سلیپنگ سوٹ پہن کر دوسری طرف دالان میں جا کر لیٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ شیریں میرے پاس ضرور آئے گی مگر وہ نہ آئی۔ مجھے اُس کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دوسری جانب والے دالان میں بھابی وغیرہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ میرے دل پر انگارے لوٹ رہے تھے اور دماغ اس قدر ماؤف ہو چکا تھا کہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اُس کی خالی چارپائی میرے پاس ہی بچھی ہوئی تھی۔ کافی دیر کے بعد وہ آئی اور یہ سوچ کر کہ میں سو رہا ہوں

اپنے بچھونے پر لیٹ گئی۔ میں نے کروٹ بدل کر کہا:

"شیریں! ذرا میرے پاس آجاؤ۔"

"کیا بات ہے؟" اُس نے روکھے پن سے کہا۔

"تم سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔"

"میں بہت سن چکی ہوں۔"

"شاید اس کے بعد تم سے کبھی کوئی بات نہیں کروں گا۔"

شیریں بے دلی سے اُٹھ کر میری چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے اُٹھ کر اُس کا خوبصورت چہرہ جو کبھی محبت سے مجبور ہو کر پہروں مجھے دیکھا کرتا تھا اور جو آج بے رُخی سے دوسری طرف تک رہا تھا اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"شیریں! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور آخری محبت کی ہے۔ میں تمھاری نفرت برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف ایک پل کے لیے بتا دو کہ تم مجھ سے نفرت کیوں کرنے لگی ہو۔ پھر میں چپکے سے تمھاری زندگی سے نکل جاؤں گا اور صرف تمھاری خوشی کی خاطر کبھی تمھیں اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا۔"

لیکن شیریں وہی ہوں ہاں کرتی رہی اور یہی کہتی رہی کہ اُسے خود بھی نہیں معلوم کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ ساری رات میں اُس کے پاس بیٹھا رہا مگر اُس لڑکی نے پیار کا ایک جھوٹا بول کہہ کر بھی میری تسلّی نہ کی۔ جب میں اُسے پیار کرتا تو وہ بے حس

مجسمے کی طرح میرے سامنے آجاتی۔ اپنا منہ میری طرف کرکے آنکھیں بند کر لیتی۔ جیسے بوسہ مجھے دے رہی ہو اور تصوّر میں کوئی دوسرا ہو۔ میرے کلیجے پر چھریاں چل رہی تھیں۔ دل میں کوئی کانٹے چبھو رہا تھا۔ میرے ساتھ وہ لڑکی لیٹی ہوئی تھی جس نے ڈھائی تین سال تک مجھ سے محبت کی تھی۔ مجھے اپنا پیار دیا تھا۔ جس نے پیار کی خاطر دُنیا کی ہر شے تیاگ دی تھی جو میری بیوی بن گئی تھی مگر بیوی بننے کے بعد جبکہ اُسے مجھ سے زیادہ شدّت سے محبت کرنے کا موقع ملا تھا اُس نے مجھ سے نفرت شروع کردی تھی۔ جب میں شیریں سے لپٹ کر اُسے پیار کر رہا تھا تو اُس کا بدن برف کی سل کی طرح میرے ساتھ پڑا تھا۔ اُس میں محبت کی گرمی کی ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اسی طرح دن چڑھ گیا۔ رات میری ناکامیوں پر قہقہے لگاتی، میری ناکام محبت کی ہنسی اُڑاتی گزر گئی۔ کبھی یہ رات شیریں کے ساتھ جاگ کر میری پُوجا کیا کرتی تھی۔ آج وہ شیریں کے ساتھ مل کر میرے پیار کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ محبت میں انسان ناکامی برداشت کر لیتا ہے۔ جُدائی اور دکھ درد سہہ جاتا ہے مگر تمسخر برداشت نہیں کر سکتا۔ شاید دنیا میں محبت کا مذاق اڑانے سے بڑھ کر اور کوئی گھناؤنا گناہ نہیں ہے۔

صبح میں دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو پھر پریشان ذہن اور ویران خیالات اور زخمی دل لیے اُس گھر میں آن داخل ہوا۔ ڈرائینگ روم میں مل کر کھانا کھایا۔ جب کھانا شروع کرنے لگے تو پرویز وہاں نہیں تھا۔ شیریں بولی:

"پرویز کا انتظار کر لیں۔ وہ بھی آ جائے تو پھر کھانا شروع کریں گے۔"

میں کچھ حیران سا ہوا کہ آخر شیریں کو پرویز کا اتنا خیال کیوں رہنے لگا ہے کہ وہ اُس کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتی۔ لیکن ہائے محبت کرنے والوں کا معصوم دل و دماغ — ہم لوگ جو صرف دُنیا میں محبت کرنے، اس دُنیا کی بدصورتی کو حُسن اور دلکشی میں تبدیل کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ کبھی اس دُنیا میں رہنے والوں کی مکر کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے چہرے تو سُورج کی طرف ہوتے ہیں اور ہم روشنی کی تلاش میں چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ لوگوں نے ہمیں پھنسانے، ہمیں اُلجھانے کے لیے راستے میں اندھیروں کے کتنے جال پھیلا رکھے ہیں۔ کنول کا بے داغ پھول اگر اپنے تالاب کے کیچڑ کا خیال کرنے لگے تو شاید وہ اُس تالاب میں رہ کر سُورج اور چاند کی کرنوں سے کبھی زندگی کی حرارت اور خوشبو حاصل نہ کر سکے۔

پرویز آ گیا تو شیریں نے ہمارے ساتھ مل کر کھانا شروع کیا۔ کھانے کے بعد باقی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے مگر پرویز وہیں بیٹھا رہا۔ اب ہمیں بھی آرام کرنا تھا۔ مگر پرویز وہاں سے اُٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں نے پُوچھا:

"پرویز میاں تم کہاں آرام کرو گے؟"

"بس بھائی جان اسی جگہ پڑے رہیں گے۔"

ہیں خاموش ہوگیا اور پرویز قالین پر لیٹ گیا۔ میں نے شیریں کی طرف دیکھا۔ شیریں نے گردن جھکا کر کچھ اس طرح اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آخر میں نے بے شرم بن کر اُسے کہہ ہی دیا۔

"پرویز بھائی! ایسا کرو اگر دوسرے کمرے میں پنکھا نہیں تو تم ہمارا یہ پنکھا اُدھر لے جاؤ اور دوسرے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

کُند ذہن پرویز پہلو بدل کر اُٹھا:

"اچھا جی! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔"

اور دوسرے کمرے میں چل دیا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہُوا جیسے وہ شیریں کی شہ پر وہاں بیٹھا ہو جیسے اُن دونوں نے مجھے برباد کرنے کا کوئی خفیہ منصوبہ بنا رکھا ہو مگر میں تو شیریں کی ذات سے اس قسم کی ذلالت کبھی وابستہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں تو یہ تصوّر میں بھی خیال نہیں کر سکتا تھا کہ شیریں اپنے خوبصورت جوان، خوش لباس، خوش اطوار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیوانوں ایسی محبت کرنے والے محبوب خاوند کو چھوڑ کر ایک کُند ذہن، بے مغز اور بے رنگ ایک سو روپے کے کلرک سے بھی اپنا ناطہ جوڑ سکتی ہے۔ کاش اُس وقت میں آنکھوں پر سے شیریں کے آنچل کا سایہ ہٹا کر اس تلخ ترین دُنیا کے ٹھوس حقائق کا بغور مطالعہ کر سکتا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا کہ یہاں بہن کی لاش کا سودا بھائی بھی کر سکتا ہے۔ یہاں خاوند کی آبرو کا نیلام بیوی کے

ہاتھ سے بھی اُٹھ سکتا ہے۔ یہاں ماں کے کلیجے میں بیٹے کا خنجر بھی اُتر سکتا ہے اور یہاں محبوبہ اپنے محبوب کا کلیجہ بھی چبا سکتی ہے۔ اُس رات میں شیریں کی چھاتی پر اپنا سر رکھ کر بہت رویا۔ اتنا رویا کہ میری ہچکی بندھ گئی شیریں اپنی شدید نفرت کے باوجود بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ کبھی کبھی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

"شاہد! تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیوں رو رہے ہو۔ میں تمھاری دوست ہوں اور سدا تمھاری دوست رہوں گی۔"

"تو کیا دوستی میں نفرت کو بھی دخل ہوتا ہے شیریں؟ کیا دوست دوسرے دوست کی محبت کا مذاق بھی اڑا سکتا ہے؟ کیا تین سال تک تم نے مجھ سے صرف اس لئے محبت کی تھی شیریں کہ ایک روز تم مجھ سے نفرت کر سکو؟ کیا میری جھولی میں تم نے اتنے پھول اس لیے ڈال دیئے تھے کہ ایک دن ایک ایک پھول کے عوض تم دس دس مرتبہ میرے سینے کو نفرت کی گرم سلاخوں سے داغو؟ تم مجھے میرے کس گناہ کی سزا دے رہی ہو شیریں؟ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو سہی کہ تم مجھ سے میرے کس جرم کا بدلہ لے رہی ہو؟ میرے لیے تمھاری نفرت برداشت کرنا موت کے مترادف ہے شیریں؟ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھ سے زہر دے دو۔"

لیکن میری کسی بات سے بھی شیریں کا دل نہ پسیجا۔ وہ ٹس سے مس

نہ ہوتی۔ میں اُسے پیار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو وہ اُسے جھٹک دیتی۔ آخر میں غصّے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر تم مجھ سے اس قدر نفرت کرتی ہو تو پھر یہاں میرے پاس کس لیے بیٹھی ہو۔ اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

"چلی جاؤں گی ——"

گویا شیریں اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ ذرا میرے مُنہ سے مجبُور ہو کر ایسا جملہ نکلے اور وہ اُسے بہانہ بنا کر مجھ سے علیٰحدگی کا مطالبہ شروع کر دے۔ میں پاگلوں کی طرح کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اُس میں غرق ہو جاؤں۔ میں شیریں کے مُنہ سے یہ جملہ کبھی نہیں سُن سکتا تھا۔ میں ایسی بات سننے سے پہلے جوالامکھی کے کھولتے ہوئے دہانے میں چھلانگ لگا دینا زیادہ آسان اور بہتر سمجھتا تھا۔ میں سکوٹر لے کر دیوانوں کی طرح شہر کی سڑکوں پر پھرتا رہا۔ شام کو واپس آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیریں نے میری پسندیدہ سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ میں نے صبح باتوں ہی باتوں میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش وہ ایک بار پھر میری خاطر سفید ساڑی زیب تن کر لے۔

شیریں کو سفید ساڑی میں دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے علاوہ شیریں نے میری طرف ذرا سا مسکرا کر دیکھا۔ مجھے تو گویا دو جہانوں کی

دولت مل گئی۔ میں اس کایا پلٹ پر دنگ ہو کر رہ گیا۔ خوشی سے میرے جسم کا ذرہ ذرہ رقص کرنے لگا۔

"آپ کو سفید ساڑی پسند ہے ناں۔ میں نے اسی لیے پہن رکھی ہے"

اُس روز شیریں کی مجھ سے شدید نفرت کا ساتواں دن تھا مگر شام کو اُس کی نفرت یکایک محبت میں بدل گئی تھی۔ یہ کیونکر ہو گیا تھا۔ میرا دماغ اس معمے کو سلجھانے سے قاصر تھا اور پھر مجھے ان باتوں میں پڑنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ شیریں نے کل نات کیا کیا تھا۔ میں ایک ہی آن میں اُسے بھول چکا تھا۔ مجھے تو بس اب صرف یہی یاد تھا کہ شیریں نے صرف میری خاطر سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

میرا خون ایک ہی پل میں کئی سیر بڑھ گیا۔ ساری کھوئی ہوئی توانائی واپس آ گئی۔ میں نے عشرت بھابی اور شیریں اور سرفراز کو ساتھ لیا اور شیزان میں آ گئے وہاں سے میں نے گجرے والے سے سفید پھولوں کے گجرے لیے شیریں نے میرا خیال رکھتے ہوئے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ میں نے اُسے گجرے لا کر دیئے تو اُس نے بڑی محبت سے ان گجروں کو کلائیوں میں پہن لیا۔ میں شیریں کے ساتھ بیٹھا مسرت سے چمکتے ہوئے چہرے سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے آہستہ سے ایک شعر سُنایا جو یہ تھا ؎

رہا یونہی نامکمل غمِ عشق کا فسانہ ... کبھی مجھ کو نیند آئی کبھی سو گیا زمانہ

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کھول کر میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ ذرا ذرا مسکرا رہی تھیں۔ یہ وہی شیریں تھی جو کبھی پلازا کے چوک میں بارش میں کھڑی ہو کر میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ یہ وہی شیریں تھی جو میرے ساتھ سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے کھاتی شیخوپورے جایا کرتی تھی اور جس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو گھٹنوں سہلا سہلا کر میں گرم کیا کرتا تھا۔ اُس رات اُس نے مجھے اپنا بھرپور پیار دیا۔ مگر یہ پیار وقتی اور بے بنیاد تھا۔ وہ اُس روز کسی اپنی بات پر خوش تھی اور اس نے مجھے بھی اپنی خوشی میں شریک کر لیا تھا۔ مجھے بھی اپنی خوشی کی تھوڑی سی خیرات دے دی تھی۔ یہ محبت نہیں تھی بلکہ کشکول میں پھینکا ہُوا تانبے کا ایک سکّہ تھا۔ وہ بات کیا تھی جس کی اُس روز اُسے خوشی تھی؟ اُس وقت صرف شیریں جانتی تھی اور اس وقت میں بھی اُسے جانتا ہوں۔ لیکن میں ابھی اسے بتا کر پڑھنے والوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ پڑھنے والوں پر ابھی محبت کے تقدس کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ابھی انھیں یہ معلوم نہیں ہُوا کہ محبّت میں ایک انسان دوسرے انسان کے اعتماد کا خون بھی کر سکتا ہے۔ اس کے گلے پر پیار کی چھُری چلا کر خُون کے چھینٹے بھی اُڑا سکتا ہے۔ اس کی باہوں میں باہیں ڈال کر اس کے سینے میں خنجر بھی گھونپ سکتا ہے۔ اس کی زندہ لاش پر کسی دوسرے کے پیار کی بنیادیں بھی کھڑی کر سکتا ہے۔ اُس شام وہ بغیر بُرقعے

کے میرے سکوٹر پر سوار ہوئی تھی۔ ہم نے کینال بینک والی نہر کنارے بھی سیر کی تھی اور اپنی کھوئی ہوئی، سوئی ہوئی محبت کی یادگاروں کی پھر سے زیارت کی تھی۔ ایک ایک اُس کے کھنڈر کو جا کر دیکھا تھا۔ ایک ایک قبر پر پھول چڑھائے تھے ۔ اسکے بدلے ہوئے رویّے نے مجھے پیار کا پھر سے یقین دلادیا تھا۔ ہم نہر کنارے گھاس پر جا کر بیٹھ گئے۔ جہاں اس سے پہلے کبھی ہم بیٹھ کر محبت کے عہد و پیمان کیا کرتے تھے۔ شیریں نے ہلکی ہلکی لپ سٹک لگا رکھی تھی۔ ہم نو بجے کے قریب واپس آ گئے۔ چاندنی رات میں وہ میرے سکوٹر پر بیٹھی تھی۔ جب ہم قبروں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تو چاندنی اُس کی سفید ساڑی پر پڑ کر اور بھی نکھر گئی تھی۔ شیریں اس پاکیزہ لباس میں کوئی آسمانی مقدّس پری معلوم ہو رہی تھی۔ جو گھڑی پل کے لیے اس دُنیا میں اتر آئی ہو۔ اُس رات جب میں نے اُس سے کہا کہ شیریں کہیں پھر مجھے بُھلا تو نہیں دو گی؟ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگو گی؟ تو اُس نے کہا تھا:

"نہیں شاہد! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیوں ہو جاتا ہے۔ یہ میں خود بھی نہیں جانتی۔"

لیکن دوسرے ہی روز پھر ایسا ہو گیا اور ایسا کیوں ہو گیا تھا؟ یہ شیریں اچھی طرح جانتی تھی۔ تب میں بے خبر تھا۔ لاعلم تھا مگر اب میں بھی اچھی طرح جان گیا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کبھی میری شیریں ایسا بھی کر سکتی ہے؟

نہیں نہیں! شیریں ایسا نہیں کر سکتی۔ پھولوں اور وادیوں میں رہنے والی گندے نالے پر اپنا مکان کبھی نہیں بنا سکتی۔ تتلیوں اور سورج کی کرنوں سے پیار کرنے والی کبھی گندگی پر اڑنے والی مکھیوں کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سورج کے نکلتے ہی دن کی روشنی پھیلنے کی بجائے چاروں طرف موت کی تاریکی پھیل جائے اور ریتیلے صحراؤں سے اٹھنے والی ہوائیں، موسلا دھار مینہ برسانا شروع کر دیں۔ اس کے باوجود میں شیریں کی محبت حاصل نہ کر سکا۔ میں جو اس کی محبت کا سب سے زیادہ حق دار تھا اور جسے خدا نے بنایا ہی صرف میرے لیے تھا۔ اتنی خواب انگیز رات بسر کرنے کے بعد دوسرے روز اس کا موڈ پھر بدلا ہوا تھا اور اس کی نفرت کا آٹھواں دن طلوع ہو چکا تھا۔

ذخیرہ کتب

انیس نقوی

03142893816

۱۱

شاید شیریں کو وہ شام یاد ہو۔

دن بھر گرمی رہنے کے بعد شام کو ہلکی بارش سے موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ پھر میں اور میرا دوست، شبیر اور عشرت بھابی تانگے میں بیٹھ کر مال روڈ کے ایک خوبصورت اور ماڈرن ہوٹل میں آ گئے۔ وہ شیریں کی مجھ سے نفرت کا چوتھا روز تھا۔ شیریں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں اپنی شیریں کو دیکھتا رہا۔ سورج مکھی کے پھول کی طرح جس کا چہرہ ہمیشہ سورج کی طرف ہوتا ہے، خواہ دھوپ کھلی ہو اور خواہ بارش ہو رہی ہو۔ شیریں چائے بناتی رہی۔ شاید اس روز میں نے آخری بار شیریں کی ہاتھ سے بنی ہوئی چائے پی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ مجھ سے دور تر ہوتی چلی گئی۔ چائے بنا کر دینا تو بڑی دور کی بات تھی اس نے تو کبھی میری بات کا سیدھے منہ جواب بھی

نہ دیا تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم تانگے میں بیٹھ کر ہی گھر واپس آ گئے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اور بے جان سا اندھیرا ـــــ شیریں کی بے رخی کے باوجود مجھے اُس پر بے حد پیار آ رہا تھا۔ میں نے اُسے فیض کا یہ قطعہ سُنایا۔

رات یُوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

میں اور سرفراز آگے بیٹھے تھے۔ شیریں اور بھابی عشرت تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ میں جتنی دیر تانگے میں بیٹھا رہا۔ گردن پیچھے کیے شیریں ہی سے باتیں کرتا رہا اور اُسی کا چہرہ دیکھتا رہا جو کالے نقاب میں سے گول چاند کی طرح شام کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں چمک رہا تھا۔ اگرچہ شیریں نے اندر ہی اندر مجھ سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھ سے نفرت شروع کر دی تھی۔ اس کے باوجود کم از کم اُس روز تک وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی اور میری ہر بات کا جواب پوری توجّہ اور احتیاط سے دیتی تھی۔

لیکن اس کے بعد اُس نے مجھے ایک بیکار جسم کا مفلوج حصّہ سمجھ کر کاٹ کر الگ پھینک دیا اور کبھی یہ نہ سوچا کہ یہ جو مرجھایا ہوا پھول ہر وقت میرے پاس بیٹھا میری محبت کی بھیک مانگتا رہتا ہے۔ کبھی میرے سر کا تاج

ہُوا کرتا تھا۔ کبھی میرے جوڑے میں لگا مسکرایا کرتا تھا۔ کبھی اس کی پنکھڑیاں میرے ہونٹوں کے ساتھ لگی خوشبو کے خزانے لٹایا کرتی تھیں۔

شروع شروع میں شیریں کے اس اندازِ بے نیازی کو میں اُس کے حُسن کی ایک ادا سمجھا۔ میرے ذہن میں تو ابھی تک وہ وہی سادہ اور معصوم سی بھولی لڑکی تھی جو سیاہ سینڈل پہنے، ہاتھوں میں کاپیاں تھامے شگفتہ کے ساتھ کالج سے نکلا کرتی تھی اور جس کی انگلیوں پر نیلی سیاہی کے نشان ہوتے تھے۔ میرا ذہن تو کبھی اس خیال کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شیریں ایسی نرم و نازک خوش اندام لڑکی ایسے خوفناک اور بہیمانہ فعل کی مرتکب بھی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک معصوم سی لڑکی ہے جو گیند کھیلتے کھیلتے اپنی باری نہ ملنے پر روٹھ گئی ہے اور ذرا سی گدگدی کرنے پر فوراً ہنس پڑے گی۔ اور مان جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ میرا خیال غلط نکلا۔ شیریں نے اپنے دل میں مجھ سے الگ ہو جانے کا پُختہ فیصلہ کر لیا تھا۔ ایسا وہ کیوں کر رہی تھی۔ یہ نقطہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے شیریں سے کبھی کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ میں نے اُس سے اپنی زندگی کی کبھی کوئی بھی کمزوری نہیں چھپائی تھی۔ میری زندگی کی کتاب کا ہر ورق اُس کے سامنے کھلا تھا۔ بلکہ اُس نے تو بقول اپنے میری ہر کمزوری اور خامی سے بھی پیار کیا تھا۔ اگر اُسے میری کسی کمزوری کی وجہ سے مجھے چھوڑنا تھا تو اُس نے شادی سے پہلے ہی مجھے کیوں نہ چھوڑ دیا جبکہ میں نے اُسے پہلی بار

اپنی زندگی کے تاریک گوشوں سے متعارف کروایا تھا۔ مجھے تو حیرت ہے اُس لڑکی پر جس نے مجھ سے دوستی کے ڈھائی سال ثابت قدمی سے نبھائے لیکن شادی شدہ زندگی کے پہلے ہفتے میں ہی اُس کے قدم ڈگمگا گئے۔ جس نے دوست بن کر میری خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے ڈالی مگر بیوی بن کر پندرہ دن کے بعد ہی اُس نے اپنے خاوند کو قربان کر دیا۔ حالانکہ اُس نے میرے دل پر، اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائی تھیں کہ وہ عمر بھر مجھ سے اپنی دوستی اور محبت کے رشتے کو نبھائے گی۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنی قربانیوں اور ایثار سے بھی اپنے اس دعوے کو ثابت کیا۔ لیکن خُدا جانے شادی کے دس پندرہ دن بعد ہی اُسے کیا ہو گیا کہ وہ مجھ سے متنفّر ہو گئی اور اس نے مجھ سے رشتہ محبت توڑ کر کسی دوسرے کو اپنے خوابوں میں بسا لیا۔

یہ دوسرا شخص کون تھا؟ یہ میں ابھی آپ کو نہیں بتانا چاہتا۔ کاش میں زندگی میں کبھی بھی آپ کے سامنے اُس شخص کا نام نہ لے سکتا جس نے شیریں کے پہلو میں میری جگہ لی۔ مجھ پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف اس وقت ہوا جبکہ شیریں مجھ سے طلاق لے کر اپنے گھر جا چکی تھی اور مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکی تھی۔ اگر پہلے بھی اس کا علم ہو جاتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ کم از کم اتنا ضرور کرتا کہ شیریں کو اپنے پاس بٹھلا کر بڑی محبت اور سنجیدگی سے اُسے پوچھتا:

"شیریں! یہ تم نے کیا کر دیا؟ کیا میں اسی لائق تھا کہ تم میری محبت کے

اعلیٰ معیار کو اس طرح ذلیل کرو؟ تم شیر کی غار کو خالی پاکر اُس میں گیدڑ کے لیے جگہ بنا رہی ہو؟ کیا تمھیں یقین ہے کہ شاہین کے نشیمن میں کوّا بھی بسیرا کر سکتا ہے؟ تم اُس اندھیرے میں چراغ جلا رہی ہو جو سُورج کی تابناک روشنی دیکھ چُکا ہے۔ کیا واقعی تم کسی دوسرے سے محبت کرنے لگی ہو؟ شیریں محبت ہو جانا اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اگر تم میرے بعد کسی مجھ سے اعلیٰ انسان سے محبت کرتیں تو میں تمھارے حُسنِ انتخاب کی داد دیتا۔ لیکن تم نے جو مسجد کے پاکیزہ حوض میں وضو کرنے کے بعد گندے نالے میں چھلانگ لگائی ہے تو اب مجھے اپنے حُسنِ انتخاب پر شک ہو گیا ہے کہ کہیں میں اپنی محبت کے لیے تمھیں چُن کر غلطی تو نہیں کر بیٹھا۔"

لیکن ان باتوں کا علم تو مجھے بعد میں ہُوا جبکہ شیریں مجھ سے رخصت ہو چکی تھی اور اُس سے دوبارہ ملنے کا کوئی بھی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ شیریں نے مجھ سے الگ ہوتے میں بھی اُسی ضد اور جرأت سے کام لیا۔ جس ضد اور جرأت کی مدد سے وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے اکثر ملتی رہے گی۔ لیکن پھر وہ مجھے کبھی نہ ملی۔ بھلا جس لڑکی نے میرے ساتھ رہ کر ازدواجی زندگی کے پاکیزہ رشتے کو توڑ ڈالا، وہ مجھ سے دُور رہ کر دوستی ایسے نازک رشتے کو کیسے نبھاہ سکتی تھی؟

شیریں نے عشرت بھابی سے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے طلاق حاصل کرنا چاہتی

ہے۔ بھابی کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے اور مجھے انتہائی ذہنی پریشانی میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ اُسے اس بات پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اُس نے صرف شیریں سے اتنا کہا:

"شیریں! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ تم ویسے تو شاہد بھائی سے نفرت کرتی ہو۔ لیکن جب وہ تمھیں کہتا ہے تو اس کی خاطر سفید ساڑھی بھی پہن لیتی ہو۔"

شیریں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے پاس ایسی کسی بھی بات کا جواب نہیں تھا۔ بھابی عشرت نے اُسے سمجھایا کہ اب جب اُس نے اتنی قربانیوں کے بعد ماں باپ کی ناراضگی مول لے کر شادی کر لی ہے تو اُسے نبھانے کی کوشش کرے مگر شیریں نے ایک نہ سُنی۔ وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ بھابی عشرت نے کہا کہ وہ شام کو شاہد سے یعنی مجھ سے بات کرے گی۔

اس دوران میں شیریں اپنی ایک سہیلی کے ہاتھ اپنے ماں باپ کو دو تین بار یہ پیغام بھجوا چکی تھی کہ میں ہر حالت میں آپ کے قدموں میں دوبارہ واپس آ کر نئے سرے سے زندگی شروع کرنا چاہتی ہوں۔ آپ صرف ایک بار مجھے واپس بلا لیں۔ میں ہر شرط پر آنے کو تیار ہوں۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اُسے معاف کر دیں۔ میں آپ کی ہر بات مان لوں گی۔ یہاں تک کہ اگر مجھے شاہد سے طلاق بھی لینی پڑے تو میں اس پر بھی خوشی سے راضی ہوں۔ لیکن گھر والوں نے اس کا کوئی

جواب نہ دیا۔ شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ شیریں جو غلطی کر بیٹھی ہے۔ اُس کے لیے اچھی طرح پچھتالے۔

اُدھر میں شام کو گھر آیا تو میرا دوست، بھابی عشرت، میں اور شیریں کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں بھی شیریں کے مسلسل نفرت انگیز رویے سے تنگ آگیا تھا اور میری حالت پاگلوں ایسی ہو رہی تھی۔ میری عقل مجھے آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی۔ میرا ذہن شیریں کی نفرت اور پُرانی محبت کے دو پاٹوں میں تقسیم ہو گیا تھا جس کی طوفانی گردش میں میری ساری شخصیت پستی جا رہی تھی میں بھی چاہتا تھا کہ اس روز روز کے جھنجھٹ سے میری رُوح کو نجات مل جائے تاکہ میں کسی ایک مقام پر تو کھڑا ہو سکوں۔ اس وقت تو میں دو طوفانی سمندروں کی غضب ناک موجوں کے درمیان ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے کی طرح پڑا تھا۔ ایک موج اِدھر اُچھال کر لے جاتی تھی اور دوسری موج اُدھر سے پھر ادھر اچھال کر لے آتی۔ بات شروع ہوئی۔ میں نے کہا:

"بھائی جان! شیریں سے صرف اتنا پوچھئے کہ آخر میرا قصور کیا ہے جس کی خاطر وہ مجھ سے اتنی نفرت کر رہی ہے؟ کیا نکاح سے پہلے میں نے اسے اپنی تمام خامیوں اور مجبوریوں سے باخبر نہیں کر دیا تھا؟ آخر یہ میری کس کوتاہی کی آڑ لے کر مجھ سے یہ ذلّت آمیز سلوک کر رہی ہے؟"

میں نے انھیں شیریں کا وہ خط دکھایا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ شاہد میں جانتی ہوں کہ تم مجبور ہو اور اپنے ناگزیر حالات میں پھنسے ہوئے ہو مگر مجھے تم ہر حالت میں قبول ہو کیونکہ میں تم سے محبت کر رہی ہوں، کوئی سودا بازی نہیں کر رہی۔ میں تو اُس وقت کا تصوّر کر رہی ہوں جب میں تمھارے بچّے کو سینے سے لگائے گھر میں بیٹھی تمھاری راہ دیکھ رہی ہونگی۔ اور تمھارا بچّہ اپنے ننھے منّے ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا کرے گا کہ پاک پروردگار میرے ابا جان کو ہر مصیبت اور آفت سے محفوظ رکھنا اور انھیں اپنی رحمت کے سائے میں دفتر سے روز گھر اور گھر سے دفتر پہنچا دیا کرنا اور پھر جس میں اُس نے لکھا تھا کہ شاہد ہمارا پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا گھر ہوگا۔ جس کی چھت پر سفید پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوں گی اور قریب ہی شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا ہوگا اور ہم محبت کے نشے میں چُور ہو کر وہاں اپنی پُرانی یادوں کو پھر سے تازہ کیا کریں گے۔

عشرت بھابی نے کہا:

"شاہد بھائی! یہ سب افسانوی باتیں ہیں انھیں چھوڑ دو۔"

میں نے جلدی سے کہا:

"ٹھیک ہے لیکن شیریں کا تیز دھوپ میں پسینے میں تربتر گھر سے بھاگ کر قبرستان کی گمنام مسجد میں آکر مجھ سے صرف دودھ کے گلاس

پر نکاح کر لینا تو افسانوی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں اور شیریں سے پوچھے کہ اُس کے پاس اس کا کیا جواب ہے ؟"

بھابی عشرت نے شیریں سے پُوچھا تو وہ بولی :

"بھابی جان ! میں یہ زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ میں نے علیٰحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے ۔"

میں نے حیران ہو کر پُوچھا :

"علیٰحدگی کیسی ؟"

بھابی عشرت نے کہا :

"شاہد بھائی ! آپ اُس کا مطلب کیوں نہیں سمجھ رہے ۔ وہ طلاق لینا چاہتی ہے ۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے محسوس کیا کہ چھت کی ایک کڑی ٹوٹ کر میرے اُوپر گر پڑی ہے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس درست کرتے ہوئے شیریں سے پُوچھا :

"شیریں ! کیا تم مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہو ؟" شیریں نے آنکھیں جُھکا رکھی تھیں۔

"ہاں ۔"

"کیوں؟" میں بمشکل اتنا کہہ سکا۔

"میں اس ماحول میں، زندگی کے اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ میں الگ ہوجانا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے؟"

"ہاں۔"

"اُسی طرح جس طرح تم نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا؟"

"ہاں اُسی طرح۔"

"لیکن اُس فیصلے پر تو تم قائم نہیں رہی۔ کیا اس فیصلے پر ثابت قدم رہ سکو گی؟"

"یہ میری زندگی کا آخری فیصلہ ہے۔"

عشرت بھابی نے کہا:

"شاہد بھائی! شیریں مجھے کہہ چکی ہے کہ وہ عمر بھر کے رونے سے صرف ایک پل کے لیے جی بھر کر رو لینے کو ترجیح دے گی۔"

"کیا تمھاری خوشی طلاق میں ہے شیریں؟"

"ہاں۔"

"کیا تم مجھ سے طلاق لے کر خوش رہ سکو گی؟"

"ہاں۔"

"اگر تمھاری خوشنودی اور خوشی اسی میں ہے شیریں تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔ مجھے تمھاری خوشی چاہیے، چاہے اس کے لیے مجھے اپنے کلیجے میں خنجر ہی کیوں نہ گھونپنا پڑے۔ تم کتنے دنوں تک طلاق چاہتی ہو؟"

"سات دنوں کے اندر اندر۔"

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن خود سکتے میں آگیا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے کے بڑے بڑے دھبّے رقص کرنے لگے تھے۔ میں اُس عورت کی زبان سے طلاق کا لفظ سُن رہا تھا جس نے شادی کے بعد مختلف درگاہوں اور مقدّس جگہوں پر جا کر مجھ سے عمر بھر کا ساتھ نبھانے کے عہد کئے تھے۔ وعدے کئے تھے۔ قسمیں کھائی تھیں۔ جس عورت نے سات سات گھنٹے تیز دھوپ اور بارش میں میرا انتظار کیا تھا اب مجھ سے طلاق مانگ رہی تھی۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔

دوسرے کمرے میں جا کر میں کوئی دو گھنٹے تک شیریں سے باتیں کرتا رہا۔ کہنے کو تو میں نے طلاق کی بات کہہ دی تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ کسی نے میرے دل پہ ہاتھ ڈال کر اسے نوچ لیا تھا۔ میں تصوّر نہیں کر سکتا تھا کہ شیریں کو اپنے ہاتھوں کیسے طلاق لکھ کر دوں گا۔ میں نے شیریں کو اپنی محبّت کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ مجھ سے طلاق نہ لے بلکہ اپنے

ماں باپ کے پاس چلی جائے۔ ہم لوگوں کو یہی بتائیں گے کہ طلاق ہوگئی ہے وہاں رہ کر وہ کالج میں پڑھنا شروع کردے۔ بی اے کرے۔ بی ٹی کرے میں اُس کا سارا خرچ برداشت کروں گا۔ پھر جب وہ بی ٹی کر لے گی، تو اس دوران میں اپنا الگ مکان لے لوں گا اور اُس کی طبیعت بھی بہل گئی ہوگی اور ماں باپ کی محبت اُسے دوبارہ حاصل ہوگئی ہوگی۔ پھر وہ میرے پاس واپس آجائے۔ شیریں کے سامنے جب میں نے اپنی محبت کی داستان پہلے لفظ سے دہرائی۔ اُسے محبت کے ایک ایک کھنڈر، ایک ایک پُرانی یادگار، ایک ایک بس سٹاپ، شیخوپورے کی محبت گاہ اور لارنس کے کیبن اور شالامار کے سبزہ زار کی ملاقاتوں کی یادیں تازہ کیں تو اس نے سر جھکا لیا اور اس بات پر راضی ہوگئی کہ وہ مجھ سے طلاق نہیں لے گی۔ میں نے بڑھ کر شیریں کو لپٹا لیا اور خوشی کے جذبے سے بے اختیار ہو کر اُس کا مُنہ چُوم لیا۔

"لیکن میں اپنے ماں باپ کے پاس واپس نہیں جا سکتی۔ میں اسی گھر میں رہوں گی۔ یہ لوگ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شیریں! تم یہاں کیسے رہ سکتی ہو؟"

"پھر میں اپنی کسی سہیلی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"لیکن سہیلی تمھیں کتنی دیر اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔"

"پھر میں کسی دوسری سہیلی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو شیریں! کیا میں یہ برداشت کر لوں گا کہ تم یوں در بدر ماری ماری پھرتی رہو؟"

"میں ہوسٹل میں داخل ہو جاؤں گی۔"

"یہ سب سے اچھی بات ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ تم کالج کے ہوسٹل میں داخل ہو جانا۔ میں تمھارا داخلہ، تمھاری فیس، کتابیں اور دوسرے تمام اخراجات ادا کرتا رہوں گا۔ تم بڑے اطمینان سے تعلیم حاصل کرنا۔ لوگوں کو ہم یہی کہیں گے کہ ہم الگ ہو گئے ہیں۔ یا اس کی بھی کیا ضرورت ہے۔ بس ہم الگ الگ رہیں گے۔ دوسرے تیسرے مل لیا کریں گے۔"

شیریں نے اس تجویز کو بے حد پسند کیا۔ میں بھی خوش ہو گیا۔ مجھ کو تو گویا کھوئی ہوئی جنت مل گئی تھی۔ لیکن میں شیریں کے چہرے پر مسرّت کے جذبات زیادہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ شیریں جیسے بجھ سی گئی تھی۔ پھر بھی مجھ سے اس کی دیرینہ محبّت ایک بار پھر عود کر آئی تھی اور اس کی آنکھوں میں پرانی ملاقاتوں والی گہرائی، نکھار اور پیار آ گیا تھا۔ اس کے باوجود میں شیریں کے سلوک میں ایک بیگانہ پن صاف محسوس کر رہا تھا۔ اس کی وجہ جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی یہی تھی کہ شیریں کسی دوسرے شخص سے عہد و پیمان کر چکی تھی۔

اور اس شرط پر کہ وہ مجھ سے پہلے طلاق حاصل کرے گی۔ لیکن میں ان باتوں سے بے خبر تھا۔ میں تو اِسی خیال سے خوشی میں پھُولا نہیں سمار ہا تھا کہ شیریں نے مجھ سے طلاق لینے کا فیصلہ واپس لے لیا ہے اور وہ اب زندگی میں کبھی مجھ سے جُدا نہیں ہو گی۔

میں شیریں کو ہوسٹل میں داخل کروانے پر محض ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق راضی ہو گیا تھا۔ حقیقت میں میں یہی چاہتا تھا کہ اگر شیریں کو یہ ماحول پسند نہیں تو وہ اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائے۔ میں اُسے خرچ دیتا رہوں۔ وہاں رہ کر وہ پڑھے، تعلیم حاصل کرے اور والدین کی محبّت اور شفقت کے سائے میں اپنا کھویا ہُوا اعتماد اور میری محبت کو پھر سے حاصل کر لے۔ کیونکہ ایسا ممکن تھا کہ اُس کے والدین مجھ سے پوچھیں کہ لڑکی کی شادی تو ہم نے آپ کے ساتھ کی تھی۔ آپ نے اسے ہوسٹل میں یا کسی سہیلی کے گھر کیوں روانہ کر دیا؟ اگر آپ اس کا خرچ نہیں اُٹھا سکتے تھے تو ہمارے پاس واپس بھیج دیا ہوتا۔ لیکن چونکہ شیریں دوسری صورت میں مجھ سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو رہی تھی اس لیے میں نے اس کی اس شرط کو تسلیم کر لیا تھا۔ میں شیریں کو اپنے سے جُدا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس سے جُدا ہو نہیں سکتا تھا۔ میں ہر قیمت پر اُسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اُسے ہوسٹل میں داخل کروانے پر

تیار رہو گیا۔

اس دوران میں جبکہ میں کالجوں میں جا کر داخلے کے لوازمات کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ شیریں کی والدہ نے شیریں کو ایک خط بھجوایا۔ شیریں نے جو اپنے والدین کو اپنی واپسی کے بارے میں اپنی سہیلی کے ہاتھ متعدد پیغامات بھیجے تھے۔ یہ اُن کے جواب میں پہلا خط تھا۔ اس خط میں والدہ نے لکھا تھا کہ گھر آ کر انھیں مل جاؤ۔ شیریں خط پا کر بڑی خوش ہوئی کہ اُس کی ماں نے اُسے مُعاف کر دیا تھا اور اُسے واپس بُلا لیا تھا۔ میں بھی خوش ہُوا۔ کیونکہ اب میں شیریں کو ہوسٹل میں داخل کروانے کی بجائے اُس کے گھر پر ہی رکھ سکتا تھا۔

میں نے کہا:

"شیریں! اب جبکہ تمھاری امّی نے تمھیں معاف کر دیا ہے اور تم واپس جا رہی ہو تو یہ ایک سُنہری موقع ہے۔ تم اپنا تھوڑا بہت سامان بھی ساتھ ہی لیتی جاؤ۔ اِس طرح میری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی کہ تم ہوسٹلوں اور سہیلیوں کے گھروں میں پریشان ہونے کی بجائے اپنے والدین کے ساتھ رہو اور وہیں رہ کر کالج میں پڑھنے جاؤ۔ میں تمھارے سارے اخراجات برداشت کرتا رہوں گا اور ہر روز صبح شام تمھیں ملنے آیا کروں گا۔ کیونکہ گھر بہرحال ایک باعزّت جگہ ہے۔"

شیریں جانے کی تیاری میں بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اُس نے کنگھی میں پھنسے ہوئے بالوں کو نکالتے ہوئے کہا:

"نہیں ابھی سامان یہیں رہنے دو۔ پھر منگوا لوں گی۔ ابھی پتہ نہیں وہاں ماحول کیا ہے۔ اُنھوں نے مجھے کیوں بُلایا ہے۔"

"جیسے تمھاری مرضی۔"

شیریں کو گھر تک چھوڑنے سرفراز کا چھوٹا بھائی پرویز اُس کے ساتھ گیا پرویز نے واپس آکر بتایا کہ شیریں کا باپ بڑا گرم ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ . . . .

". . . . ہم تو شادی کے روز ہی پولیس بلوا لیتے مگر کیا کرتے ہمارے ہاتھ تو ہماری لڑکی نے ہی جکڑ کر رکھ دیئے تھے۔"

اور شیریں کی ماں نے بقول پرویز کے پیغام بھجوایا تھا کہ شیریں اب وہیں رہے گی۔ جب اُس کے بھائی آئیں گے تو فیصلہ کریں گے کہ اُسے کہاں رہنا ہے۔ کیونکہ ہماری لڑکی وہاں نہیں رہنا چاہتی۔ وہ وہاں گھبرا گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پرویز نے یہ بھی کہا کہ شیریں نے اپنی ماں کو گھر جا کر صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ شاہد سے یعنی مجھ سے نفرت کرتی ہے اور کسی قیمت پر بھی میرے ساتھ زندگی بسر کرنے کو تیار نہیں۔

یہ باتیں سُن کر میں پھر تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف شیریں مجھ سے

زندگی بھر ساتھ رہنے۔ کالج میں تعلیم حاصل کرنے اور بی اے بی ٹی کرنے کے پروگرام بنا رہی تھی اور دوسری جانب وہ گھر والوں سے یہ کہہ رہی تھی کہ وہ شاہد کی صورت سے بیزار ہے اور اُس کے ساتھ کسی قیمت پر بھی رہنا نہیں چاہتی۔ ایک عجیب معمّہ تھا جو اس وقت حل نہیں ہو رہا تھا لیکن بعد میں جب مجھے اندرونی بات کا علم ہُوا تو حل ہو گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ شیریں سے شادی کرنے کے بعد جب میں اُس کے ساتھ پانچ دن کی چھٹی گزارنے کے بعد دفتر جانے لگا تو شیریں نے سرفراز کے چھوٹے بھائی پرویز سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔ اب یہ خدا جانتا ہے کہ پہل شیریں کی طرف سے ہوئی یا پرویز کی جانب سے۔ بہرحال گھر خالی تھا۔ سرفراز اپنی بیوی کے ساتھ مری گیا ہُوا تھا۔ نوکر کام کاج کرتا رہتا۔ ماں جی رسوئی وغیرہ میں مصروف رہتیں۔ میں صبح آٹھ بجے سے ساڑھے چار بجے تک دفتر میں ہوتا۔ پیچھے گھر میں شیریں اور پرویز اکیلے ہوتے۔ میدان خالی پا کر اور میری ایک ذرا سی کمزوری کا سہارا لے کر شیریں نے میری محبت، میری عزّت اور میرے وقار اور ازدواجی رشتے کے مقدّس ناموس کو پسِ پُشت ڈال کر پرویز سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کر دیں۔

شروع شروع کے چھ سات دن جبکہ شیریں اور پرویز کا رومان ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ شیریں کا سلوک مجھ سے بالکل ٹھیک رہا اور وہ میرا ہر طرح

سے خیال رکھتی تھی۔ اُس نے اپنی کسی بھی حرکت سے مجھ پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اندر ہی اندر کیا کر رہی ہے۔ لیکن جب انھوں نے آپس میں وعدے وغیرہ کر لیے تو شیریں نے اپنا رویّہ مجھ سے بدل لیا۔ اس اثنا میں مری سے سرفراز وغیرہ بھی واپس آ گئے۔ اب شیریں نے کھُلم کھلا مجھ سے نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔ کیونکہ شیریں نے پرویز کو قول دیا تھا کہ وہ بہت جلد مجھ سے طلاق حاصل کر لے گی۔

سرفراز نے طلاق کے بعد مجھ پر ان حقائق کا انکشاف کیا۔ کیونکہ پھر پرویز نے شیریں سے شادی کرنے کا گھر میں اعلان کر دیا تھا اور سرفراز نے اُسے بری طرح ڈانٹا تھا کہ اگر اُس نے ایسی بات کی تو وہ اُسے گھر سے نکال باہر کرے گا۔ سرفراز کی زبانی معلوم ہوا کہ جب وہ مری گئے ہوئے تھے اور شیریں کی مجھ سے نفرت کا تیسرا یا چوتھا روز تھا تو ایک رات گھر کے ملازم نے شیریں اور پرویز کو مکان کے سامنے قبر کے پاس کھڑے باتیں کرتے دیکھا۔ پرویز نے جب نوکر کو قریب پایا تو بولا:

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اندر جا کر کام کرو۔"

نوکر اندر جانے کی بجائے دوسری طرف سے ہو کر قبر کی عقبی جھاڑی میں آ کر چھپ گیا اور ان دونوں کی باتیں سننے لگا۔ پرویز اُسے کہہ رہا تھا۔

"اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم سات دن کے اندر اندر شاہد سے طلاق

لے لو گی تو میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ میں صرف ایک شرط پر تم سے بیاہ کر سکتا ہوں کہ تم ایک ہفتے کے اندر اندر طلاق حاصل کر لو۔"

شیریں نے پرویز کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا :

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں شاہد سے سات دن کے اندر اندر طلاق حاصل کر لوں گی۔"

میرے خدا! یہ شیریں اسے کیا کہہ رہی تھی؟ یہ اس نے کس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا؟ کیا یہ وہی شیریں تھی جو اسی ہاتھ سے مجھے محبت بھرے خط لکھا کرتی تھی جو میرے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر ٹھٹھرتی سردی میں لاہور سے شیخوپورے جایا کرتی تھی اور جو اپنے ٹھنڈے ہاتھ میرے کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر گرم کیا کرتی تھی اور اپنا پھول ایسا نازک سر میرے کندھے پر رکھ دیا کرتی تھی اور جسے دیکھ کر کھیتوں میں کام کرنے والی دہقان زادیاں کام چھوڑ دیا کرتی تھیں اور سوچا کرتی تھیں کہ شہر والیاں اپنے محبوب سے کتنا پیار کرتی ہیں؟ کیا یہ وہی شیریں تھی جو گھنٹوں بس سٹاپ پر صرف اس امید میں کھڑی رہتی کہ شاید میں ادھر سے گزروں؟ جو میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر کہا کرتی تھی۔

"کیسی باتیں کرتے ہو شاہد! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں بھلا دوں؟ میں تو اگر چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے پیار سے اکتا جاؤں؟ بھلا کوئی پیار سے بھی کبھی اکتایا ہے؟ اور پھر تمہارے

پیار سے ؟"

اور جو اپنے خطوں میں لکھا کرتی تھی کہ شاہد تم نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ تم نے مجھے حسین بنایا ہے ورنہ میں اس قابل کہاں تھی کہ تمہاری نظروں میں آسکتی۔ یہ ساری دولت، یہ ساری زرآلت، یہ سارا حُسن صرف تمہارا اور تمہاری محبت کا بخشا ہوا ہے۔ میں تو صرف تمہاری پجارن ہوں اور ساری عمر تمہاری پُوجا کرنا چاہتی ہوں اور یہ تو میری خُوش نصیبی ہے کہ تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو۔ بھلا پجارنوں کو دیوتا کا پیار کہاں نصیب ہوتا ہے !"

کیا یہ وہی شیریں تھی ؟ — نہیں ! نہیں ! — شیریں مرگئی تھی۔ شیریں نے خودکشی کر لی تھی۔ یہ تو اُس کا مردہ ڈھانچہ تھا جس نے دوسرے مُردہ ڈھانچے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور یہ دونوں بے حس پتھر کے مجسمے ایک قبر کے سرہانے کھڑے اپنی محبت کا پیمان باندھ رہے تھے۔ جنھوں نے اپنی محبت میں ایک قبر کے مُردے کو گواہ بنایا ہو وہ محبت کہاں تک کامیاب ہوسکتی تھی ؟

نوکر نے ساری بات سرفراز کو بتادی۔ سرفراز نے بعض مصلحتوں کی وجہ سے یہ راز مجھ سے اُس وقت تک پوشیدہ رکھا۔ جب تک کہ شیریں نے مجھ سے طلاق نہیں لے لی۔ قبر پر عہد و پیمان باندھنے کے بعد شیریں نے مجھ سے بڑی شدت سے نفرت شروع کردی اور طلاق کا مطالبہ شروع

کر دیا۔ لیکن چونکہ وہ میرے ساتھ محبت کا ایک طویل اور پُرخلوص دور گزار چکی تھی۔ لہٰذا کبھی کبھی اُس پر میری محبت اور میرا خلوص غالب آجاتا اور وہ وقتی طور پر سب کچھ بھول کر میرے پہلو میں آکر پناہ لیتی۔ دراصل وہ بھی ایک اذیت ناک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ خدا جانے اُس کے دماغ میں کیسے کیسے خوفناک خیالات چکّر لگایا کرتے۔ اُس نے پرویز پر یہ ظاہر کرنے کی بھی کوشش کی کہ وہ میری صرف دوست ہے اور بیوی ہونے کے باوجود اُس کا میرے ساتھ کسی قسم کا جسمانی تعلق نہیں ہے۔ وہ پرویز کے سامنے جان بوجھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کرتی۔ اُس کو محض یہ دکھلانے کے لیے کہ وہ میری ذرا پرواہ نہیں کرتی۔ دوسری جانب اُس نے اپنے ماں باپ کو اس بات پر تقریباً راضی کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے طلاق لے کر پرویز سے شادی کرے گی۔

"امّی! وہ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ ماں جی مجھ سے بڑا پیار کرتی ہیں۔ عشرت بھابی میرا بڑا خیال رکھتی ہیں۔ میں وہاں بہت خوش رہوں گی۔"

"لیکن بیٹی اُس لڑکے کی تنخواہ ایک سو روپے ہے۔"

"کوئی نہیں امّی! میں ایک سو میں ہی گزارہ کر لوں گی۔"

شیریں کی والدہ نے اُسے پہلے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب جب اُس نے شاہد سے بیاہ کر لیا ہے تو اسے نبھائے مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہ

کسی طرح تیار نہیں ہو رہی اور بقول اُس کے اُس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے تو ماں بھی مجبور ہو گئی۔

جس روز میں نے شیریں کو پرویز کے ساتھ گھر بھجوایا اور پرویز نے واپس آکر بتایا کہ شیریں کا باپ مجھ پر بڑا گرم ہو رہا تھا اور شیریں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور میرے ساتھ کسی قیمت پر بھی رہنے کو تیار نہیں۔ اُسی روز کے بعض حقائق کا مجھے بعد میں علم ہُوا کہ جب پرویز شیریں کو ساتھ لے کر اُن کے گھر گارڈن ٹاؤن پہنچا تو وہاں ایک عورت شیریں کی والدہ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اُس نے پرویز کی طرف اشارہ کر کے پوچھا:

"یہ شیریں بیٹی کے شوہر ہیں کیا؟"

تو شیریں کی والدہ نے کہا:

"ہاں بہن"

گویا اتنے سنگین جھوٹ میں شیریں نے اپنی والدہ کو بھی شریک کر لیا تھا۔

اُسی روز شیریں کی والدہ نے پُوچھا:

"بیٹا! دفتر سے کیا تنخواہ لیتے ہو؟"

"جی ایک سو روپیہ"

تو شیریں جھٹ بول اُٹھی:

"امّی! آپ فکر نہ کریں۔ میں ایک سو روپے میں بھی گزارا کر سکتی ہوں۔"

پرویز کو اب پُورا یقین ہو چکا تھا کہ شیریں اس کی ہو چکی ہے۔ چُنانچہ اس نے واپس آکر خوب نمک مرچ لگا کر میرے خلاف باتیں کیں اور ہر بات کو بڑھا چڑھا کر مبالغے سے بیان کیا۔ اُدھر شیریں بھی مجھ سے صرف اس لیے نفرت کر رہی تھی کہ وہ پرویز کو یقین دلادے کہ وہ اپنا وعدہ نباہ رہی ہے اور اب میری نہیں بلکہ اُس کی دوست ہے۔ اُسی رات عشرت بھابی اور سرفراز سے میں نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ شیریں یہاں کچھ کہتی ہے اور وہاں جا کر کچھ اور سوچنے لگتی ہے۔ رات کو وہ میرے پیار کی قسمیں کھا رہی ہوتی ہے اور دن کو مجھ سے پھر نفرت شروع کر دیتی ہے۔

عشرت بھابی نے کہا:

"شاہد بھائی! وہ آپ کے پاس کبھی نہیں رہے گی۔ وہ اپنے مُنہ سے طلاق کا مطالبہ کر چکی ہے۔ آپ اُسے طلاق ہی دے دیں تو بہتر ہے اور اس وقت بڑا سنہری موقع ہے۔ وہ اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔ آپ اُس کا سامان بھی وہاں بھجوا دیں۔"

سرفراز نے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے شاہد! اس طرح شیریں ہوسٹلوں اور اپنی سہیلیوں کے ہاں در بدر ہونے سے بچ جائے گی۔ سامان اس کے گھر چلا گیا تو اُس کے ماں باپ اُسے اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ ان کی بیٹی کی اور تمھاری بیوی کی عزت

محفوظ رہے گی - پھر چاہے تم طلاق دے دینا - وگرنہ اگر وہ پھر یہاں آگئی اور یہاں سے کسی دوسری جگہ نکل گئی تو بڑی بدنامی ہو گی اور اُس کے ماں باپ اپنی لڑکی کے بارے میں تمھیں ہی ملزم ٹھہرائیں گے -"

مجھے اُن کی یہ بات پسند آ گئی - میں شیریں کا سامان بھجوانے پر تیار ہو گیا - میں ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا - میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا - میں مضطرب رُوح کے ساتھ کوئی بھی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا تھا اور مجھے جو دوست ملا تھا - وہ میری خاطر اپنا خون بہا سکتا تھا مگر سوچ ذرا کم ہی سکتا تھا - لیکن میرا ارادہ ہرگز ہرگز شیریں کو طلاق دینے کا نہیں تھا - میں اُس کی تمام خامیوں اور زیادتیوں کے باوجود اُس سے بے پناہ پیار کرتا تھا اور جب وہ دن بھر مجھے انتہائی ذہنی کوفت اور شدید روحانی اذیت پہنچانے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا سا بھی مسکرا دیتی تو میں اپنی ساری کلفتیں بھول کر اس کے سینے سے لپٹ جاتا -

میں جانتا تھا کہ شیریں مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے اور مجھ سے دُور ہو کر رہنا چاہتی ہے اور جیسا کہ ایک رات پہلے اُس کی اور میری آپس میں باتیں بھی ہوئی تھیں - اس لیے قدرتی طور پر میں نے سوچا کہ شیریں اب ماں باپ کے پاس رہے - وہاں وہ صرف ایک صورت میں ہی رہ سکتی ہے کہ میں اس کا سامان بھی وہاں بھجوا دوں - پھر وہ وہاں سے کسی دوسری جگہ اپنی سہیلی وغیرہ کے ہاں دربدر نہ ہو سکے گی - کیونکہ وہ میرے ہاں نہیں رہنا چاہتی - میں اُسے

وہاں خرچ بھیج دیا کروں گا۔ وہ تعلیم حاصل کرے گی۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ کہ ہو سکتا ہے۔ بھابی عشرت کسی وجہ سے شیریں کا اُس گھر میں رہنا مناسب خیال نہیں کرتی اور اب جبکہ وہ اپنے گھر جا چکی ہے تو اُس کا سامان بھی بھجوا دیا جائے۔ تاکہ شیریں کا والدین کے ہاں رہنا پکّا ہو جائے۔ اس طرح ہم دونوں کا وقار اور عزّت محفوظ رہے گی۔ جبکہ ایک بار شیریں نے مجھے خود کہا تھا کہ وہ ماں باپ سے کہہ دے گی کہ شاہد کے ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں اور وہ مجھے ابھی الگ مکان میں نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے میں دو چار ماہ ماں باپ کے ہاں رہوں گی پھر چلی جاؤں گی۔

چُنانچہ میں نے سامان گاڑی میں رکھا۔ ساتھ سرفراز، بھابی اور نوکر کو لیا اور گارڈن ٹاؤن کی طرف چل پڑے۔ اس طرح سامان بھجوانے میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید کچھ دن الگ رہنے کے بعد شیریں کی نفرت کچھ کم ہو جائے۔ میں اس کی نفرت کو محبت میں بدلنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وقفے کی ضرورت تھی۔ کچھ دیر شیریں کو الگ رکھنے کی ضرورت تھی اور سوائے والدین کے گھر کے اور کوئی بھی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں میں شیریں کو رکھ کر مطمئن ہو جاتا۔

ہم باہر ٹیکسی میں بیٹھے رہے۔ نوکر سامان لے کر اندر شیریں کے مکان میں چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس نے بتایا کہ شیریں کی والدہ نے کچھ نہیں کہا۔ بس چُپکے سے

سامان رکھ لیا ہے۔ لیکن شیریں کی والدہ نے نوکر کو رازداری میں کہا تھا کہ جاتے ہی پرویز کو وہاں بھیج دے۔ نوکر نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔ پرویز نے وہاں جاکر اُن سے کیا مشورے کیے اور وہاں میرے گھر کی بربادی کے کیا منصوبے بنتے رہے اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔

دوسرے روز میں دفتر سے واپس آرہا تھا کہ میں نے ماڈل ٹاؤن والے پرانے بس سٹاپ پر شیریں کو سیاہ برقعے میں درخت کے ساتھ کھڑی دیکھا۔ میں نے سکوٹر فوراً اُس کے پاس جاکر روک لیا۔ شیریں نے کوئی بات کہے بغیر مجھ سے طلاق کا شدّت سے مطالبہ کرنا شروع کردیا۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ رات ہی رات میں شیریں کو کیا ہوگیا؟ شیریں نے مجھے ہاتھ کے اشارے روکا تھا۔ اس طرح دو قسم کے لوگ روکا کرتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کو کوئی ضروری بات کہہ کر آگے گزر جانا ہوتا ہے۔

جس طرح کسی بس کو روکا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ لوگ اس طرح ہاتھ کا اشارہ کرتے ہیں جن کے دل میں محبت کا ساگر جوش کھا رہا ہوتا ہے اور جنھیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر اُنھوں نے ہاتھ کا اشارہ نہ دیا تو کہیں ان کا محبوب اُنھیں دیکھے بغیر گزر نہ جائے۔ میرا خیال تھا کہ شیریں نے دوسرے قسم کے لوگوں کی طرح مجھے اشارہ کیا ہے۔ اس اشارے میں اُس کی اوّلیں محبت کی جھلک تھی۔ بالکل اُسی طرح وہ محبّت کے زمانے میں مجھے کبھی کبھی ہاتھ کے اشارے سے روک لیا

کرتی تھی۔ لیکن جب شیریں نے بات ہی طلاق کے مطالبے سے شروع کی تو میری امیدوں کے محل کی آخری منزل بھی دھڑام سے زمین کے ساتھ آن لگی۔

میں نے کہا:

"شیریں آہستہ بولو۔ یہاں دوسرے لوگ بھی کھڑے ہیں۔ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا۔ میرے پیچھے بیٹھو۔ ہم کہیں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور آرام سے بات کرتے ہیں۔"

شیریں سکوٹر کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اُس روز وہ پیچھے بیٹھی اپنا جسم چرا رہی تھی۔ اُس نے قصداً اپنے جسم کا معمولی سا حصّہ بھی میرے جسم کے ساتھ نہ لگنے دیا تھا۔ ابھی میں تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُس نے کہا:

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہاں اتار دو اور مجھے ابھی طلاق لکھ کر دے دو۔"

میں نے سکوٹر پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر کہا:

"شیریں ایسی بچوں ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم تو اچھی خاصی عقلمند ہو۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ بس سکوٹر روک لو۔"

میں نے احتیاطاً سکوٹر کی رفتار ہلکی کر دی مگر اُسے کھڑا نہ کیا۔ شیریں نے دیکھتے دیکھتے سکوٹر کی پچھلی سیٹ پر سے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے

فوراً بریکیں لگا دیں یسکوٹر کو پھینک کر جلدی سے شیریں کو اٹھایا۔ شیریں نے میرا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔ شیریں کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ پھر بھی اُس کے گھٹنے چھِل گئے۔

"شیریں! یہ تُم کیا ڈرامہ کر رہی ہو۔ خُدا کے لیے میری اور اپنی عزّت کا تو خیال کرو۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"ڈرامہ میں نہیں کر رہی تم کر رہے ہو۔ میں تم سے صرف طلاق حاصل کرنے اور اپنی تصویریں اور خط لینے آئی ہوں۔"

"جذبات میں آکر کوئی ایسا قدم نہ اُٹھاؤ شیریں جس کی وجہ سے تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"میں سوچ سمجھ کر ایسا کر رہی ہے۔"

ہم دونوں ایک گھنٹہ وہاں سڑک کے کنارے کھڑے رہے۔ یہ وہی جگہ تھی۔ جہاں کبھی ہم کھڑے ہو کر پیار کی باتیں کیا کرتے تھے۔ دوستی کے پیمان باندھا کرتے تھے لیکن آج پانسہ اُلٹ چکا تھا۔ بساط بکھر چکی تھی۔ تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ خزاں کے ہوا پھولوں کو مُرجھا کر گزر چکی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے شیریں کو اپنی محبت کا، اُس کی وفا کا، اس کے وعدوں اور قربانیوں کا واسطہ دیا کہ وہ مجھ سے الگ نہ ہو۔ لیکن اُس نے میری ایک نہ سُنی اور اپنی ضد پر اڑی رہی۔ مجھے غصّہ آگیا۔ آخر وہ مجھے کیا سمجھ رہی

تھی۔ کیا اُس کا خیال تھا کہ مجھ میں اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ مجھ پر وار پر وار کرتی جائے اور میں اُف تک نہ کروں اور بے جان پتھر کی طرح پڑا اُس کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا رہوں۔ میں نے کہا :

"اگر میں تمھیں طلاق نہ دوں تو؟"

شیریں نے گردن اُٹھا کر کہا :

"میرے ابّا جان! آپ سے پانچ منٹ میں طلاق لے سکتے ہیں"

میں ہنس پڑا۔ کیونکہ شیریں نہیں جانتی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کا والد مجھ سے پانچ منٹ میں زندگی بھر طلاق نہیں لے سکتا لیکن جب شیریں ہی مجھ سے بیزار ہو گئی تھی۔ جب میری محبوبہ ہی میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تو میں اُس کے والد کے ساتھ ایک نیا جھگڑا مول لے کر کیا کروں گا۔ اور پھر میں زبردستی تو شیریں کے دل میں اپنی محبت نہیں ڈال سکتا۔ پیار میں زبردستی نہیں ہُوا کرتی۔

میں نے کہا :

"شیریں! میں پیار میں سختی کا قائل نہیں اور پھر میں تمھارے ساتھ سختی کبھی نہیں کر سکتا۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ اگر تمھاری خوشی اسی میں ہے تو میں تمھاری خوشی کی خاطر یہ کام بھی کر دوں گا۔ پرسوں تم اسی جگہ مجھے ملنا۔"

"میرے خط اور تصویریں بھی لیتے آنا۔"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اپنے آپ میرے مُنہ سے ایک آہ نکل گئی۔

تیسرے دن وہ مجھے حسبِ وعدہ ٹھیک وقت پر بس سٹاپ پر ملی۔ میں اُسے لے کر لارنس باغ کے اپنے پُرانے کیبن میں آگیا۔ آج لارنس باغ بڑا اُداس تھا۔ زرد زرد دھوپ باغ میں گھاس پر پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی غمگین ہوا چل رہی تھی اور کیبن کا سبز پردہ آزردگی سے ہل رہا تھا۔ ہم کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے خطوط اور تصاویر کا بنڈل اُس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ شیریں نے بنڈل کھول کر خطوط نکالے اور انھیں پھاڑنے لگی۔ ابھی اس نے پہلا ہی خط پھاڑا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ لیا۔

"محبت کی ان نشانیوں کو میرے سامنے مت پھاڑو۔ قصور میرا ہے سزا ان بے زبان معصوم خطوط کو مت دو۔ یہ تو محبت کے عظیم الشان پُرجوش دور میں لکھے گئے ہیں۔ ان سے اپنی نفرت کا انتقام مت لو۔ ان پر اپنی نفرت کی مُہر ثبت نہ کرو۔ ان پر تو جگہ جگہ محبت کی مُہریں لگی ہوئی ہیں۔ اگر تمھارے خیال میں باپ ملزم ہے تو اس کی سزا اس کے بچوں کو کیوں دے رہی ہو؟ یا اگر تمھیں ان کو پھاڑنا ہی ہے تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤ وہاں جا کر ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا۔ کم از کم میرے سامنے ایسا نہ کرو۔ میں اپنی محبت

کو ویران ہوتے تو دیکھ سکتا ہوں مگر اپنے پیار کی نشانیوں کی تباہی برداشت نہیں کر سکتا۔"

شیریں نے ہاتھ روک لیا۔ پھر وہ تصویریں دیکھنے لگی۔

"لیکن اس میں تو وہ تصویریں نہیں ہیں جو ہماری اکٹھی اتری ہوئی ہیں۔"

میں نے کہا:

"شیریں! کیا اپنی محبت کی ایک بھی یادگار میرے پاس نہ چھوڑو گی؟ کیا اس گھر کو خالی کرتے ہوئے تم اس گھر کے صحن میں اُگی ہوئی بیل بھی اُکھاڑ کر لے جاؤ گی؟ اِس بیل کو تو تم خود بڑی محبّت سے پانی دیا کرتی تھیں۔ اب اگر وہ بڑھ گئی ہے۔ پھل پھول گئی ہے تو اس میں اُس کا کیا دوش ہے جو لوگ مکان چھوڑتے ہیں وہ اپنا سامان ضرور لے جاتے ہیں لیکن اتنا سنگدل تو کوئی بھی نہیں ہوتا کہ وہاں اُگے ہوئے پھول پودوں کو بھی جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دے۔"

"میں سب تصویریں اپنے پاس لے کر رکھنا چاہتی ہوں۔ یہ میری خواہش ہے۔ میری خوشی ہے۔"

"اگر اس میں بھی تمھاری خوشی پوشیدہ ہے تو میں تمھیں دوسری ملاقات میں وہ تصویریں بھی لا دوں گا۔"

پھر میں نے بڑی محبت سے کہا:

"شیریں! ہم نے زندگی کا ایک طویل دور ایک ساتھ پیار سے رہ کر گزارا ہے۔ ہم نے محبت بھی کی ہے اور اپنی اِس محبت کی خاطر قربانیاں بھی بہت دی ہیں۔ اگرچہ تم اتنے مہنگے داموں خریدی ہوئی شے کو کوڑیوں کے مول چھوڑ رہی ہو۔ لیکن چونکہ مجھ سے الگ رہ کر ہی خوش رہ سکتی ہو اور مجھے تمھاری خوشی منظور ہے اس لیے میں تمھارے اس مطالبے کو بھی منظور کرتا ہوں مگر صرف ایک بات کی تسلّی چاہتا ہوں کہ تم طلاق کے بعد جب تم میری بیوی نہیں رہو گی تو مجھے بھلا نہیں دو گی اور دوستی کا رشتہ بدستور قائم رکھو گی۔ کیونکہ میں تمھاری دوستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو ہوگا کہ شیریں میری دوست ہے اور ہم دوستوں کی طرح کبھی کبھی مل لیا کریں گے۔"

شیریں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ ساری عمر میری دوست رہے گی اور کبھی کبھی مجھے ملتی رہا کرے گی اور دوستی کے پاکیزہ ناطے کو کبھی نہیں توڑے گی۔ میرے لیے اتنی بات ہی بڑی غنیمت تھی۔ اگر شیریں مجھ سے عمر بھر کی دوستی کا وعدہ کرے تو مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ اس پیمان کے بعد شیریں نے طلاق کی بات شروع کر دی۔ میں نے ایک بار پھر اُسے کہا:

"شیریں! ہماری محبت کا سلسلہ تمھاری طرف سے ٹوٹ گیا ہے۔ دوستی کو تم نے ہلاک کر دیا ہے۔ گھر کو تم لات مار کر اپنے گھر چلی گئی ہو۔ اب

میرے تمھارے درمیان صرف کاغذ کا ایک پُرزہ ہی باقی رہ گیا ہے کم از کم وہ تو مجھ سے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

مگر شیریں نے ایک نہ سُنی۔ وہ پھر غصے میں آ کر بے ربط سی باتیں کرنے لگی۔ میں نے ہار کر کہا:

"تو لاؤ میں سفید کاغذ پر ابھی تمھیں طلاق لکھ دیتا ہوں۔"

"نہیں — اس کے لیے تمھیں ہمارے وکیل کے پاس چلنا ہوگا۔"

تو گویا وہ گھر سے پُورا بندوبست کر کے باہر نکلی تھی۔ میں نے کہا:

"تو میں گھر جا کر کسی وکیل سے پوچھ کر آج ہی تمھیں طلاق روانہ کر دوں گا"

"اس میں یہ بات ضرور درج ہو کہ تم چونکہ شیریں کو اپنی بعض گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے بسانے پر تیار نہیں ہو۔ اس لیے طلاق دے رہے ہو۔"

"ایسا ہی لکھوں گا شیریں! تم فکر نہ کرو۔"

پھر میں نے کہا:

"شیریں! اب جبکہ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں تم ایک پُورا دن میرے ساتھ پہلے کی طرح گذارو۔ تم وہی سفید ساڑھی پہن کر آؤ۔ میں تمھارے لیے گجرے لے کر آؤں۔ پھر ہم دونوں ریلوے سٹیشن والے پُرانے ہوٹل میں چلیں گے اور سارا دن وہاں اپنی پُرانی محبت

کی یاد میں ڈوب کر بسر کردیں گے۔"

شیریں کو چونکہ ابھی مجھ سے اپنی تصویریں لینی تھیں۔ اس لیے وہ مان گئی۔ اُس نے دوسرے روز بس سٹاپ پر ملنے کا وعدہ کیا اور چلی گئی۔

بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ شیریں وہاں سے سیدھی پرویز کے گھر گئی۔ وہاں جاکر اُس نے عشرت بھابی اور ماں جی کو بتایا کہ وہ کل مجھ سے طلاق لے رہی ہے۔ وہ بڑی خوش تھی۔ پرویز بھی وہاں بیٹھا تھا۔ اُس نے پرویز کو یقین دلا دیا کہ وہ اب آزاد ہو رہی ہے اور ہمیشہ کے لیے اس کی بن رہی ہے۔ وہ ہنس ہنس کر اُن لوگوں سے باتیں کرتی رہی۔ وہ خود ہی باورچی خانے میں چلی گئی اور چائے بنا کر لے آئی۔ اُس نے سب کو چائے بنا کر دی۔ پرویز کو بھی ایک پیالی دی ہو گی اور اپنے ہاتھ سے اُسے پکڑائی ہو گی! شیریں! شیریں! تمھاری آنکھوں پر یہ کس نے پٹی باندھ دی۔ سنہری دھوپ میں چمکتے مرغزاروں میں شیروں سے دوستی رکھنے کے بعد تم نے تاریک غاروں میں چھپے ہوئے کور چشم گیدڑوں سے کیسے یارانہ پیدا کر لیا؟

اُس روز شیریں نے بھابی عشرت اور دوسرے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ جب اُسے طلاق پوسٹ کی جائے تو اُس میں فلاں فلاں شرائط ضرور لکھی جائیں اور فلاں فلاں بات کا ذکر ضرور کیا جائے۔ اُس نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں عشرت بھابی سے اپنی لارنس باغ والی ملاقات کا ذکر نہ کروں اور

عشرت بھابی کو منع کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے اُن کی ملاقات کا ذکر نہ کریں۔ شیریں عجیب، دردانگیز، مضحکہ خیز اور افسوسناک چومکھی لڑائی لڑ رہی تھی۔ اُس نے بے جانے بوجھے دو چار محاذ بنا لیے تھے اور ہر محاذ پر سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی گولی کے چلنے کی آواز سُنائی دے جاتی تھی۔

لیکن میں نے دوسرے دن طلاق لکھ کر اُسے لفافے میں ڈال کر شیریں کے نام پوسٹ کر دی اور اپنے محاذ کو خاموش کر دیا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری خندق میں سے ایک گولی بھی اُس قلعے کی جانب چلے جس پر شیریں کے نام کا پرچم لہرا رہا تھا۔

شیریں حسبِ وعدہ مجھے بس سٹاپ پر ملنے آ گئی۔ لیکن اُس نے میری خواہش کے مطابق سفید ساڑھی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے اُسے یہ ساڑھی صرف اسلئے لا کر دی تھی کہ میں اُسے اس میں ملبوس دیکھنا پسند کرتا تھا مگر شیریں نے میری اس آخری خواہش کو بھی ٹھکرا دیا۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد اُسے کبھی مجھ سے نہیں ملنا تھا۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

میں اُسے لے کر ریلوے سٹیشن والے پُرانے ہوٹل میں آ گیا۔ اگرچہ میں نے اُسے طلاق لکھ کر بھیج دی تھی مگر شیریں نے مجھ سے دوستی نبھانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ وہ معمولی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے لپ سٹک بھی

نہیں لگا رکھی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اُس ملاقات کی نوعیت کو اچھی طرح جانتی تھی اور ملاقات سے انکار وہ کر نہیں سکتی تھی کیونکہ ابھی اُس کی تصویریں میرے پاس تھیں۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ طلاق پوسٹ کر دی گئی ہے۔ میں نے تصویریں بھی اُسے دے دیں۔ وہ پلنگ پر لیٹی رہی اور میں کرسی پر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنے لڑائی جھگڑے اور ہمیشہ کی جُدائی کو بالکل بھُول گئے۔ ہم نے پُرانے معمول کی طرح ناشتہ منگوا کر کیا۔ اُس روز جانے کیوں شیریں کا دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ میں کوئی آدھ گھنٹہ اس کے دل والی جگہ کو نرم نرم ہاتھ سے سہلاتا رہا۔ میں نے پُوچھا:

"شیریں کم از کم اس وقت جبکہ میں تمھیں طلاق دے چکا ہوں اور تم آزاد ہو۔ مجھے اتنا بتا دو کہ تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ مجھے اب تو میرا قصور بتا دو تا کہ میں ساری عمر اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کروں اور تمھاری جُدائی کی اذّیت کو یہ سمجھ کر ہنسی خوشی برداشت کر سکوں کہ میں نے بھی شیریں کے ساتھ زیادتی کی تھی۔"

شیریں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا:

"تمھارا کوئی قصور نہیں۔"

"پھر یہ سارا ہنگامہ کس لیے کھڑا کیا گیا؟"

"میں خود نہیں جانتی۔"

میں نے سنجیدگی سے پُوچھا:

"شیریں! اُس روز بھی پرویز کو تمھاری والدہ نے بُلوا بھیجا تھا اور میں نے سُنا ہے کہ وہ کل بھی تمھارے ہاں گیا ہُوا تھا۔ کہیں تمھاری والدہ کا خیال اُس سے تمھاری شادی کرنے کا تو . . . . "

شیریں نے میری بات کاٹ دی۔

"کہیں تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

اُس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ واقعی میرا دماغ خراب ہو گیا ہے جو شیریں کو میں اتنا گھٹیا سمجھنے لگا ہوں مگر آج سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ دماغ میرا نہیں شیریں کا خراب ہو چکا تھا۔ وہ اچھے بُرے کی تمیز کھو بیٹھی تھی میری آنکھوں پر تو اُس کے پیار کا آنچل تھا۔ میں تو دُنیا کی ہر شے کو اُس کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ جو وہ کہتی اُسے سُنتا تھا اور اُس پر ایمان لے آتا تھا میں یہ کیسے کر سکتا تھا کہ شیریں کے پیچھے لگا اس کی حرکات کا جائزہ لیتا پھروں! ہم آرٹسٹ لوگ صرف محبت کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ کاروبار نہیں کرتے کہ مخالف فریق کی ہر سرگرمی کی پوری پوری ڈائری رکھی جائے۔ یہ کام دنیاداروں کا ہے۔ ہمارا نہیں۔

دوپہر کو ہم نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ اُس روز ہوٹل میں شملے کی مرچیں

اور قیمہ پکا ہُوا تھا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر ہم پلنگ پر لیٹ گئے۔ شیریں نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں نے کہا:

"شیریں! میں نے تمھیں بہت روکا کہ مجھ سے طلاق مت لو۔ مگر تم نے مانیں۔ تم نے مجھے اس خوفناک فعل پر مجبور کر دیا۔ لیکن میرے دل سے تم اپنی محبت کبھی نوچ کر نہیں پھینک سکو گی۔ تم ایک ہزار ایک مرتبہ مجھ سے طلاق لے سکتی ہو۔ لیکن میرے دل میں جو تمھارا پیار بسا ہُوا ہے۔ اُسے ایک بار بھی میرے دل سے باہر نہیں نکال سکتی ہو۔ میرے لیے تمھارا یہ وعدہ بھی کھوئی ہوئی جنت کے دوبارا مل جانے سے کم نہیں کہ تم میرے ساتھ دوستی کا رشتہ سدا قائم رکھو گی۔ میرا پیار اسی شدت سے رہے گا جب تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔ تمھارے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی تو میرا پیار بدستور جوان رہے گا۔ میں تم سے اسی شدت سے پیار کرتا رہوں گا اور تمھارے چہرے کے ویران نقوش مجھے اُس وقت بھی اتنے ہی حسین دکھائی دیں گے جتنے اس وقت دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے اُن جھریوں کے عقب میں ایک فن کار کی پُر جوش محبّت کی زندہ وجاوید یادگاریں نظر آئیں گی۔ مجھے اُن کھنڈرات میں پُرانی محبت کی کئی ایک نشانیاں ملیں گی۔"

شیریں نے اپنا سر میرے سینے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اُس کی نازک اور مخروطی انگلیاں میرے سر کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ

لپٹا لیا۔ اُس نے ایک جھرجھری سی لی اور میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اب اُس کے ذہن نے سوچنا بند کر دیا تھا اور بدن گرم ہو کر خوشبو دینے لگا تھا۔ کاش عورت صرف جسم ہوتی۔ اس کے سر میں ذہن رکھ کر قدرت نے اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ ذہن ہی ہے جو اُس کے چہرے پر جھریاں ڈالتا ہے۔ اس کے بھرپور رس بھرے جسم کا سارا شہد چوس کر اُسے ہڈیوں کا ڈھچر بنا دیتا ہے۔ اُس کی معصوم آنکھوں میں مکاری کی چمک پیدا کرتا ہے۔ اُس کے کھلے ہوئے انار ایسے پاکیزہ ہونٹوں سے جھوٹ کے زہر میں لپٹے ہوئے جملے نکلواتا ہے۔ اس کے بالوں کو سفید کرتا ہے۔ جب عورت محض ذہن ہوتی ہے تو مرد بن کر تخت پر بیٹھتی ہے اور سیمسن کے بالوں کو کاٹ کر اُسے جیلخانے میں پھنکوا دیتی ہے لیکن جب جسم ہوتی ہے تو آدھی رات کو اسی جیل خانے میں جا کر سیمسن کو ساتھ بھاگ چلنے کی ترغیب دیتی ہے

میرے پہلو میں لیٹی ہوئی شیریں اپنے ذہن کو فراموش کر چکی تھی اور محض جسم بن گئی تھی۔ شُدھ عورت بن گئی تھی۔ مجھ سے نفرت شیریں کے ذہن نے کی تھی۔ اُس کے جسم نے نہیں۔ جسم کبھی نفرت نہیں کرتا۔ جسم محبت ہے۔ پیار ہے جادو بھرا لمس ہے۔ جس کے ساتھ لگتے ہی ہزار سورجوں کا ایک سورج طلوع ہوتا ہے۔ تاریک سے تاریک جنگل میں چاند کا قافلہ اتر آتا ہے۔ ویران سے ویران ریگ زاروں میں لالہ کے سُرخ خون ایسے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ ہر طرف پیار اور محبت کے نغمے گونج اُٹھتے ہیں۔

شیریں کا جسم دشوار گزار جنگل کی شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس بن کر میرے راستے میں بچھ گیا تھا۔ گلاب کا پورا کھلا ہوا پھول بن کر میرے ہونٹوں کے قریب آکر دھڑکنے لگا تھا۔ ہم نے اس پھول کی خوشبو میں، اُس گھاس کی شبنم میں اپنے آپ کو جذب کر دیا۔ اُس وقت نفرت کا کہیں بھی نام و نشان تک نہ تھا۔ ہر طرف محبّت تھی۔ پیار تھا۔ خلوص تھا۔ تعاون تھا۔ دوستی تھی۔ روشنی تھی۔ سُرور تھا۔ لذّت تھی۔ اور کچھ نہیں تھا۔

مجھے اس کے بعد نیند آگئی۔ میں ذرا اُونگھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک ساڑھے تین بجے کے قریب میری آنکھ کُھل گئی۔ ایسے لگا جیسے کسی نے ہمارے پلنگ کو جھٹکا دیا ہو۔ شیریں میرے گلے میں باہیں ڈالے پڑی تھی۔ میں نے پوچھا:

"شیریں! کیا زلزلہ آیا تھا؟"

اُس نے مسکرا کر کہا:

"نہیں — میں نے کروٹ بدلی تھی۔"

ٹھیک ہے شیریں تمھارے کروٹ بدلنے ہی سے میری زندگی میں زلزلہ آگیا تھا۔ اگر تم کروٹ نہ بدلتی تو میں تمھارے پہلو میں بڑے سکون سے سویا رہتا۔ خواب میں گمنام جزیروں کے حسین ترین جنگلوں کی سیر کرتا پھرتا۔ مگر تم نے اچانک کروٹ بدل دی اور میرے سارے خوابوں کے محل دھڑام سے

زمین پر آن گرے ۔ پھر زلزلہ آیا ۔ اس قدر شدید زلزلہ کہ بھائی سے بہن، باپ سے بیٹی اور ماں سے بچہ جُدا ہو گیا ۔ وہ میری زندگی کا سب سے بڑا زلزلہ تھا ۔ اس کے بعد میری زندگی میں کچھ بچا ہی نہیں جسے دوسرے زلزلے کی تباہی برباد کر سکتی ۔

اُس روز مجھے شیریں کے پہلو میں جو خواب آور نیند آئی وہ کبھی رات کو بھی مجھے میسر نہیں آئی تھی ۔ میں نے اُس سے بہت کم باتیں کیں ۔ بس اس کے گلے میں باہیں ڈال کر آنکھیں بند کیے لیٹا رہا ۔ بیداری اور خواب کے درمیان معلّق رہا ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اُس کے بعد شیریں میرے ساتھ دوستی کا رشتہ بھی قائم نہیں رکھے گی جس کا اُس نے وعدہ کیا تھا اور وہ کبھی مجھے نہیں ملے گی اور مجھے کبھی اُس کے خوشبودار ہونٹوں کا لمس نصیب نہیں ہوگا تو میں خواب سے کبھی بیدار نہ ہوتا ۔ ساری عمر سویا رہتا ۔ شیریں کو اپنے ساتھ لگائے سویا رہتا ۔ اُسے اپنے اندر جذب کر لیتا ۔ اُس کی محبت کا اتنا رس پی لیتا کہ ساری عمر پھر کبھی مجھے پیاس نہ لگتی ۔ اُسے جی بھر کر اتنا دیکھ لیتا کہ پھر چاہے اندھا بھی ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا ۔

لیکن شیریں نے اُٹھ کر کپڑے پہن لیے ۔ حُسنِ اتفاق سے اُس روز بھی شیریں کے دو ایک نگیٹو میں ساتھ نہیں لا سکا تھا اور وہ گھر پر ہی رہ گئے تھے ۔ میں نے شیریں سے کہا :

"مجھے افسوس ہے شیریں کہ میں تمہاری شالامار اور شیخوپورے کی کچھ تصویروں کے نیگیٹو گھر پر ہی بھول آیا۔ کل اگر تم مجھے ملو تو میں ضرور تمہاری یہ امانت بھی واپس کر دوں گا۔"

شیریں نے کہا:

"مجھے کل چھ بجے شام انارکلی ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے۔ تم سوا چھ بجے نیلہ گنبد والے بس سٹاپ پر آ جانا۔"

"ٹھیک ہے وہاں میں تمہیں ڈاکٹر کو بھی دکھلا دوں گا۔ خدا نہ کرے کہ تمہارا دل پھر کبھی ڈوبے۔ میں اپنے سامنے تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں نہیں تو شیریں مجھے تمہاری صحت کے بارے میں بڑا فکر رہے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی —— ویسے میں اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔"

"پھر بھی شیریں! میری تسلی نہیں ہو گی۔"

میں شیریں کو چھوڑنے پلازا والے بس سٹاپ تک گیا۔ شیریں بس میں سوار ہو کر چلی گئی۔

دوسرے روز ٹھیک سوا چھ بجے وہ نیلہ گنبد والے بس سٹاپ پر آ گئی۔ اس کے پاؤں میں سفید سینڈل تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور ایک لفافہ تھا۔ میں وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ موسم گرما کا وہ دن بڑا خوشگوار دن تھا۔ میں نے کتاب دیکھی۔ اس پر کچھ شعر لکھے ہوئے تھے جو مجھے اب

یاد نہیں۔ میں نے پوچھا :

" لفافے میں کیا ہے شیریں ؟"

" سویٹر ہے جو میں اپنی سہیلی کے ہاں بھول آئی تھی۔ آج واپس لے جا رہی ہوں ۔"

وہ پیلے رنگ کا سویٹر تھا۔

میں نے شیریں کو اُس کی تصویروں کے نگیٹو دے دیئے پھر میں نے اُسے ڈاکٹر کو جا کر دکھلایا۔ ڈاکٹر نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور دوائی لکھ کر دے دی۔ میں نے ساتھ والی دکان سے دوائی لے کر شیریں کو دی۔ پھر ہم نے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ میں نے اُسے کہا :

" دوائی باقاعدہ استعمال کرتے رہنا۔ اپنی صحت کا پورا پورا خیال رکھنا اگر تمھیں کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا شیریں۔ میری دوستی کی خاطر ہی اپنا خیال رکھنا۔ اگرچہ اب ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ نہیں رہا، مگر دوستی کا رشتہ موجود ہے اور عمر بھر موجود رہے گا ۔"

چائے پینے کے بعد شیریں کو میں نے تانگے میں سوار کروایا۔

" دیکھو شیریں ! ہال روڈ والے بس سٹاپ سے سوار ہونا ۔"

" اچھا ۔"

اس نے آہستہ سے میری طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا اور تانگے میں بیٹھ کر

چلی گئی۔ میں نے الوداعی سلام کیا اور سکوٹر پر بیٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں شیریں کو ڈاکٹر کا بتایا ہوا پرہیز بھول نہ گیا ہو۔ میں فوراً وہاں سے بھاگا اور سیدھا ہال روڈ پر آ گیا۔ شیریں میری خواہش کے مطابق ہال روڈ والے بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے قریب آ گئی۔

"خیریت تو ہے ناں؟"

شیریں نے اتنی محبت سے مجھے بلایا کہ میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ہائے اتنی پیاری لڑکی، اتنی محبت کرنے والی عورت مجھ سے ہمیشہ کے لیے کیوں بچھڑ رہی تھی؟ یا خدا! میری زندگی کے سارے سال لے کر صرف ایک سال مجھے دے دے اور شیریں کو میرے ساتھ کر دے۔ پھر چاہے مجھے اس دُنیا سے اٹھا لینا مجھے کوئی گلہ نہیں ہو گا۔ کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو صرف شیریں کی دوستی کا رشتہ ہی تھا جس کے سہارے میری زندگی کا رشتہ قائم تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا:

"شیریں! ڈاکٹر نے جو تمھیں پرہیز بتایا تھا وہ یاد ہے ناں؟"

"ہاں ہاں کیوں؟"

"بس میں نے سوچا کہیں تم بھول نہ گئی ہو۔"

"میں اتنی جلدی نہیں بھولا کرتی۔"

"کاش! شیریں ایسا ہی ہو۔"

میں نے کہا:

"مجھے اپنی خیریت کی اطلاع کر دینا۔ کل ہی خط لکھنا یا فون کر دینا۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو پرسوں یا اترسوں مجھے ضرور مل لینا۔ نہیں تو مجھے بڑا فکر رہے گا شیریں — میں پریشان رہوں گا۔"

"فکر نہ کرو شاہد! میں تمہیں فون بھی کروں گی اور خط بھی لکھ دوں گی۔"

اتنے میں بس آ گئی۔ اُس روز میں نے آخری بار شیریں کو بس میں سوار ہو کر جاتے دیکھا۔ بس کی کھڑکی میں بیٹھ کر اُس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ بس چل پڑی۔ میں سکوٹر پر بیٹھ کر پُرانے دنوں کی طرح آگے نکل گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر واپس آیا۔ شیریں نے دُور سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر الوداعی سلام کیا۔ بس نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں شہر کی سڑکوں پر ہوا کے آوارہ بے مقصد جھونکوں کی طرح گلی گلی، کُو بہ کُو خاک اڑانے کے لیے اکیلا رہ گیا۔

اس کے بعد ایک مہینہ گزر گیا۔ شیریں نے مجھے نہ تو فون کیا اور نہ کوئی خیریت کا خط ہی لکھا۔ ہر شے بخیر و خوبی انجام پا چکی تھی۔ شیریں مجھ سے طلاق پہلے ہی لے چکی تھی۔ محبت نامے اور تصویریں باقی رہ گئی تھیں۔ وہ بھی اُس نے مجھ سے نکلوالیں۔ ازدواجی رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ محبت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ محبت کی ایک ایک نشانی اُس نے واپس لے لی تھی۔ روشنی کی ایک

ایک کرن وہ مجھ سے چھین کر لے گئی تھی۔ اب سوائے اندھیرے کے اور کیا باقی رہ گیا تھا۔ اب کیا شے باقی بچی تھی جس کے لیے وہ مجھے خط لکھتی۔ مجھے فون کرتی۔ اگر اُس نے مجھے خط لکھنا ہوتا تو وہ مجھ سے اپنے پہلے خط ہی کیوں لے جاتی۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی کا رشتہ ضرور برقرار رکھے گی۔ لیکن اُس نے آنکھ اوجھل ہوتے ہی مجھے بھلا دیا۔ سب کچھ بھلا دیا۔ میں اُسے فون نہیں کر سکتا۔ اُس کے ہاں فون نہیں تھا۔ کالج وہ نہیں جاتی تھی اُس کے ایڈریس پر خط میں نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کے برعکس وہ جس وقت چاہے مجھے کہیں سے بھی فون کر سکتی تھی۔ مجھ سے مل سکتی تھی۔ لیکن اُس نے اس کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ میں نے جدائی میں بے حد اداس ہو کر شیریں کو ایک خط لکھا اور بڑی مشکل سے اُس کی سہیلی مسرّت کو بلا کر اُسے خط دیا اور کہا کہ جس طرح بھی ہو وہ خط اس تک پہنچا دے۔ ہفتے بعد مسرّت نے مجھے بتایا کہ جب اُس نے میرا خط دیکھا تو یونہی پڑھ کر پرے رکھ دیا اور کہا:

"مسرّت! تم کسی کا بھی خط مت لایا کرو۔ میں نے پرانی ساری باتیں بھلا دی ہیں۔ میں اب پرانی باتوں کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتی۔"

میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔ تو کیا شیریں واقعی پچھلی ساری باتیں بھلا چکی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے اتنی قسمیں کھانے کے بعد بھی مجھ سے دوستی کا ہلکا سا رشتہ بھی توڑ دیا ہے مگر میں سوائے چپ رہنے۔ اُس کی محبت میں گھلنے اور آہیں

بھرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

ڈیڑھ مہینے کے بعد میں صبح سکوٹر پہ بیٹھا دفتر جا رہا تھا کہ گارڈن ٹاؤن کے بس سٹاپ پر میں نے شیریں کو دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا میں نے آگے جا کر جلدی سے نہر کے پل پر سے سکوٹر کو پیچھے موڑا اور شیریں کے پاس آکر روک دیا :

"شیریں! میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ صرف دو منٹ کے لیے میرے ساتھ چلی چلو ۔ دو منٹ کے بعد تم کو یہیں واپس چھوڑ جاؤں گا۔"

شیریں نے گھبرا کر کہا :

"خدا کے لیے چلے جائیں۔ میرے ابّا جان آجائیں گے۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

وہ وہاں سے چل کر سڑک کے دوسرے کنارے درختوں کے نیچے آگئی ۔

"اچھا پھر اُدھر آجائیں۔ یہاں لوگ سُن لیں گے۔"

وہاں جا کر میں نے کہا :

"شیریں! تم نے مجھے بھلا کیوں دیا ہے تم نے تو دوستی کو ہمیشہ نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ شیریں میں تم سے بہت سی باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ میں تمھیں پرانی محبت کی یاد دلا کر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ ایک منٹ کے لیے

چلی چلو۔"

"خدا کے لیے آپ چلے جائیں۔ میرے ابّا جان نے دیکھ لیا تو مُصیبت آجائے گی۔"

یہ وہ شیریں تھی جو اپنے ماں باپ کو گھر میں چھوڑ کر گرمیوں کی تیز دوپہر کو مجھ سے ایک گمنام مسجد میں نکاح پڑھوانے اکیلی پہنچ گئی تھی۔ بس سٹاپ پر میرا انتظار کرنا تو روز کی بات تھی۔ مگر آج وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی گھبرا رہی تھی۔ دراصل وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ گھبرانا وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا:

"شیریں! تمھیں خدا کا واسطہ ہے کہ میرے ساتھ چل کر میری ایک تو بات سُن لو۔"

اس پر وہ نقاب اُٹھا کر دوسری طرف مُنہ کر کے ہنس پڑی۔ مجھے یُوں لگا جیسے اُس نے میری بے بسی کا تمسخر اڑایا ہو۔ میری عاجزی اور معذوری پر ہنس دی ہو۔ میرے سینے میں گویا کسی نے جلتا ہُوا تیر پیوست کر دیا۔ مجھے اپنا سارا جسم شعلہ بن کر بھڑکتا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے میری بے بسی کا مذاق اُڑایا تھا یا اُس خُدا کی عظمت کا جس کا میں نے اُسے واسطہ دیا تھا؟ شیریں بس میں سوار ہو کر میری ٹھکرائی ہوُئی محبت پر قہقہہ لگاتی وہاں سے چل دی اور میں ہزیمت اور شکست خوردگی کے شدید احساس کے ساتھ وہاں کھڑا رہ گیا

میرا سر گھوم رہا تھا۔ پاؤں من من کے ہو گئے تھے۔ مجھے اُس لمحے محسوس ہوا کہ جب مصر کے بازار میں شہزادہ یوسف ایک اٹی کے عوض بکا تھا، تو اُس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ جب لوگ یروشلم کے بازاروں میں حضرت عیسیٰ کے کندھے پر صلیب رکھے انھیں سولی پر لٹکانے کھینچے لیے جا رہے ہوں گے تو اُن کا ذہن کیا سوچ رہا ہوگا جب حضرت یعقوب کے سامنے اُن کے بیٹے حضرت یوسف کا خون آلود کرتہ لایا گیا ہوگا تو دردمند باپ کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میرا اس وقت کا غم عظیم غم تھا۔ اُس بادشاہ کے غم کی طرح جسے بغاوت کے بعد اُس کے ادنےٰ ملازم گلے میں رسّی ڈالے گلیوں میں گھسیٹتے پھر رہے ہوں۔ شیریں لاکھوں بار رو کر میرے دل میں وہ گھاؤ نہیں لگا سکتی تھی جو اُس نے اُس وقت کی ذرا سی ہنسی سے لگا دیا تھا۔ لیکن میں نے اُسے کچھ نہ کہا۔ میں اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اس گھاؤ کو بھی شیریں کے مقدس پیار کی نشانی سمجھ کر اپنے سینے پر اٹھا لیا اور وہاں سے واپس آ گیا۔ اُس بدنصیب انسان کی طرح جو اپنے ہاتھوں اپنے پیارے بچے کو خاک کے سپرد کرکے آ رہا ہو۔ ہوا کے اُس غمگین جھونکے کی طرح جو کسی ویران کھنڈر کے شکستہ درودیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر وہاں سے آہیں بھرتا واپس نکل رہا ہو۔ اُس دھوئیں کی طرح جو کسی ایسے غریب کی کٹیا سے اُٹھ رہا ہو جہاں بھوکے بچوں کا جی بہلانے کے لیے چوٗلھے پر محض خالی پانی اُبالا جا رہا ہو۔

یہ شیریں کی مجھ سے آخری مُلاقات تھی۔ جس نے میرے سینے پر سے پُرانی
محبتوں کے سارے پھول نوچ کر میرے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا۔
جس نے میرے کندھوں پر سے فخر اور امتیاز کے سارے تمغے اتار کر میرے
گلے میں غم واندوہ کی تختی لٹکا دی اور اس پر لکھ دیا کہ یہ وہ بدنصیب ہے
جس نے سونا دیا اور مٹی وصول کی۔ پھول لٹائے اور سینے پر زخم کھائے۔
آنسوؤں کی آبیاری کی اور زہریلے پھلوں کی فصل کاٹی۔ شیریں کے لیے
کوہ بے ستون میں سے دودھ کی نہر نکالی اور محبّت کے تیشے سے ہلاک
ہو گیا۔ اُس دن سے میں شہر کے چوک میں ننگے سر کھڑا ہوں۔ جانے شیریں
کن وادیوں میں اپنی محبّت کے پتھر لیے میرا انتظار کر رہی ہے؟

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

اب میں شیریں سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔

میں براہِ راست اُس سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ اُسے اپنے سامنے بٹھلا کر اُس کا خوبصورت نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں جس طرح زمین پہ پڑا ہوا بے یار و مددگار زرد پتّا اپنی خشک زبان لبوں پر پھیر کر مُنہ اٹھاتا ہے اور درخت سے پوچھتا ہے کہ کیا اُس نے بہار میں اس لیے دلجوئی کی تھی کہ جب خزاں کا پہلا جھونکا چلے تو اُسے اپنی ڈالی سے جھٹک کر زمین پر پھینک دیا جائے؟ کیا نیلی چاندنی راتوں میں اس لیے اُسے میٹھے گیت سنائے گئے تھے کہ جب اندھیری سیاہ راتوں کا آغاز ہو تو اُسے اپنی شاخ سے توڑ کر اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا جائے؟

بسترِ سنجاب وسمور پر سونے والے کے لیے فٹ پاتھ کی راتیں بڑی کٹھن ہوتی ہیں اور وہ پھول جس نے بھرپور بہار کا جوبن دیکھا ہو۔ جس نے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ آنکھ کھولی ہو اور خوشبو کے پہلے جھونکے کے ساتھ سانس لیا ہو اور جس کی ایک ایک پنکھڑی پر محبت کی مُہر لگی ہو پت جھڑ کی ویرانیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے ؟

میرے اور قریب آجاؤ شیریں۔ اتنا قریب کہ میں اپنے ہونٹوں تمھارے میٹھے سانس کا لمس محسوس کر سکوں اور تم میری آنکھوں میں ——— محبّت کی اُس بے گور و کفن لاش کا چہرہ دیکھ سکو جس کے ٹھنڈے ہونٹوں پر اب بھی تمھارے گرم بوسوں کے نشان چمک رہے ہیں۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اپنا چہرہ اُوپر اٹھا لو۔ اپنی گردن میں تھوڑا سا خم پیدا کر لو۔ جیسے تم پوری طرح متوجہ ہو۔ اپنی آنکھیں میری آنکھوں کے حوالے کر دو۔ اپنی رُوح کے تمام دروازے بند کر کے صرف وہ دروازہ کھُلا رہنے دو جس کی دہلیز پر سر جھکا کر عقیدت کے پھُول رکھ کر میرے دردمند خیالات کے قافلے داخل ہوں گے۔

میں تمھیں ماضی کے کھنڈرات میں لیے جا رہا ہوں۔ میں تمھیں بیتے دنوں کی جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں۔ اِن گیتوں کو اکیلا ہی گانے لگا ہوں جنھیں کبھی ہم دونوں مل کر گایا کرتے تھے۔ تم خاموش رہنا۔ صرف سُنتی جانا۔

بیچ میں بولنا نہیں۔ مجھے ٹوکنا نہیں۔ کسی بات پر دل تڑپ اُٹھے تو بیتاب ہو کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ مت رکھ دینا۔ نہیں تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا اور تمھیں اپنے دل کے داغوں کی بہار اور سینے کے زخموں کی چراغاں نہ دکھا سکوں گا۔ میں جدائی کے اس عظیم پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ـــ ایک ایک شاہراہ، ایک ایک وادی، ایک ایک گھاٹی، اور ایک ایک چشمے کی نشان دہی کروں گا۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ یہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ یہاں ہم بار بار ملے تھے۔ یہاں تم پسینے میں تر بتر تیز دھوپ میں، گھر والوں کی عزّت اور وقار کے احساس کو پس پُشت ڈال کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے وابستہ ہو جانے کو آئی تھیں۔ یہاں تم نے میرے سینے میں نفرت کا پہلا تیر چلایا تھا۔ یہاں تم نے میری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر آہ و زاری کی تھی اور یہاں تم نے فون پر کسی دوسرے آدمی کو اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ اِس بس سٹاپ پر تم نے دو گھنٹے سخت گرمی میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کیا تھا اور اس قبر پر تم نے کسی دوسرے شخص کا ہاتھ تھام کر اُس سے ایک نیا پیمانِ وفا باندھا تھا۔ اس دروازے میں تم میری دُلہن بن کر خوشی خوشی داخل ہوئی تھیں اور اس دروازے میں سے تم کسی دوسرے کی ہو کر باہر نکل گئی تھیں۔ یہ وہ انار کا درخت ہے جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر تم نے مجھے کہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہد کہ میں تمھیں بھول جاؤں۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں چاہوں بھی تو تمھیں نہیں بھلا سکتی۔"

اور یہ وہ کیکر کا درخت ہے جس کی سوکھی خار دار ٹہنی کا سہارا لے کر پرویز سے کہا تھا:

"اگر تم مجھ سے شادی کا وعدہ کر لو تو میں آج ہی شاہد سے طلاق لے لوں گی۔"

یہ اُس مکان کی دیوار ہے جس کے پاس تم چار بجے مجھے دفتر سے آتا دیکھنے کے لیے پہروں کھڑی رہتی تھیں اور یہ اُس سڑک کا حصّہ ہے جہاں تم نے میرے سکوٹر پر سے چھلانگ لگادی تھی۔ یہ اُس خوبصورت لازنس باغ کا کیبن ہے جس کے اندر بیٹھ کر تم نے میری محبت کی قسمیں کھائی تھیں اور یہی وہ کیبن ہے جس کے اندر بیٹھے بیٹھے تم نے مجھ سے اپنے سارے محبّت نامے طلب کیے تھے اور پھر میرے سامنے ایک خط پھاڑ دیا تھا۔

میں تمھیں ساتھ لے کر گزری ہوئی راہوں پر سے ایک بار پھر گزر رہا ہوں۔ میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ نفرت کا سیلاب آئے تو گھبرا کر میرا ہاتھ چھوڑ مت دینا۔ محبّت کے پُر اسرار سحر انگیز لمحات آئیں تو میرا ہاتھ پیار سے دبا دینا۔ میں کسی طفلِ مکتب کی طرح کل کا لیا ہوا سبق

نہیں دہرا رہا ہوں شیریں! بلکہ تمھارے سامنے تمھاری ہی محبت کا درد بھرا گیت گانے لگا ہوں۔ اُن بدنصیب، غریب الوطن لوگوں کا مرثیہ پڑھنے لگا ہوں جو یروشلم سے سینکڑوں میل دُور بابل و نینوا کے ریگستانوں میں دریائے صبہوان کے کنارے بیٹھے پُرنم آنکھوں سے اپنے وطن کو یاد کرکے رویا کرتے تھے۔ جن کے سامنے اگر کوئی یروشلم کے باغوں میں اُگنے والے گلاب کے پھولوں کے نام لیتا تو ان کے ہونٹوں سے بے اختیار سرد آہ نکل جاتی۔ میں بھی انہی خانہ بدوش شہزادوں کے ساتھ صحراؤں کی خاک چھانتا، دیارِ محبت سے ہزاروں میل دُور، ویران مقبروں کے کھنڈرات میں نکل آیا ہوں۔ میرے پاؤں پر صدیوں کی گرد جمی ہے میری پلکیں غم سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ میں کسی گمنام کنیز کی ٹوٹی پھوٹی قبر کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے ہر قبر پر اپنی محبت کی قبر کا گمان ہو رہا ہے۔ گھاس میں ایک زرد پھول اُگا ہے۔ میں اُس پھول کا چہرہ اپنے آنسوؤں سے دھوتا ہوں اور اپنے ٹوٹے ہوئے بربط کو اُٹھا کر اُن شہزادوں کا نوحہ پڑھتا ہوں جنھوں نے محبت کی اور جن کی لاشوں کو اُن کی محبوباؤں کے رتھ کچلتے ہوئے گزر گئے۔ میں اپنی محبت کی لاش کو بازوؤں پر اُٹھا کر اُس کا چہرہ سُورج کی طرف کرکے اُسے اوپر اُٹھاتا ہوں اور محبت کے دیوتاؤں سے پُوچھتا ہوں کہ اگر دریاؤں کا پانی واپس

برف پوش پہاڑ کی چوٹی پر نہیں چڑھ سکتا، اگر انجیر کے درخت تالاب میں نہیں اُگ سکتے، اگر انگور کے خوشے سمندر کی لہروں پر نہیں لٹک سکتے، اگر گلاب کا پھول کھردری چٹان کا سینہ چیر کر نہیں کھل سکتا، اگر سورج کی کرنیں دھواں بن کر نہیں اُڑ سکتیں۔ اگر چاند سنگ مرمر کی سل کی طرح بے جان ہو کر گھاس پر نہیں گر سکتا تو پھر محبّت کا شہد زہر بن کر مجھے کیسے ہلاک کر گیا؟ پھر یہ کیسے ہو گیا کہ پیار میں اُٹھی ہوئی باہوں نے میری محبت کو اپنی آغوش میں لے کر اُسے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سُلا دیا؟

میں اپنے بربط کی ٹوٹی ہوئی تاروں پر محبت کا پہلا درد بھرا نغمہ چھیڑتا ہوں اور تم سے پوچھتا ہوں شیریں کہ تم جو کبھی شہر کے شور و غل میں میری آواز سُن لیا کرتی تھیں۔ کیا اس گہرے پُر اذیّت سناٹے میں تم تک میرے نغموں کی آہ و بکا نہیں پہنچ رہی؟ کیا تمھیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اس اجڑے شہر میں جہاں میری گم شدہ محبت کی یادگاروں کے کھنڈر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں میری سرد آہیں ویران سرد ہوائیں بن کر چلتی ہیں اور آنسو صبح شام خاک پر اوس بن کر گرتے ہیں؟ کیا تمھیں کبھی کسی نے آکر نہیں کہا کہ شیریں! ہم نے شہر کے بازاروں میں ایک عجیب مجذوب کو دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کی سُرخی ہے اور سینے پر اَن گنت زخم ہیں اور ہر زخم پر تمھارا نام لکھا ہے اور لوگ ہر چوک میں اُسے تمھارا نام

لے کر پتھر مار رہے ہیں ؟ کیا کبھی کسی رات چاند نے تمھارے چہرے پہ
جھک کر نہیں کہا کہ شیریں جس پنچھی کے آشیانے پر تم بجلی گرا کر آرام سے
سو رہی ہو وہ آنکھوں میں اشک لیے سر جھکائے اپنے جلے ہوئے
آشیانے کی تیلیاں چن رہا ہے ؟

جس غریب الوطن کے . . . .

جھونپڑے کا تم نے چراغ گل کر کے اپنے شیش محل کو روشن کیا ہے وہ
اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے راستے کے ہر پتھر پہ تمھارے نام کے بوسے
ثبت کر رہا ہے اور پاؤں میں چبھنے والے ہر کانٹے کو تمھاری محبت کی
نشانی سمجھ کر دل میں پیوست کر رہا ہے ؟ کیا صبح صبح تمھارے پھول
ایسے گالوں کو چوم کر گزر جانے والی ہوا نے کبھی تمھارے کانوں میں سرگوشی
نہیں کی کہ شیریں شاہد نے ساری رات جاگ کر گزار دی ہے ؟ جب سے
تم نے اسے بھلایا ہے وہ ہر رات جاگ کر گزار رہا ہے ۔ کیا تم نے
کبھی میرے دکھی دل کی پھڑپھڑاہٹ نہیں سنی جو صبح و شام تمھاری خواب گاہ
کی بند کھڑکیوں کے ساتھ زخمی پرندے کی طرح سر پٹخا کرتا ہے ؟ کیا کبھی
ایسا نہیں ہوا کہ تم سفید ساڑھی پہن کر کسی سے ملنے اپنے گھر سے نکلی ہو
اور تمھارے کندھے پر پڑے ہوئے پلّو نے تمھارا شانہ دبا کر تم سے کہا ہو۔
او کسی کے پیار کے خون سے ہاتھوں میں مہندی لگانے والی ! کسی کی

محبت کو پاؤں تلے روند کر سر اُوپر اٹھا کر چلنے والی! کسی کے پیار کی قبر پر سے پھول اُٹھا کر اپنے بالوں میں سجا کر کسی دوسرے کا دل بہلانے والی ذرا سنبھل کر اگلا قدم اٹھانا۔ جس کھوکھلی زندگی کی منڈیروں پر گھی کے چراغ جلانے کے لیے تم اتنے جتن کر رہی ہو اُس کا دھاگا کسی بھی سانس کے ساتھ ٹوٹ سکتا ہے؟ اس کا شعلہ ہوا کے کسی بھی جھونکے کے ساتھ بجھ سکتا ہے؟ شیریں! کیا تمھیں اس لباس میں ملبوس دیکھ کر کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ تم نے سفید ساڑھی نہیں بلکہ کسی کی ہلاک شدہ محبت کا کفن پہن رکھا ہے؟ موتیئے کے بے داغ پھول کافور کی بُو دینے لگیں گے۔ محبت کے شعلے سے روشن کیا ہُوا دیا شمع مزار بنے گا اور لوگ میری محبت کی لاش کا کفن بھی نوچ کر لے جائیں گے۔ اس کی خبر نہ تمھیں تھی اور نہ مجھے ـــــ میں تمھیں الزام نہیں دے رہا شیریں بلکہ داد دے رہا ہوں کہ تم نے اگرچہ مجھے بُھلا دیا لیکن میری نشانیوں کو یاد رکھا۔ انھیں دل سے لگائے رکھا جسم سے لگائے رکھا اور انھیں زیب تن کرنا نہیں بھلایا مجھ سے تو میری یہ پیار کی نشانیاں ہی خوش قسمت نکلیں۔ کم از کم انھیں تمھارے ساتھ لپٹے رہنے کا شرف تو حاصل ہے۔

جیسا کہ میں نے تمھیں اکثر بتایا ہوگا شیریں۔ میں نے تم سے ملنے سے پہلے محبت کا ایک خواب دیکھا تھا۔ گویا خواب میں تمھیں دیکھا تھا۔

اور جب تک تم نہ ملیں۔ میں اپنے خواب کی تعبیر کے لیے زندگی کا کشکول لیے دُنیا کے شہروں اور شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرتا رہا۔ تمھاری تلاش میں میں نے جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں۔ کس کس گھاٹ کا پانی پیا۔ کون کون سے صحراؤں کی خاک چھانی۔ اور پھر وہ شُبھ دن بھی طلوع ہُوا کہ تم اچانک مجھے مل گئیں۔ میں نے تمھیں پا کر دنیا کی ہر نعمت کو تیاگ دیا۔ تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دُنیا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے تمھیں اپنے دل کی گہرائیوں میں اُتار لیا۔ میں نے اپنے سانس کو تمھاری سانسوں میں گم کر دیا۔ دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میرے لیے یکساں ہو گئے۔ یہی کیفیت تمھاری بھی تھی۔ تم بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرنے لگیں۔ میں تو خیر اُن بیش قیمت لمحات کو کبھی نہیں بھول سکتا جب تم لارنس کے کیبن، شیخو پورے والے مکان اور سٹیشن والے ہوٹل کے کمرے میں میرے بالوں میں پیار سے اُنگلیاں پھرا کرتی تھیں مگر کیا تم اُن لمحات کو بھول گئی ہو۔ جب میرے سینے پر سر رکھ کر تم رو دیا کرتیں اور کہتیں:

"مجھے اپنے سینے میں چھپا لو شاہد۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ شاہد مجھے دُنیا والوں سے ڈر لگتا ہے۔ قسم کھاؤ کہ تم مجھے کبھی اپنے سے جدا نہیں کرو گے۔"

اُس وقت میرا دل چاہتا کہ کاش میرا سینہ پھٹ جائے اور میں تمھیں

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اندر چھپا لوں۔ اب جب مجھے ان باتوں کا خیال آتا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ایک خوبصورت فریب تھا۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک لڑکی اس قدر محبت اور خلوص کے ساتھ سینے پر سر رکھ کر اپنی وفا شعاری کی قسمیں کھائے اور پھر اُسی سینے میں خنجر گھونپ دے؟ اگرچہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا ہُوا اور ایسا ہو کر رہا۔ اس کے باوجود میرا ایمان ہے کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔ اتنی شدید محبت نفرت میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ تم سے شدید نفرت کا یہ مذموم فعل کبھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ تم اتنی اچھی ہو کہ تم اتنی بُری کبھی نہیں ہو سکتیں۔ خدانخواستہ اگر تمھیں مجھ سے نفرت بھی ہو گئی ہے تو میں اس پر بھی ایمان لاتا ہوں۔ تمھارے ترکش کے اس تیر کو بھی اپنے سینے پر لیتا ہوں۔ کیونکہ جس طرح تمھاری محبت بدل گئی ہے۔ اسی طرح ایک دن یہ نفرت بھی بدل جائے گی۔ اگر تمھاری محبت کو ثبات نہیں تو اس نفرت کو بھی دوام نہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت بھی بڑی محبت سے کر رہی ہو۔ اگرچہ تمھاری شخصیت کے ساتھ نفرت ایسے جذبے کو منسلک کرنا ایسے ہی ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دینا۔ یا سفید کبوتر کے پنجوں کے ساتھ پتھر باندھ کر اس سے پرواز کی توقع رکھنا۔ گلاب کا پھول مرجھا کر خاک

بن سکتا ہے لیکن اس میں سے ہینگ کی بدبو کبھی نہیں آسکتی ۔ تم نے
بھی میری محبت اور دوستی کو اپنی زندگی کی معراج جانا ۔ تم نے بھی تین
سال تک مجھے بے پناہ پیار اور خلوص دیا ۔ تم نے اپنا ایثار، وفا،
محبّت اور خلوص سب کچھ مجھے بخش دیا ۔ ایک لڑکی کا جو سرمایۂ حیات
ہو سکتا ہے ۔ تم نے دوستی اور دوستی کے بعد ازدواجی زندگی میں منسلک
ہونے کے بعد مجھے سونپ دیا ۔ لیکن اس رشتے میں منسلک ہونے کے
بعد تم مجھ سے دُور ہٹنا شروع ہو گئیں ۔ تم نے اس وقت مجھ سے گریز
کرنا شروع کر دیا ۔ جب تمھیں زیادہ سے زیادہ میرے قریب رہنا چاہیے
تھا ۔ اور اس وقت زیادہ سے زیادہ میرے قریب رہیں جب اگر تم
مجھے چھوڑ کر کسی دوسرے کے پاس بھی چلی جاتیں تو میں اخلاقی طور پر
تمھیں الزام نہیں دے سکتا تھا ۔ محبوبہ کو ہر حالت میں یہ حق حاصل ہے کہ
وہ کسی دوسرے سے پیار ہو جانے کی صورت میں اپنے محبوب کو چھوڑ کر
چلی جائے مگر بیوی کو ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے ۔ تم محبوبہ بن کر میری محبت
کو ٹھکرا سکتی تھیں شیریں لیکن بیوی بن کر تمھیں میرے اعتماد کو دھوکا نہیں
دینا چاہیے تھا ۔ محبوبہ جب اپنے محبوب کو ٹھکراتی ہے تو صرف محبت
کرنے والے کی آنکھیں اشکبار رہتی ہیں لیکن جب بیوی اپنے خاوند کو دھوکا
دیتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں کسی دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالتی

ہے تو عرشِ معلّیٰ کا دل بھی دہل جاتا ہے اور کھولتا ہوا لاوا پہاڑوں کے جگر چاک کرنے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے تھا شیریں! لیکن ایسا ہوا اور ایسا ہو کر رہا۔

تم مجھ سے دُور ہوتی گئیں۔ تم نے مجھ سے بے رُخی اختیار کر لی۔ اور پھر تم مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ میں نے تمھاری منّتیں کیں۔ اپنی پچھلی محبّت کا واسطہ دے کر تم سے پُوچھا کہ آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے شیریں! تم مجھ سے نفرت کیوں کرنے لگی ہو؟ مگر تم اس کا کوئی بھی، کبھی بھی خاطر خواہ جواب نہ دے سکیں۔ تم نے مجھے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم خود نہیں جانتیں کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ میں نے تمھیں اُس شیریں کے خلوص اور محبت کا واسطہ دیا جو گھنٹوں بس سٹاپ پر میرا انتظار کیا کرتی تھی جو کڑکتی دھوپ میں میلوں پیدل چل کر مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔ مگر تم نے میری ایک نہ سُنی۔ تمھاری نفرت شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ جانے تم نے میری کن کمزوریوں کا سہارا لے کر پرویز سے پیمانِ وفا باندھنے کے جُرم کو جائز سمجھ لیا تھا۔ اتنے گھناؤنے فعل کے لیے جانے تم نے اپنے ضمیر کو کس طرح مطمئن کیا ہو گا۔ اس سب سے بڑے کوتوال کو تم نے جانے کتنی گراں بہا رشوت دی ہو گی۔

لیکن میری زندگی کی کتاب کا ہر ورق تم پر کھلا تھا۔ میری ہر کمزوری

کی مجھیں خبر تھی۔ میرا ہر پہلو تم پر عیاں تھا اور بقول تمھارے تم نے میری کمزوریوں کو معاف ہی نہیں کیا تھا بلکہ اُن سے محبت بھی کی تھی۔ تم جو میرے پاس اتنی بڑی قربانی کر کے آئی تھیں میری ذرا سی نادانستہ کمزوری کو بھی معاف نہ کر سکیں؟ تم نے تو میری خاطر پہاڑ کی چوٹی پر سے چھلانگ لگا دی تھی۔ پھر کیا ہُوا کہ تم ایک معمولی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑیں اور دوبارہ نہ اُٹھ سکیں؟ تم نے تو میرے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر آندھیوں کے رُخ موڑ دیئے تھے۔ پھر ایسا کیوں ہُوا کہ شادی کے بعد ہوا کا معمولی سا جھونکا تمھیں اُڑا کر لے گیا؟ تم نے تو کبھی مجھ سے ایک ماہ تک الگ رہنے کا تصوّر نہ کیا تھا۔ پھر یہ کیسا انقلاب آ گیا کہ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جانے کے منصوبے بنانے لگیں؟ جس زبان پر کبھی جُدائی کا لفظ نہ آیا تھا وہ طلاق کی رٹ لگانے لگی؟ میرے خدا! کیا تیری دُنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا محبّت کے نشے میں چُور آنکھیں نفرت کے شعلے بھی برسا سکتی ہیں؟

شبریں تم تو میری بیوی تھیں اور بیوی تو گھر کی چار دیواری کے اندر آنگن میں کھلا ہُوا پھول ہوتی ہے۔ وہ کسی تماش بین کے گلے کا ہار کیسے بن سکتی ہے؟ وہ تو طاق میں جلنے والا دیا ہوتی ہے بھلا شمع محفل کیسے بن سکتی ہے؟ وہ تو دل کی انگوٹھی میں جڑا ہُوا نگینہ ہوتی ہے۔ پھر وہ کسی

پنواڑی کی دُکان کا آئینہ کیسے بن سکتی ہے جسے دو پیسے کا گاہک بھی ایک بار جھانک کر ضرور دیکھتا ہے ؟

بہرحال تم نے مجھ سے طلاق لے لی۔ یا میں نے تمھیں طلاق دے دی۔ اس لیے کہ تم نے ایسا چاہا تھا۔ تمھاری اسی میں خوشی تھی اور میں پیار میں کسی زبردستی یا دباؤ کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے صرف تمھاری خوشنودی کے لیے اپنے ہاتھوں اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیا۔ اپنے ہاتھ سے اس ڈالی کو کاٹ کر پھینک دیا جس پر میرا آشیانہ تھا۔ تم نے زندگی بھر مجھ سے ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا اور خود ہی اُسے توڑ کر چل دیں جس پودے کو تم نے اتنی محبت سے سینچا تھا۔ اُسے خود ہی نوچ کر پھینک گئیں لیکن میں نے اُف تک نہ کی۔ میں تمھاری نفرت کی آگ میں جلتا رہا مگر زبان سے شکوہ نہ کیا۔ ذہن میں جوالا مکھیوں کے دہانے انگارے اُگلتے رہے لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی رہی اور تمھاری محبت کے گیت ہی رہے جو اب بھی گا رہا ہوں۔ اگرچہ اس کی ہر لے میں ہزاروں مرثیے دم توڑ رہے ہیں۔

کیا کیا ارمان دل میں نہیں تھے شیریں ؟ کیا کیا نہیں سوچا تھا ؟ کیسے کیسے خواب نہیں دیکھے تھے ؟ کیسے کیسے پروگرام نہیں بنائے تھے ؟ کس چاؤ سے ہم نے بیاہ رچایا تھا۔ کتنی محبت سے تم دلہن بن کر آئی

تھیں۔ کتنے شوق سے ہم نے شاپنگ کی تھی۔ تم نے میرے لیے ٹائیاں پسند کی تھیں۔

"یہ ٹائی آپ کے نیلے رنگ کے سُوٹ کو بڑی میچ کرے گی۔ یہ رومال آپ کو خُوب سجے گا۔"

دلوں میں کتنے ولولے تھے۔ کیا کیا ارمان تھے۔ ہمارا گھر ایک ہو گا۔ پہاڑ کے دامن میں ـــــ چھوٹا سا، پیارا سا گھر، درختوں اور سفید پھُولوں میں گھِرا ہُوا۔ جس کی سبز کھڑکیاں باہر جنگل کی طرف کھُلتیں۔ سردیوں میں ہمارے آنگن میں برف گرا کرتی۔ ہم دونوں بند کمرے میں آتش دان کے سامنے آگ جلا کر بیٹھ جاتے۔ باہر برف گر رہی ہوتی۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوتے۔ میں تمھیں کافی بنا کر دیتا۔ تم میرے ہاتھ سے پیالی تھام کر میری طرف گرم اور چمکیلی آنکھوں سے مسکرا کر دیکھتیں اور میں تمھاری پیشانی چُوم لیتا۔ موسم بہار میں جب درخت پھُولوں سے لدجاتے تو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ سنہری دھُوپ میں پہاڑی راستوں پر میلوں سیریں کیا کرتے اور تتلیاں ہمارا تعاقب کرتیں۔ خزاں میں ہمارا آنگن زرد پتوں سے بھر جاتا۔ پگ ڈنڈیوں پر درخت اپنے سُرخ اور پیلے پتے گرا کر ہمارا خیر مقدم کرتے اور ہم چاندنی راتوں میں بے برگ و بار درختوں کے نیچے پتوں کے قالین پر بیٹھ کر سبز چائے

بیتے اور پیاری پیاری باتیں کیا کرتے۔ پھر زندگی ایک خواب کی طرح گزرتی۔ ایک دُلہن کی طرح گزرتی جو اپنے گوٹہ لگے کپڑے سنبھالے گالوں پر شرم اور مسرّت کی چمک لیے آہستہ آہستہ گزرتی ہے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا شیریں۔ ایسا نہ ہو سکا۔ کتنا خوبصورت خواب تھا اور کس قدر خوفناک اس کی تعبیر ہوئی۔ خواب میں ہم دونوں نہر کنارے پھول چنا کرتے تھے اور بیداری کے عالم میں میں اکیلا سڑکوں کی خاک اڑا رہا ہوں۔ تمھیں یاد ہے شیریں جس روز تم دلہن بن کر میرے پاس آئی تھیں۔ اس کے دوسرے ہی روز میرے دوست نے بھابی عشرت کے ساتھ مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اُنھوں نے ہمیں بھی دعوت دی تھی۔ میں اپنی دفتری مصروفیات کی وجہ سے نہ جا سکا اور پھر تم میری زندگی کی ساتھی تھیں۔ پہاڑ پر جانے کا پھر بھی پروگرام بن سکتا تھا۔ میں نہ جا سکا اور وہ چلے گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں رہ کر ایک ہفتے کے اندر ہی اندر میرا سرمایۂ حیات مجھ سے چھین لیا جائے گا اور تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے چلی جاؤ گی تو میں اُسی روز تمھیں پہاڑ پر لے جاتا اور پھر کبھی اُس ماحول میں واپس نہ لاتا۔ یہ پچھتاوا مجھے عمر بھر رہے گا۔ کاش میں تمھیں مری لے جاتا۔ پھر شاید میری زندگی کی کتاب کا یہ گھناؤنا باب کبھی نہ کھلتا۔ ممکن ہے پہاڑوں کی معصوم اور حسین فضاؤں میں رہ کر تم اتنا خوفناک اور گھٹیا

قدم نہ اُٹھا سکیں۔

شاید اس افسوسناک اقدام میں پرویز کی ترغیبات کا زیادہ عُنصر شامل ہو۔ کیونکہ تم اتنی ہلکی سطح پر کبھی نہیں آسکتیں شیریں۔ یہ میرا ایمان ہے کیونکہ روشنی اندھیرے سے مات نہیں کھا سکتی۔ اُسے تو تاریکیاں زیادہ روشن اور تابناک کر دیتی ہیں۔ لیکن تم نے روشنی کو چھوڑ کر اندھیروں کا ساتھ دیا اور مجھ سے بچھڑ کر چلی گئیں اور میں تمھاری صورت تک کو ترس گیا۔ تم نے مجھ سے میرے وہ خطوط بھی لے لیے جو ہماری محبت کی یادگاریں تھیں۔ تم نے ان تمام خطوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ تم نے میرے پاس اپنی ایک بھی نشانی نہ چھوڑی۔ صرف اس لیے کہ میرے پاس تمھیں یاد کرنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے۔ میری حالت اُس بدنصیب بیوہ کی ہوگئی جس کی گود سے اُس کے بچّے بھی چھین لیے جائیں مگر یہ تمھاری بھول تھی۔ تم پھول سے اس کی پنکھڑی نوچ سکتی ہو لیکن اس کی خوشبو اُس سے الگ نہیں کر سکتیں۔ تم مجھ سے اپنے سارے محبت نامے واپس لے سکتی ہو مگر اپنی یاد واپس نہیں لے سکتیں۔ وہ زخم نہیں بھر سکتیں جو تم نے انتہائی بے دردی سے ایک فنکار کی محبت کو ہلاک کرنے کے لیے لگائے تھے۔ اب تو مجھے یہ زخم بھی تمھاری ہی طرح عزیز ہیں۔ تمھاری بے وفائیاں سلامت رہیں۔ یہ کبھی نہیں بھریں گے۔ رات کی خاموشیاں ان پر مرہم رکھتی ہیں اور دن کے

اُجالے پھر سے کرید ڈالتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا شیریں کہ میں اپنی محبت کی کشتی کو نیلے سمندر میں نہیں بلکہ گرم ریت میں کھیے رہا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں جس گلزار میں آنکھیں بند کئے لیٹا ہوں۔ وہاں چاروں طرف کاغذ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم ایک ہاتھ سے مجھے محبت دو گی اور ایک ہزار ہاتھوں سے اسے واپس نوچ کھسوٹ کر لے جاؤ گی۔ تم تو کہا کرتی تھیں شیریں کہ دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔ پھر تم مجھے موت کے مُنہ میں چھوڑ کر کیسے چلی گئیں؟ تمھیں تو مجھ سے محبت کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ میں نے تمھیں کئی بار کہا تھا کہ شیریں میری زندگی حقیقی محبت سے بالکل خالی رہی ہے۔ میری جھولی ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ میری زندگی میں کبھی بہار نہیں آئی۔ میرے چمن میں کبھی کوئی پھول نہیں کھِلا۔ میری کشتیِ حیات ہمیشہ بغیر پتوار کے طوفانوں میں گھری رہی ہے۔ تم نے کہا تھا۔ شاہد! میں جو موجود ہوں۔ میں تمھاری جھولی کے کانٹے اپنی پلکوں سے اٹھا لوں گی اور اُن کی جگہ پھول بھر دوں گی۔ اور تم نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جاتی دفعہ صرف تم نے اتنا کیا کہ میری جھولی میں پہلے سے بھی زیادہ کانٹے بھر گئیں بلکہ میرے اعتماد کا دامن ہی تار تار کر دیا۔ اُس جھولی کے ہی ٹکڑے اڑا دیئے، جہاں کبھی اور کچھ نہیں تو کم از کم کانٹے تو رہا کرتے تھے۔ اب پھول تو کجا

اُن میں تمھاری بے وفائیوں کے کانٹے بھی نہیں رکھ سکتا۔ میرے جسم کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جہاں تمھاری بداعتمادی اور جور وستم کا زخم نہ لگا ہو۔ شیریں! میرے صرف دو ہاتھ ہیں اور تمھاری محبت کے زخم جگہ جگہ سے خون اُگل رہے ہیں۔ میں کس کس زخم پہ ہاتھ رکھوں؟ کہاں کہاں سے خُون کے فواروں کو بند کردوں؟ تم نے مجھ سے کیا مُنہ موڑا شیریں مجھ سے چاند اور سُورج نے مُنہ موڑ لیا۔ آج میں زندگی کی جن راہوں پر خاک اڑاتا پھر رہا ہوں وہاں سوائے بھیانک اندھیروں کے اور کچُھ نہیں۔ ان اندھیروں میں تمھارا خوبصورت چہرہ کبھی کبھی بجلی بن کر چمک جاتا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس دن ہال روڈ پہ ملنے کے بعد تم مجھے کبھی نہیں ملوگی تو میں اڑتے ہوئے وقت کے پاؤں پکڑ لیتا سُورج کے اکھڑتے ہوئے خیمے کی طنابیں تھام لیتا۔ اس تیز رفتار جُدا کر دینے والی آندھی کے آگے پہاڑ بن کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن تمھیں اپنے سے کبھی جُدا نہ ہونے دیتا۔ تمھارے بغیر میری حالت کسی مزار کے اُس بے کس چراغ کی سی ہے جسے بادِ مخالف نے صبح ہونے سے پہلے ہی بُجھا دیا ہو۔ کل جن راستوں پر درختوں سے پھُول گرا کرتے تھے، آج وہاں خاک اڑتی ہے۔ کل جہاں چاند تمھاری باہنوں کا سہارا لے کر نکلا کرتا تھا آج وہاں تاریکیاں تمام نام لے لے کر بین کر رہی ہیں۔ کل

جہاں تم نے قہقہوں کے بیج بکھیرے تھے آج وہاں سے میں آنسوؤں کی فصل کاٹ رہا ہوں۔ کل جہاں تمھاری سانس گلاب کی خوشبو بن کر فضا کو معطّر کیا کرتی تھی وہاں آج زہر بھری ہوائیں چل رہی ہیں۔ جن درختوں کے ساتھ ٹیک لگا کر تُم نے کل محبت کی باتیں کی تھیں۔ آج ان درختوں پر کوئی پھُول نہیں کھل سکا۔ ان کی ڈالیوں پر کسی نوخیز پتّے کی کونپل تک نہیں پھُوٹ سکی۔

کبھی جب تم میرے سکوٹر پر بیٹھیں، اپنا سر میرے کندھے سے لگائے شیخوپورہ روڈ پر سے گزرا کرتی تھیں تو کھیتوں میں کام کرنے والی دیہاتی دوشیزائیں اپنا کام چھوڑ کر رشک اور مسرّت کے جذبات سے مجھے دیکھا کرتی تھیں۔ وہ سوچا کرتی تھیں کتنی خوش نصیب ہے یہ لڑکی جس کو اتنا اچھا محبوب ملا ہے اور کتنا خوش بخت ہے یہ لڑکا جس کو اس قدر محبت کرنے والی لڑکی ملی ہے۔ لیکن اگر آج انھیں میرے حال کا علم ہو جائے۔ اگر میں اپنا تار تار پیرہن، زخموں سے بھرا ہُوا جسم، زہریلے تیروں سے چھلنی دل اور خُون اُگلتا سینہ لیے اُن کے کھیتوں میں نکل آؤں تو معصوم دہقان زادیاں محبت کا یہ ہولناک انجام دیکھ کر اپنے کھیتوں میں آگ لگا دیں اور درانتیاں اپنے سینوں میں پیوست کر لیں۔ اگر شیزان کے باہر کھڑے ہو کر گجرے بیچنے والے کو معلوم

ہو جائے کہ جس دلہن کے لیے میں بڑے چاؤ سے روزانہ گجرے خرید کر لے جایا کرتا تھا وہ گاڑی میں بیٹھ کر کسی دوسرے کے ساتھ قہقہے لگاتی اور میرے سکوٹر پہ خاک اڑاتی سڑک پر سے گزر جاتی ہے، تو وہ اپنے سارے گجرے اسی چوک میں زمین کھود کر دفن کر دے اور پھر کبھی کسی محبوب کو اپنی محبوبہ کی کلائیوں میں باندھنے کے لیے گجرے لا کر نہ دے۔ اگر میں اس انار کے درخت کو تمھاری بے وفائی کی کہانی سناؤں جس کے ساتھ ٹیک لگا کر تم نے مجھ سے اپنی محبت کی قسم کھائی تھی تو اس کی ٹہنیوں کو آگ لگ جائے اور وہ بھڑک کر بھسم ہو جائیں۔ جس مسجد کی چار دیواری میں بیٹھ کر تم نے مجھ سے دودھ کے ایک پیالے پر بیاہے جانے کی تمنّا کا اظہار کیا تھا۔ اگر ان تک میری شب و روز کی آہ و زاری اور نالوں کی خبر پہنچ جائے تو ان کے سینے پھٹ جائیں اور اس کے میناروں سے اذان کی صداؤں کے ساتھ ساتھ سر بفلک شعلے بلند ہوتے دکھائی دیں۔

لیکن میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ میں نے اس چوٹ کو اندر ہی اندر سہہ لیا ہے۔ اس زخم پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے دنیا والوں کی نظروں سے چھپا لیا ہے۔ میں وضع دار آدمی ہوں چوٹ کھا کر آہ کرنا نہیں جانتا۔ زخم کھا کر زمین پہ گرنا نہیں جانتا۔ میں

اپنا سر کٹوا سکتا ہوں مگر اُس میں خاک ڈال کر اپنی شیریں کی بے وفائیوں کی تشہیر نہیں کر سکتا۔ بہترین کپڑے پہن کر چپکے چپکے رو سکتا ہوں لیکن کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نہیں نکل سکتا۔ تمہارے ترکش سے نکلے ہوئے ہر تیر نے میرے جسم کو چھلنی ہی نہیں کیا شیریں بلکہ ہر زخم پر تمہارا نام بھی لکھ دیا ہے۔ پھر میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ لوگ میری احوال پُرسی کرنے آئیں۔ میرے زخموں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھیں اور تمہارا نام پڑھ کر تجھے رسوا کریں۔ میں مر سکتا ہوں لیکن تمھیں بدنام نہیں کر سکتا۔ کل جس چیز کو بھری محفل میں سونا کہہ کر اپنے گلے کا ہار بنایا تھا آج میں اُسے مٹی کہہ کر اپنے حُسنِ انتخاب کی توہین نہیں کر سکتا۔ کل جس چیز کو میں نے شہد کا نام دے کر لوگوں کے سامنے اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا، آج اُسے زہر کہہ کر اگر میں اپنی زبان کھرچنے لگوں تو لوگ میری سادہ لوحی اور تمھاری بے وفائیوں پر انگلیاں اُٹھائیں گے اور یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میری محبت کی وضع داری اور خوش اعتقادی مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں شہر کے گلی کوچوں میں سر پھوڑ کر تمہارا نام لے لے کر پاگلوں کی طرح بین کرتا پھروں اور تمھیں رسوا کروں۔ تم نے بڑے اعتماد سے جو مجھے زہر دیا تھا میں نے اُسے آبِ حیات سمجھ کر پی لیا ہے اور زندگی کے آخری لمحات تک اُسے آبِ حیات کے

نام سے ہی پکاروں گا خواہ وہ زہر میرے جسم میں آگ لگا دے اور میری ہڈیوں کو پانی بنا کر بہا دے۔ تم میری محبت کو ہلاک کر سکتی ہو لیکن میں تمھارے اعتماد کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم ایسی نہیں ہو۔ جو ہاتھ بچے کو دودھ پلانا ہی جانتے ہوں وہ اس کا گلا کبھی نہیں گھونٹ سکتے۔ تم سے ایسا گھناؤنا فعل کبھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ تم گھر سے میرے لیے آبِ حیات ہی لے کر نکلی تھیں لیکن راستے میں کسی نے زہر ملا دیا اور تمھیں خبر ہی نہ ہوئی۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ زہر تمھارے ہاتھوں نے ہی ملایا تھا۔ پھر بھی میں لوگوں سے ہمیشہ یہی کہوں گا کہ میں نے تو آبِ حیات پیا تھا۔ پھر جانے میرا جسم نیلا کیوں پڑ گیا؟ اور زندگی ہونٹوں سے سیاہ خون بن کر کیوں بہنے لگی؟ اس لیے کہ مجھے تمھاری محبت، اپنا اعتماد اور تمھاری عزت برابر کے عزیز ہیں۔ میں تو کسی کے سامنے سرد آہ بھی نہیں بھرتا، کہیں وہ تمھارا نام نہ سُن لے۔ میرا دل خُون کے آنسو رو رہا ہوتا ہے لیکن میں لوگوں سے ہنس ہنس کر بات کرتا ہوں۔ اس خیال سے کہ اگر میں اداس ہو گیا تو وہ میرے ماتھے پر سے تمھارے غم کی تحریر پڑھ لیں گے اور تمھیں ظالم کہہ کر پکاریں گے، جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اسی طرح بال بنا کر، اُجلے کپڑے پہن کر چہرے پر مسکراہٹ لیے گھر سے باہر نکلتا ہوں۔ اگر کوئی دیکھے تو کہے کہ

اس شخص کو دُنیا کا کوئی غم نہیں ہے لیکن اگر تم میرا نیلا سوٹ اور قمیض پرے ہٹا کر دیکھو تو تمھیں میرے جسم پر خاک اُڑتی نظر آئے گی۔ میری بظاہر مُسکراتی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو تو تمھیں ایک گہرا اندھیرا، ویران کنواں دکھائی دے گا جس کی تاریک تہہ میں زنگ آلود ٹھنڈے پتھروں کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ میری نیلی واسکٹ پر کان رکھ کر سُنو تو تمھیں میرا دل ہر دھڑکن کے ساتھ سِسکیاں بھرتا سُنائی دے گا۔ اگر تم میرا سینہ چیر کر دیکھو تو اندر تمھیں ایک ایسا میدان نظر آئے گا جہاں ریت کے جھکڑ چل رہے ہوں گے اور نیم جان زخمی شہزادوں کی لاشوں پر گِدھ منڈلا رہے ہونگے لیکن یہ میرے دل کی باتیں ہیں۔ انھیں کوئی دُوسرا کیا جانے؟ یہ میری روح کے گھاؤ ہیں۔ انھیں کوئی دوسرا کیا محسوس کرے گا؟ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں۔ اگر کچھ گلہ ہے تو اپنی قسمت سے ہے۔ جس نے مجھے تمھارے ہاتھوں ایسا زہر پلوا دیا جس کا کوئی تریاق نہیں تھا۔ ایسا زخم لگوا دیا جس کا کوئی مرہم نہیں تھا۔ مجھے تو اُس دشمن سے شکایت ہے جس نے مجھ پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ میں تلوار سے کیا شکوہ کروں جو دشمن کے ہاتھ میں بے بس تھی۔ جس کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ وہ دوست کا سینہ چاک کر رہی ہے یا دشمن کا؟ —— لیکن تلوار کی ہلاکت آفرینی پر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔ اُس کا کام ہلاک کرنا تھا اور اُس نے کر دیا۔

میرا کام زخم کھا کر اپنے قاتل کا نام لیے بغیر زمین پر گر کر تڑپنا تھا اور میں تڑپ رہا ہوں۔

شیریں! مجھے میرا سامان بھجوا دینا اس قدر ناگوار لگا کہ تم نے میرے سکوٹر پر سے چھلانگ لگا دی اور مجھ سے ایک دم طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا؟ اُس وقت میں حالات سے پُوری طرح باخبر نہ تھا میں یہ سمجھا کہ تم پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہُوا کہ ایسی بات نہ تھی۔ بلکہ تم نے پرویز کو قول دے رکھا تھا کہ تم فوری طور پر مجھ سے طلاق لے کر اُس سے شادی کر لو گی۔ مگر تمھیں مجھ سے طلاق مانگنے کی کوئی وجہ نہیں مل رہی تھی۔ جس طرح دونوں محاذوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہُوئے دشمن سپاہی اس بات کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کسی ایک جانب سے پہلے گولی چلے اور پھر وہ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیں حقیقت میں تم میری کسی لغزش کے انتظار میں تھیں۔ میری بدنصیبی کہ میں نے دونوں کی بھلائی بیشِ نظر رکھتے ہوئے تمھارا سامان تمھارے گھر بھجوا دیا، اور یوں میرے محاذ پر سے پہلی گولی چل گئی اور تم نے اپنے محاذ کی ساری توپوں کا مُنہ کھول دیا۔ میں نے تمھاری منتیں کیں کہ شیریں طلاق مت لو۔ طلاق کا لفظ ایک بیاہتا استری کے لیے موت کے مترادف ہوتا ہے، مگر تم نہ مانیں اور تم نے وہ پودا جڑ سے اکھیڑ ڈالا جس کی آبیاری ہم

نے اپنے خون سے کی تھی اور تمھیں احساس تک نہ ہُوا۔ اس کے باوجود اگر تم
ایک بار بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتیں تو میں تمھاری ساری زیادتیوں
کو بھول جاتا۔ مگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تمھاری ضد نے مجھ سے تمھارا دامن چھڑوا
دیا۔ تم مجھ سے دُور چلی گئیں اور میں نے صرف تمھاری خوشی کی خاطر اپنا سب
کچھ لٹوا دیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ تمھارے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔ میں نے
تمھاری محبت زورِ بازو سے حاصل نہیں کی تھی شیریں۔ بلکہ اسے منّتوں اور
مرادوں سے پایا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی درازئ عمر کی دعائیں کی
تھیں۔ مزاروں پر جا جا کر اس کی پائیداری اور استقامت کے چڑھاوے
چڑھائے تھے۔ میں تمھاری کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ تم نے جائز و
ناجائز جس طریقے سے بھی علیحدگی چاہی میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس بساط
پر اچھی سے اچھی چال چل سکنے کے باوجود تم سے شکست مان لی۔ بہتر سے
بہتر مہروں کے ہوتے ہوئے بھی تم سے مات کھا لی اور سب چالیں بھول
گیا۔ تمھیں یاد ہے شیریں؟

جب کبھی بھی تم چھوٹی چھوٹی باتیں سوچنا شروع کرتیں تو میں تمھیں
ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ شیریں اچھی اچھی باتیں سوچا کرو۔ اپنی زندگی کو بہتر بنانے
کے اچھے اچھے پروگرام بنایا کرو۔ تمھیں ایک چھوٹا سا کاٹج، سرسبز وادیاں
اور سفید پھولوں سے بھرا ہُوا باغیچہ بہت پسند ہے ناں؟ تو انہی چیزوں کے

بارے میں سوچا کرو۔ مگر تم اندر ہی اندر جانے کیا کیا سوچتی رہیں۔ کاش! اگر تمھیں کوئی غلط قدم اُٹھانا ہی تھا تو شادی سے پہلے ہی اُٹھا لیا ہوتا کیونکہ تمھارے سامنے میری کتابِ زندگی کا ہر ورق کھُلا تھا۔ تم میری کسی بھی کمزوری کا بہانہ بنا کر مجھ سے الگ ہو سکتی تھیں۔ اگر میری کسی لغزش کو ڈھال بنا کر تمھیں مجھ پر وار کرنا ہی تھا تو اُس وقت کرتیں جب تم میری منکوحہ نہیں تھیں۔ جب تم ایک کلی تھیں۔ پھُول بننے کے بعد تم نے گُلچیں کی تلاش کیوں شروع کردی؟ اگر تمھیں اُونچے اُونچے محلوں کی تلاش تھی تو پھر ایک آرٹسٹ کے جھونپڑے میں پیار کا چراغ کیوں جلایا تھا؟

شیریں! میں زندگی میں کبھی اتنا بدنصیب نہیں ہُوا تھا جتنا تم سے ملنے کے بعد خود کو محسوس کر رہا ہوں جب میں سوچتا ہوں کہ تم نے پرویز سے بیاہ کر کے اُسی گھر میں اُس کی بیوی بننے کا پروگرام بنا رکھا تھا جہاں تم میرے ساتھ دُلھن بن کر آئی تھیں تو میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ شیریں! اگر پرویز کے گھر والے دوست کشی اور بدعہدی کی مخالفت نہ کرتے تو کیا واقعی تم اس گھر میں پرویز کی بیوی بن کر رہ لیتیں؟ کیا تمھیں اُن کمروں میں چلتے پھرتے کبھی احساس نہ ہوتا کہ یہاں کبھی شاہد تمھارے لیے پھولوں کے گجرے لایا کرتا تھا؟ کیا پرویز کے لیے چائے بنا کر اس کے سامنے بڑے ادب سے پیالی رکھتے ہوئے تمھیں کبھی محسوس نہ ہوتا کہ تم نے شاہد کو اسی پیالی میں کبھی زہر دے کر ہلاک

کیا تھا؟ کیا تمھیں اُس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہوئے کبھی یہ خیال نہ آتا کہ تم نے یہ پھول شاہد کے جنازے پر سے چُنے تھے؟

آہ! اگر انسان اتنا پتھر دل بھی ہو سکتا ہے تو پھر اس دُنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ پھر قبروں پر بدفعلی ہو سکتی ہے اور مُردہ عورتوں کا جسم نوچا جا سکتا ہے اور بھائی اپنی بہن کا گریبان کھینچ سکتا ہے۔ پھر ہماری ساری تہذیب ہمارا تمدّن، ترقی، اخلاقی قدریں اور شرافت کے اصُول کس جہنم کا ایندھن ہے؟ لیکن نہیں شیریں! ایسا نہیں ہے۔ زندگی بسر کرنے کے کچھ اصول ہیں کچھ ضابطے ہیں۔ کچھ اخلاقی مسلک ہیں۔ نیچر نے انسان کو جنگل میں پیدا کیا تھا۔ جہاں سوائے درندگی، وحشت، بربریت اور ظلم کے اور کچھ نہیں تھا جہاں کوئی کسی کی بہن اور کوئی کسی کی بیوی نہیں تھی۔ جہاں طاقت اور شہوت ہی سب سے بڑا اخلاق اور سب سے بڑی تہذیب تھی مگر انسان نے ہزاروں برس کی طویل کش مکش، کٹھن جدوجہد اور حیرت انگیز قربانیوں کے بعد اس دُنیا میں تقدّس و الوہیت کا کعبہ بنایا۔ استقامت کے اہرام کھڑے کیے، محبت کے تاج محل تعمیر کیے اور شرافت و نیکی کے قطب مینار بنائے بہن سے کہا کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے۔ بھائی سے کہا کہ اس کی ایک ماں بھی ہے۔ ماں سے کہا کہ اس کا ایک خاوند بھی ہے۔ خاوند سے کہا کہ اس کی ایک بیوی بھی ہے اور بیوی سے کہا کہ اس کی کچھ ذمہ داریاں

بھی ہیں۔ اُس پر کچھ اخلاقی ضابطے بھی لازم ہوتے ہیں۔ بُرائی اِن اصولوں کو توڑنے کا نام ہے اور نیکی اِن اصولوں کی پابندی کو کہتے ہیں۔

شیریں! تم نے صرف ان اُصولوں کو ہی نہیں توڑا بلکہ میرا دل بھی توڑ دیا۔ اور پھر بھی تم اتنی سنگدل رہیں کہ تم نے مجھ سے طلاق لے کر وہاں رہنا بھی گوارا کر لیا۔ تم نے سب کے سامنے مجھ سے بے رُخی برت کر پرویز پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تم اپنے خاوند کی اور اپنے بیوی ہونے کے ناموس کی ذرّہ برابر بھی پرواہ نہیں کرتی ہو۔ شیریں تمھاری عقل اور غیرت کو کیا ہو گیا تھا؟

جس گھر کے ساتھ میری کئی سالوں کی وابستگی تھی۔ جہاں کے رہنے والوں سے میرے تم سے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔ اب میں اُس گھر میں داخل ہوتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ مجھے وہاں کی ہر شئے بیگانی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی میں تمھارا ہاتھ تھام کر وہاں داخل ہوتا تھا۔ اب دہلیز پہ قدم رکھتے ہی اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ اپنا کلیجہ تھام لیتا ہوں۔ کہیں دل دھڑکنا بند نہ کر دے کہیں کلیجہ غم سے مُنہ کو نہ آجائے۔ اپنے دوست سرفراز اور بھابی عشرت کے بے پناہ خلوص اور محبت کی وجہ سے میں وہاں جاتا ہوں تو خود پر ایک ایسے آدمی کا گمان ہوتا ہے جو اپنی قبر پر آپ ہی فاتحہ پڑھنے آگیا ہو۔ اُس باپ کا گمان ہوتا ہے جو اپنے بچے کی لاش کے ٹکڑے اٹھانے آیا ہو۔

جتنی دیر وہاں بیٹھا رہتا ہوں مجھے تمھارا چلنا، پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، چائے پینا، باورچی خانے میں میرے لیے ناشتہ تیار کرنا۔ نازک ہاتھوں سے روٹیاں پکانا، تمھارا ہنسنا رونا سب کچھ یاد آتا ہے۔ تمھاری باتوں کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

"شاہد! کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں اگر چاہوں بھی تو تمھیں نہیں بھلا سکتی . . . ."

"کیا ایک منٹ ایک منٹ لگا رکھی ہے آپ نے؟ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟ . . . ."

"نہیں شاہد یہ نفرت نہیں ہے۔ میں خود نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے . . . ."

"اگر میں شاہد سے طلاق لے لوں تو کیا تم مجھ سے شادی کر لو گے پرویز؟"

میرے لیے وہاں بیٹھنا سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ میں تمھیں بانہیں پھیلائے اپنی طرف بڑھتے دیکھتا ہوں۔ میں تمھیں نفرت سے دامن جھٹکتے دیکھتا ہوں۔ تم سفید ساڑھی میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑی میرے لائے ہوئے گجرے بالوں میں لگاتی دکھائی دیتی ہو۔ میں تمھارے پیچھے کھڑا تمھیں محبت سے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ پھر تمھیں کسی دوسرے کی بانہوں میں اُلجھ کر محبت کے نئے پیمان باندھتے دیکھتا ہوں۔ تم ناشتہ دان میرے ہاتھ میں دے کر خاموش

آنکھوں سے مجھے دفتر سے جلدی واپس آنے کو کہہ رہی ہو۔ پھر میں وہ فرد دیکھتا ہوں جس کے پتھروں پر بیٹھ کر تم نے پرویز سے کہا تھا:

"میں شاہد سے علیحدہ ہو جاؤں گی پرویز۔ میں تم سے شادی کر لوں گی..."

یہی وہ گھر تھا شیریں جہاں تم نے مجھے اپنی زندگی کی سب سے عظیم محبت اور عظیم نفرت دی۔ اِسی گھر میں تم نے میری محبت کی نشانی کو جنم دیا اور اسی گھر میں تم نے اُس نشانی کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا جس نے ابھی سُورج کی پہلی کرن بھی نہیں دیکھی تھی۔ اسی گھر میں تم نے ایک مقدّس بیوی کی حیثیت سے شبِ عروسی منائی اور اسی گھر میں تم نے اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں پرویز سے اظہارِ عشق شروع کیا۔ سوچتا ہوں وہ زمین کیوں نہ پھٹ گئی جس پر تم نے بیوی کی حیثیت سے بیٹھ کر غیر مرد کا ہاتھ تھاما؟ وہ چھت کیوں نہ گر پڑی جس کے سائے میں یہ گھناؤنا کھیل کھیلا گیا؟ ان دیواروں کی غیرت کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ شق نہ ہوئیں جب اُنھوں نے دیکھا کہ بیوی اپنے خاوند کو دفتر بھجوانے کے بعد کسی دوسرے مرد سے اظہارِ محبت کر رہی ہے؟ شیریں! تم پرویز سے پیمانِ وفا باندھنے سے پہلے بھی مجھ سے طلاق لے سکتی تھیں۔ تم مجھ سے طلاق لینے کے بعد بھی ایسا کر سکتی تھیں۔ بیوی ہوتے ہوئے تم سے ایسا کیونکر ہوا؟ تم جو اتنی معصوم، باغیرت مند، حسّاس، اور حیا دار ہو۔ تم نے خاوند کے اعتماد کو دھوکا دینا کیسے گوارا کر لیا؟

تم نے تو ایک خط میں لکھا تھا کہ شاہد! میں ساری زندگی صرف تمھاری یاد میں ہی بسر کر سکتی ہوں اور تم میرے ساتھ شادی کے سات روز بھی نہ بسر کر سکیں؟ ابھی تو تمھاری افشاں کی چمک بھی ماند نہ پڑی تھی کہ تم نے میری محبت کا مُنہ کالا کر دیا؟ ابھی تو تمھاری مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا تھا کہ تم نے میرے پیار اور اعتقاد کو کُند چھُری سے ہلاک کر دیا اور اُس کے خُون کے چھینٹوں سے در و دیوار کو لالہ زار بنا دیا؟ ان سات دنوں میں تو نئی نویلی دُلہن کی شرم بھی پوری طرح نہیں اُترتی کہ تم نے اپنا دوپٹہ اتار کر باہر گلی میں پھینک دیا؟ ان سات دنوں میں تو دُلہن کی آنکھیں بھی پُوری طرح اُوپر نہیں اُٹھتیں کہ تم نے خاوند پر وار کرنے کے لیے ہاتھ بھی اُٹھا لیا؟ تمھارے عروسی کے زرتار جوڑے کی سلوٹیں بھی دُور نہیں ہوئی تھیں کہ تم نے اُسے بھرے بازار میں تار تار کر کے اپنے لیے دوسرے عروسی جوڑے کا انتخاب کر لیا؟ تم نے میرے اعتماد کو ٹھکرا کر ایک غیر آدمی کو اعتماد میں لیا اور اُس پر اپنے دل کی ہر بات عیاں کر دی۔ تم نے مجھے کچھ نہ بتایا شیریں، جس کو سب کچھ معلوم ہونا چاہیے تھا اور اُس شخص کو سب کچھ بتا دیا۔ جس کو کچھ بھی نہیں بتانا چاہیے تھا۔

آہ! یہی وہ گھر ہے جس کے باسی میرے ساتھ میرے بیاہ میں شریک ہوئے۔ جنھوں نے میرے ساتھ مل کر تمھاری شادی کے کپڑے خریدے۔

جنھوں نے نکاح کا اہتمام کیا اور جن ہی کے ہاتھوں میری برات گھر پہنچنے سے پہلے ہی لُٹ گئی۔

شیریں! سوچو اگر بہن کا بھائی سے، خاوند کا بیوی سے اور ماں کا بیٹے سے اعتماد اُٹھ جائے تو ہمارے لیے ان گھروں کی چاردیواری میں زندہ رہنا کس قدر دشوار ہو جائے۔ پھر دنیا میں سوائے وحشت، بربریت اور درندگی کے اور کیا باقی رہے؟ نہیں نہیں شیریں! ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا اور کسی کو یہ حق نہیں کہ انسانیت کو ایک بار پھر جنگل کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دے اور یوں انسانی تہذیب کی جدوجہد کے عظیم ورثے کو خاک میں ملا کر رکھ دے۔ کیا تمھیں کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ تم نے اپنے اس نادانستہ فعل سے جنگل کی طرف پہلا قدم اُٹھایا تھا؟ پھر بھی میں تمھیں موردِ الزام نہیں ٹھہراتا شیریں! کیونکہ تم دشمن نہیں تھیں بلکہ دشمن کے ہاتھ میں لہرانے والی تلوار تھیں۔ جو اندھی ہوتی ہے اور اپنے مالک کے سہارے چلتی ہے۔

مگر اب جبکہ تلوار چل چکی ہے۔ قلم چل چکا ہے اور قسمت کا لکھا میرے سامنے آ چکا ہے۔ میں کس کو جا کر اپنا زخم دکھاؤں؟ کس سے اپنی سخت جانی کی داد پاؤں؟ شیریں! میں خودکشی نہیں کر سکا۔ اسی لیے مجھے دن میں بار بار خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ میں ایک ہی بار مر کر اپنی زندگی کا

خاتمہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس ویران زندگی کی دہلیز پہ صرف اس اُمید پہ یہ ٹمٹماتا ہُوا چراغ جلا رکھا ہے کہ شاید کسی روز تم پر دنیا والوں کی بے ثباتی اور خود غرضیوں کا بھرم کُھل جائے اور تم بھی میری طرح زخموں سے چُور دِل لیے میری تلاش میں ادھر آنکلو اور اندھیرا دیکھ کر واپس نہ چلی جاؤ۔

میں نے اپنی محبت کی کتاب جس کا ہر ورق تم پر کُھلا تھا اور جس کی ہر سطر میں سوائے تمھارے نام کے اور کُچھ نہیں لکھا تھا بند کر دی ہے۔ میں سڑک پر سے گزرتا ہوں تو کئی خوبصورت آنکھیں مجھے اپنے قریب آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ کئی نازک ہاتھ مٹھیوں میں ریشمی رُومال تھامے مجھے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ لیکن میں اندھا بن کر گذر جاتا ہوں۔ اس لیے کہ آرٹسٹ زندگی میں صرف ایک بار اپنا شہکار بناتا ہے جس میں وہ اپنی زندگی کے سارے رنگ اور اپنے جذبات کے سارے خطوط بھر دیتا ہے۔ اس کے بعد نہ اُس کے پاس کچھُ باقی رہتا ہے اور نہ دُنیا ہی اُسے کچھُ پیش کر سکتی ہے۔

اور پھر سوچو شیریں! جب تم مجھ سے چلی گئیں جو مجھے اتنا پیار کرتی تھیں تو میں کیسے کسی دوسری لڑکی سے محبت کرنے کی جراُت کر سکتا ہوں۔ جب تم میرے اعتماد کو دھوکا دے سکتی ہو کہ جس کی پاکیزگی ضمیر کی میں قسم کھا سکتا تھا اور جس کے آنچل پہ میں خدا کی عبادت کر سکتا تھا تو میں دُنیا کی کسی بھی لڑکی پہ کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں۔ شیریں! تم نے

صنفِ نازک کی پوری نسل کی شرافتِ طبع کو میرے لیے مشکوک کر دیا ہے
تم میری ہی نہیں بلکہ اپنی برادری کی ہر عورت کے سامنے جواب دہ ہو۔
اور فرض کر لو۔ اگر میں تمہاری تلخ یادوں کے نقوش مٹانے کے لیے
مجبوراً کسی سے محبت کر بھی کر لوں تو اُسے کہاں لے کر جاؤں ؟ کس
جگہ کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کروں ؟ کس ہوٹل میں لے جا کر اُسے بٹھلاؤں ؟
اس شہر میں کوئی ایسی جگہ نہیں جو ہماری پُرانی محبت کی یاد نہ دلائے
میں اُسے شالامار لے کر جاؤں گا تو وہاں شیریں پہلے ہی سے انار کے
درخت کے پاس کھڑی ہو گی۔ لارنس کے کیبن میں لے کر بیٹھوں گا، تو
شیریں کو وہاں موجود پاؤں گا۔ جس بس سٹاپ پر بھی اُس کا انتظار کروں گا
وہاں شیریں بھی کھڑی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اب میں نیا نیا شالامار کہاں
سے لاؤں ؟ ایک نیا لارنس باغ کہاں سے پیدا کروں ؟ شہر کے سارے
بس سٹاپ، اپنے پُرانے ٹھکانوں سے کیسے بدل دوں ؟ یہاں کی سڑکوں کو
کیونکر تبدیل کروں۔ اس شہر کی تو ہر سڑک تمہارے گھر کو جاتی ہے۔ ہماری
محبت کے کسی نہ کسی اُجڑے ہوئے تاج محل کو جاتی ہے۔ ایسا گجرے بیچنے
والا میں کہاں سے پیدا کروں جو میرے ہاتھ میں سفید گجرے کی جوڑی دے کر
یہ نہ پوچھے کہ بابو جی! آپ پریشان کیوں ہیں ؟ آپ کی شیریں کہاں چلی گئی ؟
. . . . شیریں! میں اپنے سکوٹر کو ساتھ لے کر دریائے راوی میں کود سکتا ہوں

لیکن تمھارے بعد اُس پر کسی دوسری لڑکی کو نہیں بٹھلا سکتا۔ شیریں مرگئی ہے مگر میری محبت زندہ ہے۔ تلوار ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن اس کا لگایا ہُوا زخم باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ شیریں مرگئی۔ عروسی کا جوڑا پہن کر، دُلہن بن کر مر گئی۔ نئے نئے کپڑے اور اُونچی ایڑی والے سینڈل پہن کر مرگئی۔ لیکن نہیں۔ شیریں زندہ ہے۔ وہ شیریں زندہ ہے جو دُھوپ میں گھنٹوں کھڑی رہ کر میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ جس کی انگلیوں پر نیلی سیاہی کے دھبّے ہوتے تھے اور سیاہ سینڈل پر سڑکوں کی خاک ہوتی تھی اور جو معمولی سا کالا برقعہ اوڑھ کر مجھ سے ملنے گھر سے چوری چوری نکلا کرتی تھی یہ شیریں کبھی نہیں مر سکتی۔ یہ شیریں امر ہے۔ زندہ وجاوید ہے اور اس کی محبّت بھی امر رہے گی، زندہ وجاوید رہے گی۔ اسے دُنیا کا کوئی ٹھیکیدار، دُنیا کی کوئی موٹر کار، کوئی چیک بُک مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ وہ شیریں جو سفید ساڑھی پہن کر کسی بھاری ٹھیکیدار کے پہلو میں پُرانی موٹر کار میں بیٹھ کر کرکٹ میچ دیکھنے جاتی ہے جو کھڑی درجن بھر کیلے کھا جاتی ہے جو مجھے سڑک پر سے گزرتا دیکھ کر ٹھیکیدار سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتی ہے کوئی دوسری شیریں ہے۔ میں اُسے بالکل نہیں جانتا۔ یہ میرے لیے اجنبی ہے۔ جیسے میں اُس کے لیے اجنبی ہوں۔ میں صرف نیلی سیاہی لگے ہاتھوں والی شرمیلی اور وفا شعار شیریں سے مخاطب ہوں۔

تمھیں یاد ہے شیریں! جب کبھی میں تمھیں کہتا۔ شیریں میری طرف دیکھو تو تم نظریں اوپر نہیں اٹھاتی تھیں۔ میرا خیال تھا تمھیں شرم آتی ہے جو عورت کا زیور ہے۔ لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ شرم کے علاوہ کبھی کبھی ضمیر کا کانٹا بھی عورت کو نظریں جھکائے رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعد میں بھی جب کبھی تم مجھے ملیں تو تم نے آنکھیں چار کرنے سے ہمیشہ گریز کیا اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ جیسے مجھے پہچانتی تک نہیں۔ مگر یہ بات نہیں ہے۔ تم مجھے اپنی زندگی کے ہر چہرے سے زیادہ بڑھ کر پہچانتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھیں میری آنکھوں میں اور میرے چہرے پر اپنے جرم کی عیاں تصویر نظر آجاتی ہے۔ تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتی ہو مگر اپنے جرم سے کبھی آنکھیں چار نہیں کر سکتیں۔

جب اس روز سڑک پر میں نے تمھیں بھدّے اور بد وضع ٹھیکیدار کے ساتھ دیکھا تو تم نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ تم اس کی چھکڑا نما کار میں جا رہی تھیں اور میں سکوٹر پر اپنے دفتر سے واپس آ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر تم ٹھیکیدار سے باتیں کرنے لگیں۔ میں دل کو تھام کر رہ گیا۔ جس سڑک نے کبھی تمھیں راج ہنس کے ساتھ گذرتے دیکھا تھا وہ تمھیں ایک ریچھ کے ساتھ گذرتا دیکھ کر یقیناً جل کر خاک ہو گئی ہو گی۔

یاد ہے شیریں! تم نے اس ٹھیکیدار کے بارے میں ایک بار

کہا تھا کہ آجاتا ہے چھکڑا اسی کار لے کر۔ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور گھر میں پہلی بیوی نے بچوں کی ایک فوج جمع کر رکھی ہے۔ ایک روز کار میں بیٹھے بیٹھے جناب نے میرے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ میں نے فوراً نفرت سے جھٹک دیا۔ لیکن شیریں اب تم ایسا نہیں کر سکو گی۔ کیونکہ اب اُس نے تمہارے پاؤں پر پاؤں رکھنے سے پہلے تمہارے ہاتھ میں چیک بُک رکھ دی ہے۔ اُس نے ترازو کے ایک پلڑے میں تمہیں اور دوسرے میں اپنی چھکڑا سی گاڑی رکھ کر تمہیں خرید لیا ہے۔

شیریں تم اتنے سستے داموں بک جاؤ گی۔ اس کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ کالے سینڈل، سیاہ برقعے اور سیاہی لگی انگلیوں والی شیریں کبھی نہیں بک سکتی۔ اگر کوئی ایک ہاتھ میں بمبے کلاتھ ہاؤس اور دوسرے ہاتھ میں نیشنل بنک لے کر بھی اس کے سامنے آجائے تو اُسے نہیں خرید سکتا۔ شیریں! کیا تم اس بھدے، بدوضع، بے حس اور معمّر ٹھیکیدار کی آغوش میں راحت محسوس کرتی ہو؟ وہ جب تم سے اپنی ٹھیکیداری کی باتیں کرتا ہو گا۔ اور لسّی پی کر ڈکار تا ہُوا پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہو گا تو کیا تمہیں اپنا سانس گھٹتا محسوس نہیں ہوتا ہو گا؟ شیریں! یہ شخص سوائے تمہاری ہڈیوں کو جھنجھوڑنے اور روتے بسورتے کمزور ٹانگوں والے بچوں کے اور تمہیں کیا دے سکے گا؟ وہ

تمھارے اور اپنے معدے کو دنیا جہان کی الا بلا سے منہ در منہ پُر کر کے تمھارے منہ پر منہ رکھ کر سوائے خراٹے لینے کے اور کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ اور تم بھی شیریں اُسے کیا دے سکو گی؟ اپنے دل کی گرمی، اپنے جسم کی رعنائیاں، اپنے جذبات کی آگ، اپنے پیار کا خلوص اور اپنی محبت کی ساری گرمجوشی تم مجھے دے چکی ہو۔ پیار، ایثار، خلوص، محبت، وفا، حیا اور جوہرِ عصمت تک مجھے سونپ دینے کے بعد صرف ایک دھوکا ہی تمھارے پاس رہ جاتا ہے جو تم اُسے دے سکتی تھیں لیکن تم تو یہ دھوکا بھی مجھے ہی دے گئیں۔ اب تمھارے پاس سوائے شرمندگی اور ندامت کے اور رکھا ہی کیا ہے جسے لے کر تم کسی دوسرے کے پاس جا رہی ہو؟ کم از کم یہ دو زیور ایسے نہیں ہیں جنھیں پہن کر ایک عورت کسی مرد کا جی لبھا سکے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اس ذہنی زبوں حالی اور دل کی مفلسی کے باوجود اس آدمی سے ہنس ہنس کر بات کرتی ہو۔ شاید تمھارا احساس کُند اور ضمیر مُردہ ہو چکا ہے۔ شیریں! کبھی تم اتنی حسّاس اور بیدار ضمیر ہُوا کرتی تھیں کہ ذرا سی بات تمھیں رات رات بھر جگائے رکھتی تھی۔

اب تم نے یہ کیا زہر پی لیا کہ جس کے اثر نے تمھارے جسم کے ساتھ ساتھ تمھارے احساس کو بھی پتھر کی بے جان سِل بنا کر رکھ دیا؟ کبھی تم اپنی پسندیدہ کتاب "شبستان" میں سے چیدہ چیدہ اشعار پر نشان لگا کر مجھے بھیجا کرتی تھیں اور اب کیا تم اُس ٹھیکیدار کے ساتھ بیٹھ کر گارے چونے کا حساب کتاب کیا

کرو گی ؟

شیریں! اگر اتنی کھولتی ہوئی، پُر گرم، متحرک اور طوفانی محبت اپنے عروج پر پہنچ کر پتھر بن سکتی ہے تو پھر یہ پتھر بھی ایک روز پگھل کر موم بن کر بہہ سکتا ہے۔

یاد ہے شیریں! میں نے جُدائی کے بعد ایک روز تمھیں سفید ساڑھی میں ملبوس خراماں خراماں اپنی سہیلی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا اور تمھیں بُلا لیا تھا۔ تم اپنی سہیلی کے ساتھ بڑی خوش خوش جا رہی تھیں لیکن میرے اچانک بُلا لینے پر تم ایک دم سنجیدہ ہوگئیں اور میری طرف یوُں دیکھا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور یُونہی تمھارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں وہی شاہد تھا جس کے ساتھ تم شہر کے ہر راستے پہ گھومتی پھرتی رہی تھیں۔ اس وقت مجھے افسوس ہُوا کہ میں نے خواہ مخواہ تمھاری مسکراہٹوں کو سنجیدگی میں کیوں بدل دیا۔ مگر تمھارا اجنبیوں کی طرح مجھے دیکھنا میرے لیے موت کے برابر تھا۔ کاش تمھیں سڑک پر آتا دیکھنے سے پہلے قدرت مجھ سے میری سماعت چھین لے تاکہ میں تمھارے قہقہوں کی آواز نہ سُن سکوں۔ میری بینائی واپس لے لے تاکہ میں تمھیں کسی دوسرے کے ساتھ جاتا نہ دیکھ سکوں۔ میری گویائی سلب کرے تاکہ میں تمھاری باتوں میں مخل ہو کر تمھارے لیے پریشانی کا باعث نہ بن سکوں۔

تم مجھ سے سرسری بات کرنے کے بعد دامن جھٹک کر چلی گئیں اور
میں تمھیں سڑک پر جاتے دیکھتا رہا۔ سامنے وہ بوڑھا درخت کھڑا تھا جس کے
تنے پر "بس سٹاپ" کی تختی لگی تھی اور جہاں کھڑے ہو کر کبھی تم میری راہ
دیکھا کرتی تھیں۔ اسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر تم نے مجھ سے زندگی بھر
ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں اور اب یہی درخت تمھیں میری طرف سے
نفرت سے منہ موڑ کر جاتے دیکھ رہا تھا۔ درخت کیا سوچتا ہوگا شیریں؟
میں نے کتنے شوق سے تمھارے لیے انارکلی میں جا کر اپنی پسند کے
کپڑے خریدے تھے۔ گو اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ تم
اُنھیں میری آنکھوں کے سامنے پہن کر آیا کرو۔ مگر مجھے وہ کپڑے تمھیں پہنا کر
دیکھنے نصیب نہ ہوئے۔ اور اب تم وہی کپڑے پہن کر اُس ٹھیکیدار کے
ساتھ عام تفریح گاہوں میں پھرتی ہو اور سُنا ہے کہ اتنے زور سے ہنستی ہو
کہ لوگ پلٹ کر تمھیں دیکھنے لگتے ہیں۔ کیا یہ کپڑے کبھی تمھیں تمھارے ماضی
کی یاد نہیں دلاتے؟ کیا ان باسی پھولوں سے کبھی تمھیں اُس محبّت کی خوشبو
نہیں آتی جو کبھی تمھارا سانس تھا۔ قدِ آدم آئینے کے سامنے جب تم وہی
کپڑے پہن کر جوڑے میں کسی دوسرے شخص کا جی لبھانے کے لیے پھول
لگا رہی ہوتی ہو تو کیا تمھیں اُس شاہد کا خیال نہیں آتا جو کبھی پیچھے سے
آ کر تمھاری آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا کرتا تھا؟ کیا تم کبھی اب اُس شاہد

کے گرم سانسوں کا لمس محسوس نہیں کرتیں ؟ تم تو کہا کرتی تھیں کہ شاہد جب میں گھر میں آئینے کے سامنے اکیلی کھڑی ہوتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم میرے پیچھے کھڑے ہو۔ سچ ! میں تمھارے سانس کی آواز سُنتی ہوں ــــ اور شیریں ! اب تم میرے فلک شگاف نالوں کا شور بھی محسوس نہیں کر رہیں ؟ غالبؔ نے میرے ہی لیے کہا تھا ؎

وہ نالۂ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

شاید تمھیں میرا خیال آتا ہو۔ اور تم سر کو جھٹک کر کچھ اور سوچنے لگتی ہو لیکن نہیں شیریں ! بالکل نہیں۔ محض سر کو جھٹک دینے سے تم میری محبّت، میرے خلوص اور میرے اعتماد کی ہلاکت کے جُرم سے بری الذّمہ نہیں ہو سکتیں۔ اس دنیا میں نہ سہی۔ مگر ایک دوسری دنیا میں ــــ وہ وقت ضرور آئے گا جب تم ایک بہت بڑی عدالت میں، ایک بہت بڑے منصف کے حضور میں کھڑی ہو گی۔ جب سوائے تمھارے اعمال کے کوئی ٹھیکیدار تمھارے ساتھ نہیں ہو گا اور جب میں تمھاری طرف اشارہ کر کے اُس منصفِ اعلیٰ سے عرض کروں گا کہ اسے حاکمِ کون و مکاں ! اگر میرے حصّے کی کچھ نیکیاں ہیں تو اس کے عوض میں مجھے میری شیریں بخش دے۔ یہ بے گناہ ہے اے مالکِ ارض و سما ! میں اسے بالکل نہیں کہوں گا شیریں کہ یہ

وہ عورت ہے جس نے شادی مجھ سے کی اور یا نہیں کسی دوسرے کے گلے میں حمائل کر دیں۔ جے مالا میرے گلے میں ڈالی لیکن نگاہوں سے تسلّیاں کسی دوسرے کو دیں۔ اور جس نے شادی کے بعد کے سات دنوں میں مجھے اتنی شدید ذہنی کوفت اور روحانی اذیّت دی کہ اگر میں ان سات دنوں میں سات خون بھی کر دیتا تو شاید مجھے آسمانوں کی کوئی طاقت ملزم نہ گردانتی۔ اُس عدالت میں تم میرا خیال آجانے پر محض سر جھٹک کر کچھ اور نہ سوچ سکو گی۔ وہاں تمھیں ایک ہی خیال ہوگا۔ ایک ہی ملال ہوگا کہ تم نے شاہد کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اُس کے دودھ میں پانی ملایا تھا اور اُس کے پانی میں زہر گھول دیا تھا۔ لیکن میں وہاں بھی خدا سے تجھ ہی کو مانگوں گا شیریں! میں وہاں بھی تم سے اسی شدّت سے محبّت کروں گا جس شدّت سے میں یہاں تمھیں چاہتا ہوں۔ اس دنیا میں اگر تم مجھے نہ مل سکیں تو اس دنیا میں تمھیں میرے سوا اور کوئی دوسرا حاصل نہ کر سکے گا۔ اگر میں اس دنیا کا بدنصیب ترین شخص ہوں تو اُس دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہوں گا۔

آج وہی ساون ہے۔ وہی گھرے گھرے بادلوں کی بوندا باندی ہے مگر شیریں بارش میں بھیگتی ہوئی بس سٹاپ پر میرا انتظار نہیں کرتی۔ کوئی شیریں مجھے ٹیلی فون کر کے اپنے پاس نہیں بُلاتی۔ کیا میری شیریں اب کسی دوسرے شخص کے ساتھ بارش میں بھیگتی ہوئی پائنچے اٹھائے شالامار کی سیر کر رہی

ہو گی ؟ کیا اب اُس کے قہقہے کسی دوسرے کی باتوں پر بلند ہو رہے ہوں گے ؟
کیا اب وہ میرے دیئے ہوئے نیلے پیڈ اور نیلے لفافوں پر کسی دوسرے
شخص کو پیار بھرے خط لکھ رہی ہو گی ؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کوئی
وفا شعار بیوی اپنے مرے ہوئے خاوند کے کپڑے بیچ کر چینی کے برتن
نہیں خرید سکتی ۔کوئی غیرت مند عورت اپنی مردہ محبّت کی قبر پر جا کر گورکنوں
سے آنکھیں نہیں لڑا سکتی۔ اور میری شیریں یقیناً وفا شعار ہے حسّاس دل
ہے اور غیرت مند ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔
لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ وہ یقیناً سوگوار ہے۔ وہ یقیناً ملول ہے اور نادم ہے
اور غم زدہ ہے ..... لیکن اگر واقعی تم میری محبت کا سودا کر بیٹھی ہو۔
اگر یہ سچ ہے کہ تم نے میری محبّت کو اپنے دل سے نکال کر باہر گلی میں پھینک
دیا ہے اور تم دوسروں کی تواضع میرے دسترخوان کے کھانوں سے کر رہی
ہو تو پھر میں سوائے شدّتِ درد سے آنکھیں بند کر لینے کے اور کیا کر سکتا ہوں
مگر اتنا ضرور کہے دیتا ہوں شیریں! کہ آج جب میں اکیلا سکوٹر پر بیٹھ کر تمھاری
یاد میں سوگوار سڑک پر سے گذرتا ہوں تو میرے سامنے سوائے خالی سڑک
کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اور کچھ نہیں تو کم از کم ویران سڑک ضرور دکھائی
دے جاتی ہے ۔لیکن شیریں ہو سکتا ہے کل ایسا دن بھی آجائے کہ جب تم
پیچھے مڑ کر دیکھو تو تمھیں سڑک بھی دکھائی نہ دے۔ ویران زمین بھی تمھارے

لیے اپنا دامن پھیلانے سے انکار کر دے۔ مگر ع

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ سوگوار ہو تو

میں تمھیں دوسروں کے ساتھ خوش دیکھ کر اپنے دل پر پتھر رکھ سکتا ہوں لیکن اپنے ساتھ پریشان حال دیکھ کر آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو نہیں روک سکتا۔

تم نے کتنی محبّت سے مجھے تکیے کے غلاف کاڑھ کر دیئے تھے اور کبھی کتنی عقیدت اور فخر سے میں ان تکیوں پر سر رکھ کر تمھارے پیار کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کرتا تھا جیسے میں تمھارے زانو پر سر رکھ کر سو رہا ہوں۔ آج ان تکیوں سے مجھے خوف آتا ہے۔ میں انھیں اپنے ساتھ پہاڑ والے کاٹج میں نہیں لایا۔ لوگ تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتے ہیں اور میں ان پر سر رکھتا ہوں تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ شیریں! میں پتّھر پر سر رکھ کر سو سکتا ہوں مگر تمھارے تکیوں پر سر رکھ کر آنکھ بھی نہیں جھپک سکتا۔

شاید تمھیں اپنا وہ محبّت کے جذبات سے بھرا ہوا خط یاد ہو گا جس میں تم نے مجھے لکھا تھا کہ شاید اگر میں تمھارے پاس نہ آسکی۔ اگر تم مجھے بیاہ کر اپنی دلہن بنا کر اپنے گھر نہ لا سکے تو دنیا کا کوئی شخص میرا دلہا نہ بن سکے گا میں کسی دوسرے کے پاس نہ جا سکوں گی۔ اور چند ہی دنوں میں سینی ٹوریم پہنچ جاؤں گی۔ اور اسی سینی ٹوریم میں تمھارے غم کی اندر ہی اندر سلگتی آگ میں

جل کر بھسم ہو جاؤں گی۔ لیکن تمہاری دوسری باتوں اور دوسرے دعووں کی طرح یہ بات بھی جھوٹی نکلی۔ اور آج میں دیکھتا ہوں اور لوگ بھی مجھے کہتے ہیں کہ تم میرے غموں میں پہلے سے بھی زیادہ صحت مند ہو گئی ہو۔ پہلے سے بھی زیادہ خوش ہو کر کھانے کھاتی ہو۔ اور میں جو پہلے سے زیادہ صحت مند اور زیادہ مسرور انسان تھا اور جس نے سینی ٹوریم کا خواب میں بھی تصوّر نہیں کیا تھا آج سینی ٹوریم کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ میرے کاٹج سے سینی ٹوریم صرف سات میل کے فاصلے پر ہے۔ میں یہ فاصلہ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے سات ہزار سالوں میں بھی طے نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن تم سے جُدا ہو کر شاید یہی فاصلہ سات منٹوں میں طے کر جاؤں۔ دعوے تم نے کیسے تھے شیریں اور انھیں نبھا میں رہا ہوں۔ کتبے تم نے لکھے تھے اور انھیں اپنی حسرتوں کی قبروں پر نصب میں کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارے غم کی لاج ہے اور تمہارے دعووں کے ناموس کا احترام ہے۔

سوچا تھا پہاڑ پر آ کر یہاں کی پُر سکون تنہائی اور جنگلوں کے خوشگوار ماحول میں تمہارا غم بہل جائے گا۔ لیکن یہاں آ کر زیادہ اُداس ہو رہا ہوں۔ شہر کے شور و غل میں تمہارے قہقہوں کی آوازیں دب جاتی تھیں۔ مگر یہاں یہ دل شکن صدائیں زیادہ صاف سنائی دینے لگی ہیں۔ یہاں تو اس قدر خاموشی ہوتی ہے کہ درخت سے کوئی پتّا بھی گرتا ہے تو مجھے

یوں لگتا ہے جیسے تم نے سانس لیا ہو۔ جیسے میرے قریب ہی تمہاری چوڑیاں کھنک گئی ہوں۔ میرا کاٹیج پہاڑ کے پہلو میں چیڑھ اور کرسمس کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان واقع ہے۔ دو چھوٹے سے پُرسکون کمرے ہیں۔ باہر ایک برآمدہ ہے جس کی ڈھلانی چھت لکڑی کے ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ آگے پتھروں کی باڑ میں گھرا ہوا صحن ہے جس میں گلاب اور گیندے کے پھول کھل رہے ہیں۔ میرے کمرے کی کھڑکی پچھلی جانب جنگل کی طرف کھلتی ہے۔ یہاں یہ جنگل ڈھلان کی صورت میں نیچے وادی تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ وادی کی دوسری جانب پھر یہ جنگل پہاڑ کی بلندی کے ساتھ ساتھ اوپر چوٹی تک چلا گیا ہے۔ میری کھڑکی کے اوپر انگور کی بے ترتیب بیل جھکی ہوئی ہے۔ خزاں کا موسم شروع ہو چکا ہے اور اس بیل کے چوڑے چوڑے پتے زرد ہو کر ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی گرنے لگتے ہیں۔ رات کو بڑی تیز سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ صبح اٹھ کر جب صحن میں آتا ہوں تو کھڑکی کے نیچے بیل کے زرد پتے جھڑ جھڑ کر گرے ہوتے ہیں۔ اس بیل کو دیکھ کر مجھے اس عورت کا خیال آتا ہے جو رات بھر کھڑکی کے ساتھ لگی اپنے پردیس گئے ہوئے محبوب کی یاد میں روتی رہی ہو۔ پتے بھی تو درخت کے آنسو ہی ہوتے ہیں۔ جانے یہ غمگین درخت کس کی یاد میں آنسو بہاتے رہتے ہیں؟

رات کو جب سردی زیادہ ہو جاتی ہے اور باہر چیڑھ کے جنگلوں میں تیز ہوائیں شور مچانا شروع کر دیتی ہیں تو میں آتشدان میں آگ جلا کر اس کے قریب بیٹھ جاتا ہوں اور خیال ہی خیال میں تمھیں اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر تم سے ہولے ہولے پیار کی میٹھی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ میں باتیں کیے جاتا ہوں اور جب میری کسی بات کا تم کوئی جواب نہیں دیتیں تو میں پلٹ کر تمھاری طرف دیکھتا ہوں اور تمھاری کرسی خالی ہوتی ہے۔ میں آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور پائپ پینے لگتا ہوں۔

اگرچہ مری کا سیزن ختم ہو چکا ہے اور موسمِ سرما کی آمد آمد ہے پھر بھی یہاں چند ایک دُکانیں کھلی ہیں۔ کچھ نو بیاہتا جوڑے شام کے ٹھنڈے اندھیرے میں بانہوں میں بانہیں ڈالے چہل قدمی کرتے دکھائی دے جاتے ہیں، شیریں! اگر میں شادی کے بعد تمھیں بھی یہاں لے آتا تو اسی طرح تمھارے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چیڑھ کے درختوں اور مال روڈ کی سیر کیا کرتا۔ ہم دونوں سمیز میں بیٹھ کر خوشگوار کافی پیا کرتے۔ جنگل میں لمبی لمبی سیریں کرتے۔ رات کو ہم تحفوں اور پھلوں اور پھولوں سے لدے پھندے کاٹج میں داخل ہوتے۔ ہمارے چہرے مسرّت سے سرخ ہو کر مسکرا رہے ہوتے۔ میں آتشدان میں آگ جلاتا اور تمھارے لیے کافی بناتا۔ تم گلدانوں میں پھولوں کو سجاتیں اور سرخ سیب کاٹ کر پلیٹ میں

لگاتیں۔ اور جب ہمارے کالج کا کمرہ گرم ہو جاتا اور کھڑکی سے باہر
سرد زمستانی ہواؤں کا شور تیز ہو جاتا تو ہم کافی پیتے ہوئے چمکتی گرم
آنکھوں سے محبّت کی پُر اسرار باتیں شروع کر دیتے اور ہماری باتیں کبھی
ختم نہ ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میں اس ویران اور سرد کالج میں
اکیلا بیٹھا اس کتاب کو قلمبند کر رہا ہوں۔ دل کے زخم پھر سے کُرید رہا
ہوں۔ بہے ہوئے آنسو پھر سے بہا رہا ہوں۔ یہ کتاب بھی ایک یادگار
رہے گی شیریں ـــــ میری محبت کی اور تمھاری بے وفائیوں کی۔ یہ تمھیں یاد
دلائے گی کہ تم نے شاہد سے کتنی شدید محبت کی اور پھر کتنی شدّت سے
اُس کی محبّت کو پامال کر دیا۔ شاہد نے دل و جان سے بڑھ کر تمھیں چاہا
اور اس چاہت میں دل و جان دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا یہ تو ایک
یادداشت ہے۔ نوحہ ہے۔ ہماری محبت کا۔ ہماری جدائی کا اور پھر
سے مل بیٹھنے کی ایک موہوم سی امید کا۔ جب تم اسے پڑھو گی تو تمھارے
ذہن میں پرانی یادوں کے زرد پتّے گرنا شروع ہو جائیں گے۔ کیونکہ
یہ پت جھڑ کا گیت ہے اور میں اسے دل کے بھرپور درد کے ساتھ
لکھ رہا ہوں۔ اگر تم اسے الماری میں بند کر دو گی تو یہ کتاب باسی گلاب
کے پھولوں کی خوشبو دے گی اور اگر اسے زمین میں دفن کر دو گی تو
وہاں نرگس کے شگوفے پھوٹ پڑیں گے۔ نرگس کے شگوفے ـــــ جن کا رنگ

مری محبّت کی طرح زرد ہو گا اور جن کی آنکھیں میری آنکھوں کی مانند کھُلی ہوں گی اور ستم کشِ انتظار ہوں گی۔ یہ کتاب نہیں شیریں بلکہ ایک ننھا سا مٹی کا دیا ہے جسے اندھیری اور طوفانی رات میں جلا کر میں اپنے کاٹج کی دہلیز پر رکھ رہا ہوں۔ دل میں یہ اُمید لیے کہ شاید تم راستہ بھول لینے کے بعد، راہ بھٹکنے کے بعد میری تلاش میں ادھر آنکلو اور اس دیئے کی روشنی اپنی کرنوں کی پلکیں بچھا کر تمھارا استقبال کریں۔

جو راستہ میرے کاٹج کو اُوپر جاتا ہے اُس کی دونوں جانب دیودار کے درخت کھڑے ہیں۔ یہ راستہ چھوٹے پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے اور بڑا بے ترتیب، ویران اور اداس ہے۔ درختوں کے ساتھ ساتھ ہلکا سا چکر کاٹ کر یہ اوپر کاٹج کو چلا گیا ہے۔ اس راستے پر درختوں کے زرد سرخ اور گہرے براؤن رنگ کے خزاں نصیب پتوں نے فرش سا بچھا رکھا ہے دیودار کے درختوں کی لمبی ٹہنیاں نیچے جھک کر لٹک رہی ہیں۔ جیسے اپنی آغوش سے بچھڑے ہوئے پتّوں کو آخری بار چوم لینا چاہتی ہوں جب سورج مغرب میں ڈوب کر لاجوردی ہو جاتا ہے تو سُرخ دھوپ ان پتّوں میں آگ سی لگا دیتی ہے۔ میں نے زندگی میں اس سے بڑھ کر اُداس، رومانٹک اور ویران راستہ نہیں دیکھا۔ یہاں پر سے گذرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے گویا انسان اپنے غمگین ماضی کی طرف لوٹ رہا ہو اور اپنی

پرانی محبّت کی سوگوار یادوں کے کھنڈرات کے درشن کر رہا ہو۔ اس راستے پر درختوں پر سے پتے گرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی خشک پتّا ڈالی سے ٹوٹ کر کندھے پر آ کر رُک جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے بیتے دنوں کی کوئی درد بھری یاد کندھے سے آن لگی ہو۔ یہ پتھریلی سی ناہموار پگ ڈنڈی چکر کاٹ کر درختوں میں سے ہوتی اُوپر چلی گئی ہے۔ یہاں سے میرا کالج دکھائی نہیں دیتا۔ گرتے پتّوں نے زنگ آلود پتھروں کو ڈھانپ رکھا ہے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے سے یوں لگتا ہے گویا یہ راستہ اُوپر کسی کشتۂ محبّت کی خانقاہ کو جاتا ہے۔ وادیوں، چراگاہوں اور گہری گھاٹیوں میں دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد جب میں بوجھل قدم لیے واپس آتا ہوں تو کالج کو اس دکھ بھرے راستے سے نہیں جاتا۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ درد بھرے اداس پتوں سے بھری ہوئی پگ ڈنڈی پر اپنے پاؤں لے کر چلوں۔ یہ جھڑے ہوئے زرد، سرخ اور براؤن پتّوں کا فرش نہیں بلکہ قدرت کی جانماز ہے جہاں رات کو جنگل کی پریاں اُتر کر خدا کی عبادت کرتی ہیں۔ یہ سوکھے پتّے گویا درختوں کے محبّت بھرے پرانے خطوط ہیں جو انھوں نے آنے والی بہار کے نام لکھ لکھ کر پگ ڈنڈی پر بچھا دیئے ہیں۔ میں اتنا بے ادب نہیں ہوں کہ ان پر اپنے پاؤں رکھوں۔ یہ جگہ تو آنکھیں بچھانے کی ہے۔ پھر بھی جب کوئی بھولا بھٹکا خشک پتّا میرے قدموں تلے آ کر ٹوٹ جاتا ہے تو

اس کی آواز پر کسی بدنصیب چرواہن کی سسکی کا گمان ہوتا ہے۔

رات کو جب کوئی پتا ٹوٹ کر گرتا ہے تو کھڑکی کھول کر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔ اس خیال سے شیریں کہ شاید تم آ رہی ہو۔ مگر وہاں سوائے ویران ہواؤں کی آہ و زاری اور جھڑتے پتّوں کی ہچکیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پھر جب رات گہری ہو جاتی ہے۔ ہوا بند ہو جاتی ہے۔ چیڑھ اور دیودار کے درخت سر جھکا کر گہری نیند میں کھو جاتے ہیں تو میں بستر پہ چپ چاپ لیٹا پرانی یادوں کی کڑیاں جوڑتا رہتا ہوں۔ کسی وقت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ شیریں تم مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ مجھ سے بے وفائی کر گئی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہو۔ میں جلدی سے باہر آکر دروازہ کھول دیتا ہوں۔ ہوا کا ہلکا سا سرد جھونکا پتھروں پر سے خشک پتّوں کو اُڑا کر میرے قدموں میں لا ڈالتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیتا ہوں۔ دل کہتا ہے۔ شاہد! چلو شیریں کے پاس چلو۔ اُسے آہستہ سے جگاؤ اور پھر اُس کی ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر پوچھو "شیریں! تم نے تو زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔ پھر یہ کیا ہوا کہ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے روٹھ کر چلی گئیں؟ کیا سچ مچ تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے شیریں؟ نہیں نہیں شیریں لوگ کہتے ہیں۔ تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے شیریں کہ تم مجھے بھول جاؤ۔ بھلا تم ایسی حسّاس دل لڑکی بھی کبھی بھول سکتی ہے۔ کبھی

بھلائی جا سکتی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ کیوں ہو گیا؟ .... لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ تم ایسی نہیں ہو۔ تم ایسی کبھی نہیں ہو سکتیں۔ کبھی نہیں ہو سکتیں ......

میں تمھارے شہر میں جو کبھی میرا بھی تھا اپنی محبت کی برسی منانے آرہا ہوں۔ اپنے زخموں کو ایک بار پھر تازہ کرنے آرہا ہوں۔ ان تیروں کو سڑکوں پر سے اٹھا کر اپنے سینے میں پیوست کرنے آرہا ہوں جو تم نے میری عدم موجودگی میں مجھ پر چلائے اور جو مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ یہ بھی تو تمھاری محبّت کی نشانیاں ہی ہیں شیریں! — میں ایک بار پھر سکوٹر پر اُن سڑکوں پر سے اکیلا گذروں گا جہاں سے کبھی ہم دونوں مل کر گذرا کرتے تھے۔ شالامار کا انار کا درخت پوچھے گا شیریں کہاں چلی گئی شاہد؟ تو میں کہوں گا۔ پیارے انار کے درخت! شیریں مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔ وہ مجھ سے اب کبھی بات نہیں کرتی۔ دیکھو کل، وہ تمھارے سامنے کھڑی مجھ سے پیاری پیاری باتیں کر رہی تھی اور آج وہ مجھے دیکھ کر منہ موڑ لیتی ہے۔ وہ مجھے بھول گئی ہے۔ تمھیں بھی بھول گئی ہے پیارے انار کے درخت! اور انار کا درخت سر جھکا کر آہ بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔

شیخو پورے والی سڑک پر اگر کسی دہقان زادی نے میرا راستہ روک کر پوچھا کہ سوگوار اجنبی! تمھارے ساتھ ایک بھولی بھالی لڑکی ہوا کرتی تھی جس

نے اپنا نازک سر تمہارے کندھے سے لگا رکھا ہوتا تھا۔ وہ کہاں چلی گئی؟ تو میں اُس دہقان زادی کے پاؤں کی خاک چھوڑ کر کہوں گا۔ پیاری بہن! وہ بھولی بھالی لڑکی شہر کی سڑکوں پر کہیں کھو گئی۔ اس نے میرے سکوٹر پر سے موٹر کارمیں چھلانگ لگا دی ہے اچھی بہن! میں اُس کی تلاش میں شہروں، جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں اور وہ مجھے کہیں نہیں مل رہی۔ پیاری بہن! اگر کبھی وہ کسی کے ساتھ کار میں بیٹھی ادھر سے گذرے تو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنا۔ بے وفا لڑکی! تیری تلاش میں شاہد کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور چہرے پر خاک اٹ گئی ہے اور رنگ زرد ہو گیا ہے۔

لارنس باغ والا کیبن مجھے اکیلا دیکھ کر ضرور تمہارے بارے میں سوال کرے گا شیریں! وہ مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ میں تمہیں کہاں چھوڑ آیا ہوں؟ اور میں اُسے کہوں گا میرے بھائی! میں نے اُسے نہیں بلکہ اُس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اگر شیریں کسی کے ساتھ تمہارے پاس چائے پینے اور اپنے ساتھی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے آئے تو اُسے کہنا کہ اس سے پہلے شاہد بھی یہاں آیا تھا اور آنسو بہا کر چلا گیا۔

صبح سے شام تک ایک ہی جگہ کھڑے دیکھ کر مجھے بس سٹاپ ضرور پوچھے گا کہ میں کس کا انتظار کر رہا ہوں؟ میں اُسے کہوں گا شیریں کا! جس کے

پاؤں میں سیاہ سینڈل ہے اور انگلیوں پر نیلی سیاہی کے دھبے ہیں۔ کیا جانے وہ مجھے تلاش کرتی کس بس میں کب آجائے اور مجھے نہ دیکھ کر اُسے مایوسی ہو۔ میں قیامت تک یہاں کھڑا رہوں گا میرے بھائی لیکن اپنی شیریں کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔

میں اُس ہوٹل کے کیبن میں جاؤں گا جہاں تم نے پہلی بار مجھ سے اقرارِ محبت کیا تھا شیریں ـــ میں انارکلی میں اُس دکان کے سامنے سے گذروں گا جہاں سے میں نے تمھاری شادی کے جوڑے بڑے چاؤ سے، بڑے ارمانوں سے خریدے تھے۔ میں اُس بس سٹاپ پر جاؤں گا۔ جہاں تم سردیوں کی ٹھٹھرتی صبحوں کو میرے ساتھ شیخوپورے جانے کے لیے آیا کرتی تھیں اور اُس بس سٹاپ پر بھی جاؤں گا جہاں تم پسینے میں نہائی ہوئی مجھ سے نکاح پڑھوانے کے لیے اتری تھیں اور اُس ویران مسجد کی زیارت بھی کروں گا جہاں تم نے دودھ کے ایک گلاس پر مجھ سے وابستہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ میں ایک ایک یادگار کا درشن کروں گا۔ میں ایک ایک مزار پر جاؤں گا۔ میں ایک ایک پتھر سے سر پٹخوں گا۔ میں ایک ایک سڑک پر تمھیں یاد کروں گا۔ تمھارا نام لے لے کر تمھیں پکاروں گا۔ کیونکہ میرے دروازے پر اُمید کا چراغ ابھی تک جل رہا ہے۔ میرے کان ابھی تک تمھارے قدموں کی آہٹ پر لگے ہیں، میری آنکھیں ابھی تک تمھاری مسکراتی صورت کو ترس رہی ہیں۔ تم مجھ سے جوانی کے

عروج میں بچھڑ کر گئی تھیں۔ اگر دنیا والوں نے تمہیں بوڑھا کر کے چہرے پر جھریوں کا جال پھیلا کر تمہارے بالوں کو سفید کر کے بھی مجھے واپس کیا تو میں اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت اور انمول ترین شئے سمجھ کر اپنے سینے سے لگا لوں گا شیریں! ـــ لیکن ایک بات مجھ سے نہیں ہو سکے گی شیریں! جب شیراز ان کے باہر گجرے بیچنے والا مجھے پہچان کر بھاگ کر میرے پاس آئے گا اور حیرانی سے پوچھے گا۔

"اب آپ گجرے نہیں لے جاتے بابوجی؟"

تو میں اُسے کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔

ذخیرہ کتب
انیس نقوی
03142893816

محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور